شمیم حنفی

یہ کس کا خواب تماشا ہے

(کالمز)

مرتب: خالد جاوید

یہ کس کا خواب تماشا ہے

(شمیم حنفی کے کالمز)

شمیم حنفی

یہ کس کا خواب تماشا ہے

(شمیم حنفی کے کالمز)

شمیم حنفی

مرتب

خالد جاوید

عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ۹۵

YE KISKA KHAWAB TAMASHA HAI
(Columns of Shamim Hanfi)
Edited by Khalid Jawed
Edition : 2014
Rs.: 400/-

نام کتاب : یہ کس کا خواب تماشا ہے
(شمیم حنفی کے کالمز)

کالم نگار : شمیم حنفی

مرتب : خالد جاوید

مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی

سرورق تزئین : اظہار احمد ندیم

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ملنے کے پتے

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ٦
- رائی بک ڈپو، الہ آباد۔ 09889742811
- کتب خانہ انجمن ترقی، جامع مسجد، دہلی 011-23276526
- کتاب دار، ممبئی۔ 022-23411854
- مرزا ورلڈ بک، اورنگ آباد۔
- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ ۴
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
- عثمانیہ بک ڈپو، کولکاتہ
- ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد

arshia publications
A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment, Dilshad Colony, Delhi -110095 (INDIA)
Mob: 09971775969, 09899706640 Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Composed at: Frontech Graphics, Abdul Tawwab 9818303136

صبا بھابی

(بیگم شمیم حنفی)

کے نام۔۔۔

جن کی بے پایاں محبتوں

اور

شفقتوں کا میں ہمیشہ مقروض رہوں گا

یہ تانبے کا آکاش اجالے سے خالی
اور یہ لوہے کے شہر —— دھوئیں میں ڈوبے ہوئے
یہ نیون سائن کی روشنیوں میں گھری ہوئی تاریک صفیں
یہ شور شرابہ آنے والی لمبی رات کی ہیبت کا

سچ پوچھو تو اب میرا دکھ تنہائی نہیں
کچھ اور ہی بات ہے جس سے دل گھبرایا ہے!
—— خواب تماشا۔ کمار پاشی

فہرست

عرضِ مرتب

شمیم حنفی اُردو کے بلند پایہ ناقد، دانشور اور ادیب ہیں، بطور ایک ڈرامہ نگار بھی، ان کی شہرت کسی تعارف کی محتاج نہیں، یوں تو انہوں نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے جو برصغیر کے مقتدر ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔

مگر یہ کتاب شمیم صاحب کے کالموں کا ایک انتخاب ہے۔ شمیم حنفی کے کالموں کی مقبولیت اپنے آپ میں ایک الگ داستان ہے۔ یہ کالم ملک کے مختلف النوع اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ان کالموں کی پسندیدگی اور مقبولیت کا یہ عالم رہا ہے کہ جس اخبار میں اُن کا کالم جس دن شائع ہوتا تھا، شام ہونے سے پہلے تک اُس اخبار کی ایک بھی کاپی اسٹاک میں دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ مگر شمیم صاحب نے اپنی کالم نویسی کو کبھی پیشہ نہیں بنایا۔ انھوں نے جب بھی کوئی کالم لکھا تو اس داخلی جبر کے تحت لکھا جو کسی بھی سچی تخلیق یا فن پارے کا محرک ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو میں کالم نویسی کی روایت سے ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا اور نہ ہی پیشہ ورانہ صحافت سے۔

کالم نویسی کی مکتبی اور تکنیکی تعریف پر بھی اُن کے کالم پورے نہیں اُترتے۔ بقول شمیم حنفی:

> ''یہ کالم، زندگی کے مختلف ادوار کی یادگار ہیں۔ طالب علمی کے دور میں اس سلسلے کی شروعات ہوئی۔ کئی اردو اور ہندی اخبارات سے بالواسطہ تعلق رہا۔ گردوپیش کی دنیا میں جو صورت حال رونما ہوتی رہتی ہے، اس کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ اپنے ردِّعمل کو ظاہر کرنے کی ہوک بھی اُٹھتی رہتی ہے۔ زندگی میرے لیے نہ تو خواب ہے، نہ صرف آرٹ اور ادب کے اسالیب کی گرفت میں آنے والی سچائی۔ ادیب کے لیے صحافت

کا میدان بھی کھلا ہوتا ہے، بہ قول جارج آرویل، ہنگامی حالات میں لکھا جانے والا ادب سو، یہ شغل بھی جاری رہنا چاہیے۔
ان بکھرے ہوئے اوراق کو یکجا کرنے کی تحریک مجھے اپنے دو عزیز شاگردوں سے ملی۔ ایک تو ڈاکٹر یوسف عامر جو جامعہ ازہر (قاہرہ) میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ دوسرے اسی کتاب کے مرتب جو ایک معروف فکشن نگار ہیں۔''

راقم الحروف کے خیال میں شمیم حنفی کے یہ کالم منفرد قسم کے فن پارے ہیں جو اُن کی ادبی تنقید کے بہت قریب اور اُس کے مؤقف کی تائید کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں شمیم حنفی کی تنقید کو ایک آؤٹ سائیڈر کی تنقید کا نام دیا ہے۔ آؤٹ سائیڈر ہمیشہ نابغہ روزگار ہوتا ہے۔ وہ اپنے سے قبل چلی آرہی عمومی صورت حال کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ مگر یہ بھی ہے کہ اس کے بعد، اُس کی تقلید بھی آسانی سے ممکن نہیں ہو پاتی۔ شمیم حنفی دراصل وجودی طرزِ احساس رکھنے والے دانشور ہیں۔ اور اُن کی جملہ نگارشات پر چاہے اُن کا تعلق کسی بھی صنف سے ہو، وجودی احساسات اور کیفیات کی وہ چھوٹ ہمیشہ پڑتی رہتی ہے جو اُس صداقت پر مبنی ہے۔ جس کا خمیر انسانی وجود ہے۔ میرے خیال میں اُن کی کالم نگاری کو اسی حوالے سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعی کرنی چاہیے۔

لکھنا۔۔۔ کچھ بھی لکھنا، چاہے وہ تنقید ہو یا ڈرامہ یا پھر کالم۔ شمیم حنفی کے لیے ایک روحانی واردات کا نام ہے۔ اُن کی زبان وجودی اور گہرے انسانی تجربے سے روشنی اخذ کرتی ہے۔ یہ روشنی بہت تیز نہیں ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں۔ یہ بس ایک چمکیلے غبار یا دھند کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس روشنی میں اشیا اپنی تمام پوشیدہ جہات کو پرچھائیوں کی شکل میں ظاہر کر دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ نیز اشیاء کائنات اور انسانوں کے درمیان کے مختلف النوع رشتے بڑے سہج اور فطری انداز میں روشن ہو اُٹھتے ہیں۔ ان کالموں کا یہی امتیاز ہے اور میں انھیں ایک معجزے کی شکل میں دیکھتا ہوں۔ میں یہاں کالم نویسی کی تعریف، تاریخ یا ارتقا کا بیان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ اس صنف پر کوئی رسمی سا مضمون لکھنا میرا مقصد نہیں ہے، اس لیے میں ان کلیشوں کو نظر انداز کر رہا ہوں مثلاً کالم نویسی کا حق پرست، حق گو اور حق کا متلاشی رہنا ناگزیر ہے۔ یا

کلام میں فکاہیہ انداز کتنا ضروری ہے اور کتنا غیر ضروری۔ کالم کی زبان چٹخارے دار ہو یا نہیں یا پھر زندہ دلی کو سنجیدگی کے ساتھ کالم میں کس طرح سمویا جائے اور اسے ایک لطیفے کی صورت پیش کیا جائے یا بے حد سنجیدگی اور شائستگی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا تعلق پیشہ ورانہ صحافت سے ہے اور شمیم حنفی کو اس سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے۔ اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ شمیم حنفی کی ہر تحریر اُن کے لئے ایک روحانی تجربے کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے یہ کالم بھی اِس عنصر سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

''یہ کس کا خواب تماشا ہے'' کی تمام تحریروں کا تعلق انسان سے ہے اور ان کے بنیادی سروکار صرف انسانی ضمیر سے ہی وابستہ ہیں۔ یہ کالم نہ تو محض سیاسی ہیں اور نہ ہی محض ادبی۔ اگرچہ موضوعات کے اعتبار سے یہ سیاسی اور ادبی دونوں کہے جاسکتے ہیں مگر ہمیں بخوبی یہ علم ہے کہ کالم میں ہمیشہ اپنے ذاتی خیال کا اظہار کیا جاتا ہے اور کوئی بھی خیال اپنے اظہار کے لیے بیان و الفاظ کا محتاج رہتا ہے۔ اگر ان کالموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اسلوب پر بھی بغور توجہ دی جائے تو ایک خصوصیت بہت واضح طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اور وہ ہے بیانیہ میں پوشیدہ افسردگی اور ملال کی ایک کیفیت۔ افسردگی اور ملال بغیر انسان دوستی (Humanism) کے کبھی نہیں پیدا ہوتے، اگر کسی تحریر کے بنیادی سروکار ''انسان'' سے وابستہ نہیں ہیں تو اُس میں شائستگی، شوخی، طنز و مزاح اور معنویت سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر افسردگی یا اُداسی نہیں۔ شمیم حنفی کی زبان ایک زندہ وجودی تجربے کی بامعنی اور معتبر اُداسی ہے جس کے بغیر انسان کا کوئی تعلق نہ تو کسی اخلاقی اقدار سے قائم ہوسکتا ہے اور نہ ہی اُس کائنات سے جہاں دوسرے انسان بھی زندگی گزارتے ہیں اور بے جان اشیا بھی اپنا مقام رکھتی ہیں۔

شمیم حنفی کے یہ کالم بنیادی طور پر موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام کے خلاف احتجاج سے عبارت ہیں یہاں تک کہ بعض شخصی نوعیت کے کالم بھی اس عنصر سے خالی نہیں۔ ''یہ کس کا خواب تماشا ہے'' کی تحریروں کو اسی لیے میں نے ''معجزہ'' کہا ہے کیونکہ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کالموں کا کوئی تعلق اُردو میں کالم نگاری کی روایت سے قائم نہیں ہوتا جبکہ دوسرے تمام صحافیوں اور ادیبوں کے کالم نہ صرف موضوعات کے تعلق سے بلکہ زبان و بیان کے حوالے سے بھی ایک دوسرے کا چربہ نظر آتے ہیں۔ بالکل ایک جیسا ڈکشن، ایک جیسی لفظیات اور ایک جیسے

موضوعات۔ اُردو کے بیشتر کالم نگاروں کی تحریروں میں سے لفظوں کی فرسودگی کی بو آتی محسوس ہوتی ہے۔ (چند ایک کو چھوڑ کر، مثلاً فرحت احساس کے کالم) شمیم حنفی کے یہ کالم اُردو میں کالم نگاری کی روایت سے ماورا ہیں۔ اور اپنی الگ دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔

وٹنگسٹائن نے کہا تھا:

''کسی بھی انسان کی دنیا کی حدود دراصل اُس کی زبان کی حدود ہیں۔''

ان کالموں میں بظاہر ایسا کچھ نہیں ہے، جو ایک باخبر آدمی پہلے سے نہ جانتا ہو۔ ظاہر ہے کہ کالم حالاتِ حاضرہ پر ہی لکھے جاتے ہیں۔ ان کالموں میں بھی وہی انسانی مسائل ہیں جنھیں ہم اخبارات میں خبروں یا اداریوں کی شکلوں میں بھی پڑھتے رہتے ہیں اور جن کا تعلق اقتصادیات، معاشیات یا سیاست اور سماج سے ہوتا ہے۔ شخصی اور تاثراتی قسم کے کالموں میں بھی یہ نکات بہرحال کسی نہ کسی طور آہی جاتے ہیں اور ہم ان سے واقف بھی ہوتے ہیں۔

مگر شمیم حنفی کی یہ تحریریں ہمیں باخبر کرنے کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں، یہ ہمیں عرفان و آگہی کا سبق دینے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ خبر اور عرفان میں جو فرق ہوتا ہے، اس سے کون واقف نہیں، اپنی ذات کا وجودی تجربہ ہی دوسروں کے وجودی تجربے کا وسیلہ بنتا ہے۔ اس لیے راقم الحروف کے خیال میں یہ محض کالم نہیں ہیں۔ انھیں ہم اپنے اجتماعی ضمیر کی آواز پر کیے گئے شک اور اس کی اخلاقی عظمت سے انکار کے لیے ایک اعلان نامے کے بطور بھی پڑھ سکتے ہیں۔

یہ کارنامہ اکثر ایک بڑا فن پارہ ہی انجام دے سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس انتخاب کے ذریعے جب مجموعی طور پر ان کالموں کا مطالعہ کیا جائے گا تو سنجیدہ ادبی حلقوں میں نہ صرف اس کی پذیرائی ہوگی بلکہ یہ اُردو کی دانشورانہ روایت کا اہم حصہ بھی قرار پائیں گے۔

کتاب کی اشاعت کے لیے میں عرشیہ پبلی کیشنز کا شکر گزار ہوں۔

— خالد جاوید

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ،

نئی دہلی

مکالمہ مابین سواری و یکہ بان۔ ایک امکان

یہ ان دنوں کی بات ہے جب چھوٹے شہروں میں رکشائیں نہیں چلی تھیں۔ بستی میں جگہ جگہ یکے والوں کے اڈے ہوتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ جب کبھی کسی یکے پر ایک طرف کوئی موٹی سواری بیٹھ جاتی اور دوسری طرف کوئی ہلکا پھلکا آدمی تو یکہ بان کہتا: ''یکہ الار ہو رہا ہے۔'' الار ہونے سے مراد یکے کا ایک طرف جھکنا ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں اس بات کا ڈر رہتا تھا کہ کہیں یکہ الٹ نہ جائے۔ سو یکے والا کرتا یہ کہ بھاری بھرکم سواری کو اندر کی طرف کھسکنے کا مشورہ دیتا یا پھر ہلکی پھلکی سواری بٹھا کر یکے کا توازن درست کر لیتا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ الار ہو رہا ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی سیاسی واردات کی خبر، اگلی صبح کے اخبار کے ساتھ ملک بھر میں پھیل جاتی ہے۔ مگر تہذیبی زندگی کے بڑے سے بڑے واقعے کی اطلاع کہیں ان لوگوں تک محدود رہتی ہے جو زندگی کو صرف سیاسی شطرنج کی بساط نہیں سمجھتے۔ پچھلے دنوں سارتر کی موت پر اردو کے عام اخبارات میں بیشتر نے اس سانحے کو ایک خبر کی حیثیت بھی نہیں دی۔ دانشوروں میں سے کسی نے سارتر کو اس عہد کا ضمیر کہا، کسی نے اسے بیسویں صدی کی فکر کے سب سے تابناک محور کا نام دیا۔ اردو زبان اور اس کا ادب لاکھ ترقی یافتہ سہی، لیکن ہم اردو والے اپنے عمل سے اسے ایک پسماندہ زبان بنائے رکھنے کے درپے ہیں۔

کوئی فقرے بازی پر اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سارتر فرانس کا باسی تھا۔ سو فرانس اور امریکہ اور روس کے کسی ادیب یا دانشور کا سوگ منانے کا مطلب یہ ہوا کہ گویا گھر پر سب خیریت ہے۔ خیریت تو خیر کہیں بھی نہیں۔ اور اپنا حال تو کچھ زیادہ ہی ابتر ہے۔ خود ہمارے یہاں کسی بڑے سے بڑے ادیب، یا مفکر یا دانشور کی موت ہو جائے، اس کی خبر کتنوں کو ہوتی ہے؟ اکثریت کی

بات تو جانے دیجیے جو اخبار بینی کی عادت بد سے محفوظ یا حرف شناسی کی سعادت سے محروم ہیں مگر وہ لوگ جو روزانہ اخبارات پڑھتے ہیں اور سال چھے مہینے میں دو چار کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی بھی کر لیتے ہیں، انھیں بھی اپنے معاشرے کی تہذیبی زندگی کا شعور کس حد تک ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان کے تہذیبی شعور کی حالت بھی اس یکے جیسی ہے جس پر ایک طرف سیاست ایک بھاری بھرکم سواری کی طرح جمی بیٹھی ہے اور یکے کا توازن بگڑ گیا ہے؟ اندریں حالات معاشرے کی گاڑی کا کسی منزل تک پہنچنا تو دور کی بات ہے وہ لوگ جو اس پر سوار ہیں، ان کے وجود کو بھی ایک مستقل خطرہ لاحق ہے۔

پچھلے دنوں قرۃ العین حیدر کی تین کتابیں یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں۔ ان کے سوانحی ناول کار جہاں دراز ہے کی دو جلدیں اور تیسری کتاب آخر شب کے ہمسفر۔ تہذیبی اعتبار سے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ کسی قوم کے لیے اس پایے کی کسی ادیب کی لگاتار تین کتابوں کا چھپنا ایک بڑے تہذیبی واقعے کی مثال ہوتا۔ مگر ہمارے یہاں اردو اخبارات میں کہیں کہیں بس یہ اطلاع نظر آئی کہ اچھی بری بہت سی کتابوں کے ساتھ اتر پردیش اردو اکیڈمی نے قرۃ العین حیدر کی کتاب ''آخر شب کے ہمسفر'' کو بھی ایک انعام دیا ہے، دو ہزار روپئے کا اور یہ بھی کہ اس مرتبہ کوئی کتاب تین ہزار روپے کی مستحق نہیں سمجھی گئی۔ جس وقت یہ خبر چھپی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فکشن سیمنار میں شرکت کے لیے انتظار حسین یہاں آئے ہوئے تھے اور دلی ہی میں موجود تھے۔ ان کا فوری ردعمل اس خبر پر حیرت سے زیادہ افسوس کا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ قرۃ العین حیدر کی تینوں کتابوں کے اڈیشن پاکستان میں چھپ چکے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہاں ان کتابوں کے ناشرین کو کتنا منافع ہوا، مگر یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ منافع کی رقم دو ہزار روپے سے یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔ اب جہاں تک اکیڈمیوں کے انعامات کے اعلان کا تعلق ہے، اس سلسلے میں فیصلہ کرنے والوں کی نیت اور بصیرت پر تبصرہ تو خیر بے سود ہے کہ وہ کتابیں پڑھ کر دماغ پر بوجھ ڈالنے اور پھر کوئی رائے قایم کرنے کا مرض نہیں پالتے۔ اسی لیے ان کے انعام یافتگان کی فہرست اکثر اس اصطبل کی مثال ہوتی ہے جہاں گھوڑے اور گدھے ساتھ باندھ دیے جائیں۔ مگر غیرت کا مقام یہ ہے کہ فیصلہ کرنے والوں نے اپنی لیاقت کے اظہار کے طور پر یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ دو ہزار سے زیادہ کے

انعام کا حق اس بار کسی اردو کتاب کو پہنچ سکا، جبکہ اس صف میں قرۃالعین حیدر کی کتاب بھی شامل تھی۔ بعد میں کہیں یہ خبر بھی نظر آئی کہ اکیڈمی نے اب کی بار یہ شرط ہٹالی تھی کہ صرف وہی کتابیں انعام کے لیے زیرِ غور آئیں گی جو مصنف کی طرف سے براہ راست موصول ہونگی۔

یہ بات بہرحال خوش آئند ہے کہ اس طرح لکھنے والے کے وقار کا بھرم کچھ تو قائم رہتا ہے۔ مگر اکیڈمی کے اربابِ حل و عقد نے اگر اتنی ذہانت کا ثبوت اور دیا ہوتا کہ انعام یافتگان کی فہرست کے ساتھ ایک غیر ضروری وضاحت نہ کرتے تو خود ان کا بھرم بھی بنا رہتا۔

انتظار حسین کا کہنا تھا کہ قرۃالعین حیدر کا نام بڑے سے بڑے ادبی اعزاز کا مستحق ٹھہرتا ہے سو اردو اکیڈمی نے انعامات کے اعلانات کے ساتھ جس بدمذاقی کا اظہار کیا ہے، اس کے خلاف احتجاج ہونا چاہیے۔ ہم میں سے بہتیرے یہی کچھ محسوس کرتے ہیں مگر ہمارے یہاں اس باب میں خاموشی رہی، شاید اس لیے کہ موسم احتجاج کے لیے سازگار نہیں یا پھر یہاں بھی وہی بات جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔ بے حسی اور مصلحت کے بوجھ نے ہمارے تہذیبی شعور کی گاڑی کا توازن بگاڑ رکھا ہے۔ ایسی صورت میں سب آگے بڑھیں تو کیسے؟

قصور گھوڑے کا ہے یا یکہ بان کا، یا اس پر بیٹھی ہوئی سواریوں کا، یہ فیصلہ آسان نہیں۔ گھوڑا تو خیر بے زبان جانور ہے لیکن یکہ بان اور سواریوں کے مابین اس سوال پر مکالمہ ہو سکتا ہے۔

چودھری محمد نعیم — ایک سفر اپنی تلاش کا

''دل ناصبور کو ابھی کوئی مرکز نہیں ملا ہے اور نہ فی الحال کسی مرکز کی تلاش ہے۔ ابھی تو خود اپنی ذات کے مرکز کی تلاش ہے کہ کوئی شے دائم اور قائم اور مستقل بھی ہے یا محض چلتی پھرتی چھاؤں کا نام زندگی ہے۔'' چودھری محمد نعیم نے یہ جملے چند ماہ پہلے اپنے ایک خط میں لکھے تھے۔ ۳۰ جون کو پتہ چلا کہ یہ تلاش انھیں شہر دہلی تک کھینچ لائی ہے۔ جو لوگ اردو زبان اور ادب کی سمت اور رفتار سے دل چسپی رکھتے ہیں، چودھری محمد نعیم کے نام اور کام سے واقف ہوں گے۔ جس تلاش کا ذکر انھوں نے اپنے خط میں کیا ہے، وہ اب سے کوئی پچیس برس پہلے انھیں امریکہ لے گئی تھی، پھر وہیں کے ہو رہے۔ اب شکاگو میں بسیرا ہے اور شکاگو یونیورسٹی میں جنوب مشرقی ایشیا کی ثقافت اور زبانوں کے مرکز میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انگریزی اور اردو کے مترجم ہیں، کلچر اور لسانیات کے ماہر، تحقیق و تنقید کے علاوہ اردو اور انگریزی میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ ہندوستانی ثقافت اور ادبیات سے متعلق کئی رسائل اور کتابیں ترتیب دے چکے ہیں۔

اس روز سہ پہر کو انھیں اچانک دلی میں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔ یوں محسوس ہوا کہ بس پڑوس سے اٹھ کر آ گئے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ جس جستجو نے انھیں آٹھوں پہر ہلکان کر رکھا ہے اس کا کوئی عکس ان کے چہرے مہرے، رفتار و گفتار پر نظر نہیں آتا۔ کچھ لوگ مغرب جا کر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ چودھری محمد نعیم نے عمر عزیز کا بیشتر حصہ وہاں گزارا اور اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ ایک مستقل ٹھہراؤ کی کیفیت ہمہ وقت ان پر طاری رہتی ہے۔ آدمی اپنے دائم اور قائم سوالات کے ساتھ اگر اپنا داخلی نظم بھی برقرار رکھ سکے تو دوسروں کے لیے مسئلہ نہیں بنتا۔ ہاں جیتے جاگتے مسئلوں سے دوسروں کو دو چار

کرتا رہتا ہے۔ سو چودھری محمد نعیم بھی ایک عرصے سے یہی کچھ کر رہے ہیں۔

لسانیات اور ادب سے قطع نظر، انھوں نے برصغیر کی ثقافت، سیاست اور معاشرے، خاص طور پر مسلم معاشرے سے وابستہ بہت سے سوالات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں کچھ عرصے کے لیے تقابلی ادب کے استاد کی حیثیت سے آگئے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے مسلمانوں کی قومی شناخت کے مسئلے پر ایک معرکے کا مضمون انگریزی میں لکھا تھا۔ اب کے وہ تصوف، بالخصوص اس کی خانقاہی روایت کے بھیدوں کو جاننے کی جستجو کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور اس موضوع پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا ارادہ بھی باندھ رہے ہیں۔ اجتماع کے حوالے سے آپ اپنی ذات کو سمجھنے کا ایک طور یہ بھی ہے۔

اس بار دلی کے سفر میں چودھری محمد نعیم نے چند دنوں کے لیے کراچی میں بھی پڑاؤ ڈالا تھا۔ وہاں سلیم احمد سے موجودہ سماجی صورت حال میں دانشوروں کے رول پر ان کی گفتگو ہوئی تو سلیم احمد نے دانشور کی تعریف یہ مقرر کی کہ وہ جو الفاظ میں، رنگوں میں یا علوم وفنون کے کسی شعبہ میں اپنا اظہار کر سکے دانشور ہے۔ چودھری نعیم کا خیال ہے کہ اسی ایک وہم نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے پڑھے لکھے طبقے کو مار رکھا ہے۔ ہم اپنی چار دیواری کے باہر پھیلے ہوئے منظر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ایک ہماری ذات کے آئینے میں دنیا جہان کے رنگوں کا عکس پڑ رہا ہے۔

اس خودنگری کے ہاتھوں ہماری بصارت محدود بھی ہوئی ہے، خوار بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قومی زندگی کے وہ تمام دائرے جن کے محور پر پڑھے لکھے لوگوں کا قبضہ ہے، رفتہ رفتہ بکھرتے جاتے ہیں۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اس بکھراؤ کو ختم کرنے کا شعور بھی کھو بیٹھے ہیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب چودھری نعیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ ایک روز میری حیران آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ آرٹس فیکلٹی کی عمارت کے صدر دروازے پر چاروں طرف بکھری ہوئی سائکلیں اٹھا اٹھا کر وہ بڑے غصے کے عالم میں باہر پھینک رہے ہیں۔ میں نے اس وحشت کا سبب پوچھا تو جواب ملا کہ ''صاحب لوگ دروازے پر سائیکلیں کھڑی کر دیتے ہیں اور یہ تک نہیں سوچتے کہ آنے جانے کا راستہ بند ہو گیا ہے۔'' فیکلٹی

کے ڈین اور ان کے عملے کو اس مسئلے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

اس واقعے سے بھی کوئی پانچ چھ برس پہلے انھوں نے یونیورسٹی کے پاس ایک رقم اس درخواست کے ساتھ جمع کرادی تھی کہ اس کی آمدنی سے سال بہ سال بی اے سال اول اور ایم اے سال اول میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے طلباء کو حالی انعام اور شبلی انعام کے طور پر کچھ کتابیں دے دی جایا کریں۔ یونیورسٹی نے رقم محفوظ کرلی مگر انعامات کا منصوبہ جہاں کا تہاں رکا رہا۔ امریکہ واپس جانے کے بعد ان کی متعدد یاددہانیوں کے جواب میں وائس چانسلر کی طرف سے یہ اطلاع کی کہ یونیورسٹی کی مجلس عاملہ نے انعامات کی تجویز منظور کرلی ہے اور جلد ہی یہ سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ وہ گھڑی اب تک نہیں آئی۔

اب ان کا ارادہ ہے کہ علی گڑھ جاکر یونیورسٹی انتظامیہ سے اس مسئلے پر فیصلہ کن بات چیت کریں گے۔ تعلیمی معاشرے میں بات چیت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے مگر اس دروازے سے آمدورفت آسان نہیں ہوتی کہ یہاں کسی کو کسی کی خبر رہتی ہے نہ فکر، سورکاوٹ پیدا کرنے والے رویوں اور غفلتوں کا ڈھیر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قیادت نئے ہاتھوں میں ہے۔ یہ ہاتھ اس ڈھیر کو ہٹانے میں کب تک کس حد تک کامیاب ہوسکیں گے یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ اس جواب کے منتظرین میں ایک مسافر بھی شامل ہے جو اب امریکہ میں گزر کرتا ہے اور فی الحال سفر میں ہے۔

غرض کہ ایک زوال آشکار میں بھی تھا

یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ ان دنوں قومی زندگی کا ہر شعبہ زوال کی زد پر ہے۔ سیاست، تہذیب، معاشرت، اخلاق، ادب، تعلیم — سب کا حال پتلا ہے۔ سیاست ایک نفع بخش کاروبار بن چکی ہے۔ تہذیب آپ اپنے ہاتھوں خودکشی پر مائل۔ معاشرت ایک ملمع سازی۔ اخلاق فریب۔ ادب ایک طرح کی عیاشی۔ اور تعلیم جہل کی ترویج کا سب سے موثر وسیلہ۔ نیکی کمزوری کا نام ہے۔ اخلاص بیوقوفی کا۔ صاف گوئی، سچائی اور دیانت داری کچھ نہیں بجز ناتجربہ کاری۔

پچھلے دنوں بعض انگریزی اخبارات میں ایک اشتہار نظر سے گزرا — کنیا کماری جائیے ایل ٹی سی کا فائدہ اٹھائیے۔ یہ ایل ٹی سی کہنے کو تو مرکزی حکومت کے ملازمین کے لیے (مرکزی یونیورسٹیوں کے اساتذہ سمیت) اپنی گانٹھ سے ہلدی پھٹکری خرچ کیے بغیر تعطیلات کے زمانے میں سرکاری خرچ پر بھارت درشن کی ایک سبیل ہے۔ مگر اصلاً یہ الہ دین کا جادوئی چراغ ہے یا کھل جا سم سم کا جادوئی کلمہ۔ کہتے ہیں کہ جگہ جگہ، خاص طور سے تعلیمی اداروں کے پاس پڑوس میں بعضے حوصلہ مندوں نے امدادی دفاتر قائم کر لیے تھے کہ سال بھر کی محنت شاقہ سے تھکے تھکائے اساتذہ اور دوسرے سرکاری ملازمین وہاں جائیں اور ان کی معاونت سے گرمیوں میں پہاڑوں اور ٹھنڈے مقامات کی سیر کا لطف اٹھائیں۔ اس قسم کی رعایتوں کا جو نتیجہ ہونا چاہیے وہی ہوا۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والوں کی قطاریں لگ گئیں۔ سفر کا بندوبست کرنے والی ایجنسیوں کی مصروفیت بڑھ گئی۔

جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں سر راہے ایک بزرگ ملے۔ پوچھا میاں! کنیا کماری نہیں گئے — ہم نے پہلے تو حیرانی ظاہر کی پھر ان کا مطلب سمجھ گئے۔ جواب دیا — وہاں جا کر کیا کرتے، سال بھر جو چہرے نگاہوں کے سامنے رہتے ہیں انھیں کی بھیڑ پھر نظر آتی — ہزاروں

اساتذہ ان دنوں کنیا کماری کی سیر میں مگن ہیں۔

وہ ہماری سادگی پر ہم سے زیادہ حیران ہوئے۔ ہمارے حال پر افسوس کیا اور آگے بڑھ گئے۔ ادھر ایل ٹی سی کے شور نے فراق صاحب کے ایک مصرعے کا نیا مفہوم ہم پر روشن کیا مصرعہ یوں ہے—

تم تو فراق جی بیٹھے بیٹھے دور دور ہو آؤ ہو

یوں بھی یہ سائنس کے کرشمات کا دور ہے۔ مجھے یاد ہے ۱۹۶۹ء میں جب پہلا آدمی چاند پر گیا تھا ایک مولوی صاحب نے اپنے عقیدت مندوں میں ڈٹ کر کہا— یہ پہلا آدمی کیسے ہو گیا۔ کیا تم بھول گئے کہ ہمارے حضور نے معراج کا سفر کیا تھا اور آپ جب سفر سے لوٹے تھے تو بستر ہنوز گرم تھا۔ اور زنجیر در لرزاں تھی۔

پیغمبروں کے اقتدار کی کمندیں معجزوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ بات تو ہماری عقل ناقص میں اب بھی آتی ہے مگر انسانوں اور وہ بھی اساتذہ جیسے خستہ تن انسانوں سے کسی ایسے عمل کی توقع جس کا کوئی عقلی جواز نہ ہو کیونکہ کی جا سکتی ہے؟ لیکن بات شاید کچھ زیادہ فرسودہ ہوتی جا رہی ہے ''گھر بیٹھے مجھے کتنے زمانوں کا سفر ہے۔ اور پائے تصور کا ہر ایک رہ میں گزر ہے'' کا معاملہ اگر واقعی تصور کے سفر کا ہی ہوتا تو کچھ بری بات نہ تھی۔ آخر کو بہت سے عالم فاضل لوگوں نے فرضی سفر نامے بھی کھینچ ڈالے ہیں۔ مگر یہاں تو سچ مچ کا سفر درپیش تھا جس کی راہ میں ریز رویشن سے ریل گاڑی تک کتنے ہی مرحلے آتے ہیں۔ سائنس لاکھ ترقی کر گئی ہو پھر بھی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ریل گاڑی ڈومریا گنج یا پھاپھا مئو تک جا رہی ہو اور ہم اس پر بیٹھے کنیا کماری یا سری نگر جا پہنچیں۔ سنتے ہیں کہ بعضے جیالوں نے تو گھر کی چوکھٹ بھی پار نہیں کی اور کنیا کماری کا سمندر کا کنارا سامنے تھا۔ پرانے وقتوں میں کسی کا عشق صادق ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی تھی کہ معشوق آپ ہی عاشق کی ڈیوڑھی تک کھنچا چلا آئے۔ مقام شکر ہے کہ ہمارا عہد بہت سی پرانی باتوں کو بھلا بیٹھا مگر قصے کہانیوں میں عشاق جانباز سے منسوب یہ معجزہ کار قوت اب بھی اس کے اختیار میں ہے ؎

اتنی تو کشش دل میں میرے اے جذبۂ کامل آجائے
جب خواہش منزل پیدا ہو خود سامنے منزل آجائے

ہمارے اخلاقی زوال کی یہ ایک نئی حد ہے۔ سٹہ بازار اور سیاست کے کاروبار میں اس کے مظاہر نظر آئیں تو اب حیرت ہوتی ہے نہ عبرت کہ ان علاقوں میں کردار کے بحران کا پانی سر سے گذر چکا ہے۔ مگر تعلیمی ادارے، میڈیکل کالج کی شمولیت کے ساتھ اخلاق اور اقدار کی تربیت اور حفاظت کے مرکز سمجھے جاتے ہیں۔ ایک دوست جو ایک مشہور اسپتال میں کام کرتے ہیں اپنے اسپتال کو ذبح خانہ کہتے ہیں اور اس کا جواز یوں پیدا کرتے ہیں کہ اب معالج اخلاقی طور پر خود بیمار ہو چکے ہیں۔ اس حد تک کہ ان کے صحت یاب ہونے کی امید ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کسے ٹھہرایا جائے؟ اس نصاب تعلیم کو جو انسانی اور سماجی علوم سے لے کر میڈیکل کالجوں تک رائج ہے؟ ان سفید پوش، مہذب، شائستہ اور موقر افراد کو جو اس تعلیم کا فیض اپنے طلبا تک بہم پہنچاتے ہیں؟ اس تہذیبی ماحول کو جس کی گرفت دھیرے دھیرے اخلاق، اقدار، نصب العین، مقصد ایسی تمام گردنوں کے گرد تنگ ہوتی جا رہی ہے۔؟

ایذرا پاؤنڈ نے کہا تھا کہ کوئی شخص کسی شفا خانے میں اگر ناقص تھرمومیٹرز پہنچا رہا ہے تو آپ اسے پرلے درجے کا کمینہ اور دھوکے باز سمجھیں گے۔ مگر تعلیمی اداروں میں جو لوگ اپنے کردار اور افکار کے ذریعے یہی خدمت انجام دیتے ہیں انھیں کیا کہا جائے؟ اس کا ایک صاف سیدھا جواب ہر کس و ناکس یہ دیتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ناقص ہے۔ اس جواب پر تبصرہ مغرب کے ایک قلندر صفت ادیب ڈی ایچ لارنس نے جن لفظوں میں کیا تھا وہ اس لائق ہیں کہ ہم سب بار بار اسے پڑھیں اور ان کے روزن سے جھانکتے ہوئے مفہوم تک پہنچنے کے جتن کریں۔ وہ لفظ یوں ہیں:

"تو پھر گھپلا کہاں ہے؟ نظام تعلیم میں! لیکن یہ کہہ کر تو آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔ نظام بہر حال حاصل ہوتا ہے انسانی نفس کا، انسانی تمناؤں کا۔ ہم مشین کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ مگر یارو! مشین کس نے بنائی ہے؟ کیا ہم نے نہیں بنائی؟

نظام ہمارے اندر ہوتا ہے۔ ہم سے باہر وہ کہیں موجود نہیں ہے۔ مشین اگر ہمارے اندر نہ ہوتی تو کبھی ہمارے ہاتھوں وجود میں نہ آتی۔ تو مورد الزام ہم خود ہی ہیں۔ اپنے اندر کے سوا ہمیں کسی چیز کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔"

تمھیں چادر کے اندر پاؤں پھیلانا نہیں آتا
چادر بڑی ہے مگر تم اتنے لمبے کیوں ہو؟

رکشے والا، ریڑھی والا، خونچے والا، پان والا، سبزی والا، فٹ پاتھ والا کی طرح ان دو لفظوں — ''اردو والا'' یا ''اردو والے'' پر بھی خدا جانے کیا نحوست طاری ہے۔ انھیں سنتے ہی ذہن گندی گلیوں، شکستہ مکانوں، اجاڑ محلوں، لاچاروں بے کاروں اور خراب حالوں تک جا پہنچتا ہے۔ ویسے اردو والوں میں فراق صاحب، ملا صاحب، بیدی صاحب، حیات اللہ انصاری صاحب، سردار جعفری صاحب، قرۃ العین حیدر صاحبہ، سرور صاحب اور اردو کے بہت سے وسیع الاختیار رنگ برنگے اساتذہ اور ادیب اور دانش ور بھی ہیں۔ یہ لوگ ہمارے پسماندہ معاشرے میں ایک صاف ستھری باعزت زندگی گزارتے ہیں۔ گورنروں اور سفیروں اور وزیروں اور صنعت کاروں کے ساتھ کتنے ہی اردو والے دسترخوان پر شریک ہوتے ہیں، کاروں پر چلتے ہیں، قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، مہنگی شرابیں پیتے ہیں اور عیش سے جیتے ہیں۔ پھر اردو والوں میں بہت سے ارباب اقتدار اور بڑے اونچے پیمانے پر سیاست کا کاروبار کرنے والے بھی ہیں۔ ان میں اکا دکا سہی، مگر ایسے بھی ہیں جو روس یا امریکہ کا (اور بعضے تو دونوں کا) سفر اس بے نیازی اور ٹھاٹھ کے ساتھ کرتے ہیں جیسے ہم آپ دہلی سے علی گڑھ یا متھرا ہو آئے۔ یہ سفر بھی اردو کے نام پر ہوتے ہیں اور بدیسی یونیورسیٹوں یا بیرونی ملکوں میں یہ جیالے اسی حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ اردو والوں کا ایک وفد جنرل ضیاء الحق سے مصافحہ کرکے لوٹا ہے۔ آئے دن اردو والوں کے جلسے، سمینار مشاعرے تام جھام کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان میں بستی نظام الدین کے چند مساکین اور گندی بستیوں کے غریب غربا تو ادھر ادھر کونوں میں سکڑے سمٹے

دکھائی دیتے ہیں مگر فیشن ایبل خواتین کی موجودگی، ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی مصروفیت، نفیس سوٹوں، شیروانیوں اور ریشمی ساڑیوں کی سرسراہٹ، استری شدہ لہجوں اور چرب زبانیوں کی کھنکھناہٹ ایسے موقعوں کو ایک شاندار سماجی تقریب بنا دیتی ہے۔ چلیے اسی بہانے لوگ مل لیے۔ یہ اچھا ہے کہ بڑے شہروں میں فاصلے، جذباتی اور جغرافیائی دونوں، ملاقاتوں میں مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان تقریبوں میں خالی خولی ملاقاتوں سے زیادہ، بہت سے ذہین لوگ کاروباری فیصلے بھی کرتے ہیں، سمجھوتے، سازشیں اور غیبتیں بھی کر لیتے ہیں۔ یہ تو رہی روحانی غذا۔ اب اکثر جسمانی غذا کا اہتمام بھی جلسوں کا حصہ بن چکا ہے کباب، شیرمال، پلاؤ، قورمے کی خوشبو اچھا خاصا جشن کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ میرے ایک دوست جو کئی برس ہندوستان سے باہر رہے اور صرف ریسرچ یا کتب خانوں میں وقت ضائع کیا (چنانچہ اب بھی کرائے کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہیں) کہتے تھے کہ مغربی دنیا میں علمی جلسوں کا انداز عجب ہوتا ہے۔ یہ لگتا ہی نہیں کہ وہاں دولت اور سہولت کی فراوانی ہے۔ نوبیل انعام یافتہ علما بھی روزمرہ کے معمولی لباس میں آئے۔ دس بیس، بہت ہوئے تو سو پچاس سننے والے جمع ہو گئے۔ مقرر نے اپنا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر رکھا اور ایک سنسان سے کمرے میں علمی بحث یا مذاکرے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خاطر تواضع کے نام پر کافی کی ایک پیالی مل گئی۔ یہ تضاد دلچسپ ہے۔ اس کے برعکس اردو والوں کے جلسے، مذاکرے، مشاعرے شادی کے ہنگاموں سے مختلف نہیں ہوتے۔ گل پوشیاں، آرائشیں، شامیانے، قناتیں، دعوتیں۔ اردو والے ان موقعوں پر خاصے خوش حال اور آسودہ خاطر دکھائی دیتے ہیں۔

معاصر روزنامے ٹائمز آف انڈیا والے، مرادآباد کے حوالے سے بھی شہرت یافتہ اور یوں بھی ہندوستان کے مقتدر صحافی گری لال جین صاحب نے ابھی حال ہی میں اردو والوں کو بہت ڈانٹ پلائی۔ آخر یہ بھی کوئی بات ہے؟ ۴۷ء سے اب تک مسلسل لمبے ہوتے جا رہے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ چادر چھوٹی ہے اب اگر دوسرے اردو والوں کی اس بدعادت کا برا مانتے ہیں تو ماننا ہی چاہیے۔ بہار میں ان دنوں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے خلاف بڑی اتھل پتھل ہے۔ کہیں کہیں تو اس اتھل پتھل نے ایک باقاعدہ فتنہ و فساد کی شکل اختیار کر لی ہے۔ گری لال جین صاحب کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ ریاستی حکومت کو امن عامہ کے حق میں یہ آرڈی

نینس فوراً واپس لینا چاہیے۔ یہ کیا کم ہے کہ اردو اکیڈمیوں کو خاصی مالی امداد حکومت سے ملتی ہے۔شاعروں اور ادیبوں کو وظیفے بھی دیے جارہے ہیں، اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا بندوبست بھی ہے۔ اعلیٰ اور معیاری کتابوں پر (جو ضروری نہیں کہ اعلیٰ اور معیاری بھی ہوں) اکیڈمیوں سے انعامات ملتے ہیں۔لائبریریوں اور اشاعتی اداروں کی خبر گیری بھی کی جارہی ہے۔کیا یہ کافی نہیں؟ اور گری لال جین صاحب کی یہ منطق تو دنداں شکن ہے کہ بہار میں بہت سی بولیوں کا حلقۂ اثر اردو والوں کی دنیا سے کم پھیلا ہوا نہیں ہے۔خیر انھیں بولی اور زبان کا فرق تو لسانیت کے اساتذہ بتائیں گے لیکن اردو کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے ہمارے معاشرے کے پڑھے لکھے طبقے کی وسیع النظری اور قلب کی کشادگی کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ عصبیت اور منافرت کی جڑیں ہماری زمین میں کتنی گہری ہیں اس کا معمولی سا اندازہ اقلیتوں کے کلچر، روایات اور عقائد سے اکثریت کی بے خبری کے پیش نظر لگایا جا سکتا ہے۔ ایک روز ایک تعلیم یافتہ دوست نے کہا، قرآن اردو ہی میں تو ہے۔اور ایسوں کی تعداد تو احاطۂ شمار سے باہر ہے جو اردو کو تقسیم کی زبان سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اس زبان نے ہماری تہذیبی وحدت کو مستقل نقصان پہنچایا ہے۔ایک بار دوران سفر ایک شائستہ صورت اجنبی سے تعارف کے بعد باتیں شروع ہوئی اور کسی طرح علی گڑھ کا ذکر آیا تو ترنت بولے، وہاں کی یونیورسٹی میں عربی اور اردو کے علاوہ بھی کچھ پڑھایا جاتا ہے؟ میں حیران ہوا۔سکوت کیا اور موضوع بدل دیا۔

خیر، گری لال جین صاحب تو اردو والوں کے حال احوال سے کافی واقف ہیں۔اردو کو جو مراعات ملی ہوئی ہیں ان کی طویل اور مرعوب کن فہرست آخر انھوں نے اپنے اداریے میں دے ہی دی ہے۔ ایسا سنہرا نقشہ پیش کیا ہے کہ اردو والے اپنی بوالہوسی پر نادم ہوں اور ہماری جمہوریت اپنے مقاصد کی کامرانی پر ناز کرے۔اس ناز و انداز کے مواقع ہم بھی اپنے جلسے جلوس، جشن اور نمائشوں سے برابر فراہم کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ گری لال جین صاحب جو صحافت میں تخیل کی آمیزش سے ایک خاص تخلیقی شان پیدا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، اگر اردو والوں کے مطالبات سے ناخوش ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ پاؤں چادر دیکھ کر پھیلائے جاتے ہیں اور پھر جیسا کہ انھوں نے بتایا کہ مراعات کی چادر جو اردو والوں کو دی گئی ہے، بہت بڑی ہے۔اب یہ قصور اردو والوں کا ہے کہ ایک تو لمبے بہت ہیں اور اپنی نشو و نما کے دوران اس

بات کا خیال نہیں رکھا کہ گزارے کے لیے جو چادر ملے گی اسی کے تناسب سے ہاتھ پاؤں نکالیں۔ دوسرے یہ کہ اب لمبے ہو ہی گئے ہیں تو اپنی ہیئت میں کچھ کاٹ چھانٹ کیوں نہیں کر لیتے۔ اس کام کا بوجھ بھی ان ناتوانوں کے سر آپڑا ہے جو اردو والوں کے اعداد و شمار اکٹھا کرتے ہیں یا اسکولوں اور دفاتر میں زبان کا خانہ بھرتے ہیں۔ ان کی محنت شاقہ کے نتیجے میں اردو والوں کی تعداد یا تو ایک نقطے پر ٹھہری ہوئی ہے یا پھر وقتاً فوقتاً ''گھٹتی'' رہتی ہے۔

ایک لطیفہ آپ نے سنا ہوگا کسی نے ایک چھوٹی سی لکیر سلیٹ پر کھینچی اور ایک بچے سے کہا ایسی کیا ترکیب ہے کہ یہ لکیر بغیر کسی اضافے کے بڑی دکھائی دے؟ بچہ تو بچہ کیا جواب دیتا۔ تس پر ان صاحب نے اس لکیر کے نیچے اس سے بھی چھوٹی لکیر کھینچ دی۔ اب وہ لکیر پہلے سے دراز تر اور موثر نظر آنے لگی۔ گری لال جین صاحب اور ان کے ہم خیالوں کی بصیرت بھی ایک ننھی سی لکیر کی صورت ہے۔ سو اردو والوں کو جو مراعات حاصل ہیں ان کی لکیر انھیں اپنی اصلیت سے بڑی اگر نظر آتی ہے تو قصور کس کا ہے۔ سوچ کر جواب دیجیے میں تو کسی پر تہمت دھرنے کے بجائے اب بھی اسی وہم میں ہوں کہ ہماری قومی اور تہذیبی بصیرت کی لکیر کبھی نہ کبھی کچھ تو آگے بڑھے گی مگر کب؟ اس کا جواب اردو والوں سے پوچھنا سوال پر سوال کرنا ہے۔

کس قدر پیاری زباں اور کتنی دکھیاری زباں

پچھلے کچھ دنوں سے اردو والے ایک نئے درد کی دستک سن رہے ہیں۔ بات بظاہر ذرا سی ہے مگر ذرا ذرا سی باتیں بھی کبھی کبھار بہت گہرے اور دوررس نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔ خبر گرم ہے کہ ترقی اردو بورڈ کی ڈائریکٹرشپ سے شمس الرحمن فاروقی الگ ہو رہے ہیں۔ فاروقی صاحب اردو کے ممتاز ادیب اور سربرآوردہ نقاد ہیں۔ جو لوگ انھیں ادب کے بس ایک مخصوص میلان کا ترجمان کہہ کر خوش ہو لیتے ہیں ان سے یہ عرض کر لینے کا جی چاہتا ہے کہ ہماری ادبی روایت کے تسلسل اور کلاسیکی اقدار پر گزشتہ کئی برسوں میں اردو کے کسی دوسرے نقاد نے، کیا قدیم اور کیا جدید، اس توجہ، ارتکاز اور ذمہ داری کے ساتھ نظر نہیں ڈالی جس کی مثال شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقید فراہم کرتی ہے۔ یہ خالی خولی طرفداری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب یا ادب کی روایت کے تسلسل اور اس کی بنیادی وحدت کا عرفان حاصل کیے بغیر کوئی شخص ادب کا نقاد تو کیا، اچھا طالب علم بھی نہیں بن سکتا۔ فاروقی صاحب کے تنقیدی رویے اور ضابطے متنازعہ سہی مگر اتنا طے ہے کہ وہ مشرق و مغرب دونوں کی ادبی روایات کا بہت مربوط اور وسیع شعور رکھتے ہیں۔ اور صاحب کوئی بھی شخص متنازعہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب ہم اس کی طرف توجہ پر مجبور ہوں۔ ورنہ جہاں تک تنقید لکھنے کا تعلق ہے، تو یہ کام تو ہمارے عبادت بریلوی صاحب بھی کم سے کم اس پائے کا ضرور کر لیتے ہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا ان کی کتابیں ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ پھر فاروقی صاحب دفتری کاموں میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور عام طور پر انھیں ایک مستعد، فرض شناس اور سلیقہ مند افسر سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے جب ترقی اردو بورڈ کی قیادت انھوں نے سنبھالی تو یہ امید بندھی کہ اب بورڈ کی کارکردگی پر اعتراض کرنے والوں کا منھ بند ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ اردو والے جواب تک خدا جانے کن کن فرقوں میں بٹے ہوئے تھے، بالعموم اس نقطے پر

متفق نظر آئے کہ ترقی اردو بورڈ نے برسوں کی غفلت کے بعد اب ایک نئی کروٹ لی ہے۔ لال فیتہ شاہی کی گرفت کمزور پڑی ہے اور دفتری نظم و نسق بہتر ہوا ہے۔ فائلوں پر اب گرد نہیں جمتی۔ پرانے قرض تیزی کے ساتھ چکائے جا رہے ہیں اور کام کے سلسلے میں مترجموں اور لکھنے والوں کو یاد دہانی پر یاد دہانی کے بجائے اب نوٹس بھی ملنے لگے ہیں۔

ایک روز تاباں صاحب نے کہا— بھئی فاروقی کو بورڈ میں رکنا چاہیے اور ہم اس سلسلے میں ایک دستخطی مہم بھی شروع کریں تو کیسا رہے؟ تاباں صاحب نہایت معروف اور راسخ العقیدہ ترقی پسند ادیب ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ انھیں فاروقی صاحب کے نظریات سے بہت سا اختلاف ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے فاروقی صاحب کی کارگزاریوں اور صلاحیتوں کا اعتراف کھلے دل سے ساتھ کیا اور اس معاملے میں کسی اختلاف کو آڑے نہ آنے دیا۔ یہ واقعہ خوش آیند ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے دوست اقتدار عالم خاں نے بھی، جن سے فاروقی صاحب کا ایک مناظرہ اردو والوں کو یاد ہوگا، بہت صاف لفظوں میں کہا کہ اس منصب سے فاروقی صاحب کا الگ ہونا بورڈ اور اردو کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ کاش اس احساس میں حکومت کے وہ ارباب حل و عقد بھی شریک ہوتے جو اردو اداروں کے مقدر کا فیصلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے جن دنوں ترقی اردو بورڈ کی باگ ڈور سنبھالی مرکزی حکومت کا نقشہ دوسرا تھا۔ پھر مہرے بدل گئے۔ موجودہ حکومت بنی تو خیال ہوا کہ اپنے انتخابی منشور کا بھرم رکھنے کے لیے ایسے اقدامات پر زور دے گی جو اردو کی لسانی اور علمی حیثیت کو مزید استحکام بخش سکیں۔ لیکن ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ بورڈ کی ڈائرکٹرشپ کے لیے جو اشتہار دیا گیا اس میں یہ شرط بھی رکھی گئی کہ اس منصب کے امیدوار کا اردو میں ایم اے ہونا ضروری ہے۔ ہمیں یہ سوچ کر تو خوشی ہوئی کہ اردو ایم اے کی بے توقیری بس ایک افواہ ہے ورنہ اتنی اہم جگہ کے لیے اتنی بڑی اور کڑی شرط کیوں ٹھہرتی۔ پھر یاد آیا کہ مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عابد حسین اور فراق اور محمد حسن عسکری بھلا کون سے اردو کے ایم اے تھے۔ یہ نام تو یونہی رواروی میں یاد آ گئے ورنہ یہ فہرست ذرا سنجیدگی کے ساتھ ترتیب دینے کا قصد کیجیے تو اردو کے ایک سے ایک دانشور، شاعر، ادیب، محقق، عالم کا چہرہ سامنے آئے گا اور بتائے گا کہ میاں اردو میں ایم اے تو ہم بھی نہ کر سکے۔ انھوں نے کچھ کھویا یا نہیں اور ہم نے ان سے کچھ پایا یا نہیں اس کا فیصلہ اردو والوں پر۔

ترقی اردو بورڈ یا دوسری زبانوں کے جو بورڈ اس سطح پر قائم کیے گئے تھے اور ان کی تشکیل جن خطوط پر ہوئی تھی ان کے پیش نظر اس طرح کی شرط سیدھی سادی بد توفیقی ہے۔ پھر فاروقی صاحب نے اردو نثر و نظم میں جو کام کیا ہے (اور جس سے اردو کے ایم اے حسب توفیق استفادہ بھی کرتے ہیں) اسے دیکھتے ہوئے تو اس واقعے پر عبرت ہوتی ہے۔ بورڈ کی ترقی اور اس کے واسطے سے اردو کی علمی اور ادبی حیثیت میں اضافے کے لیے جس وژن کی ضرورت ہے، ظاہر ہے کہ اردو میں ایم اے ہونا اس کی ضمانت نہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی ادب سے قطع نظر علم کا جو بسیط اور ہمہ جہت شعور رکھتے ہیں اور اردو کو ایک جدید، ترقی یافتہ زبان بنانے کے لیے خود جو جدو جہد کرتے آئے ہیں اور اس کے علمی سرمائے میں اب تک جو اضافے کیے ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ اس منصب کے اہل ہی نہیں اس کے وقار اور اعتبار کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں اور اسے بڑھاوا بھی دے سکتے ہیں۔ اس جگہ پر ان کے تقرر کے ساتھ یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ حکومت واقعی اردو کی ترقی چاہتی ہے اور اس کو کسی قسم کے وظیفے یا پنشن کا بہانہ نہیں سمجھتی۔ مگر منصب کی ہوس اور ذاتی نام و نمود کی طلب نے اردو والوں کے ساتھ اردو کو بھی خوار کر رکھا ہے۔ جہاں کہیں کوئی ایسی راہ دکھائی دی اور لقمۂ تر کی تلاش میں لوگ دوڑ پڑے اور یہ بھوک ایسی ہے جس کا خاتمہ نہیں۔ جوع البقر کا علاج کیا ہوگا جب خود مریض اپنے حال سے بے خبر ہو اور اس وہم نے اسے مار رکھا ہو کہ ایک وہی معالج ہے۔ بعض عطائی ہر مرض کا علاج ایک چھوٹی سی ڈبیا میں رکھ لیتے ہیں لیکن ان کے لیے مناسب پلیٹ فارم تو سڑک اور بازار سے لے کر کاروبار کے دوسرے بہت سے مراکز تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر غریب اردو پر یہ مشق ستم کیوں اور کب تک؟

منھ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

شاعر کے اختیارات کا بیان کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا تھا—

شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گریا کر دے۔ درختاں پا درگل کو رواں کر دے، ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے۔ دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک کو طلا، اندھیرے کو اجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیے کہ چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان دونوں جہان شاعر کے دو مصرعوں میں ہے۔ ترازو اس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے۔ جدھر چاہے جھکا دے۔

اس اختیار کا وسیلہ وہ پر پیچ پر اسرار اور خلاقانہ قوت ہے جسے عام اصطلاح میں ہم شاعر کے تخیل سے تعبیر کرتے ہیں- خواجہ حسن نظامی کے ذکر میں آزاد کی یہ بات یوں یاد آگئی کہ یہی قوت ان کی بیشتر تحریروں میں ایک محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود آزاد جنھوں نے معمولی شعر کہے اور اعلی درجے کی تخلیقی نثر لکھی، اپنی شاعری میں تخیل اور فکر کے توازن کو قائم نہ رکھ سکے تھے۔ اس کے برعکس ان کی نثر کے وہ حصے جہاں ان کی شخصیت کا اظہار برجستہ ہوا ہے ان کے تخیل کی فتوحات کا پتہ دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس قوت کے بغیر نہ شاعری اچھی بنتی ہے نہ نثر تخلیقی ہو سکتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اظہار کا ذریعہ نثر کو بنایا مگر آزاد کی طرح انھوں نے بھی اپنی ذات کو اس منطق کے غلبے سے بچائے رکھا جو نثر سے تخلیق کا آب و رنگ چھین لیتی ہے۔ عرصہ ہوا انتظار حسین نے آزاد کو اردو کا پہلا افسانہ نگار کہا تھا۔ ادب سے محض پیشہ وارانہ دلچسپی رکھنے والے اس بات پر چونکیں گے کہ اردو افسانے کی روایت کا احاطہ کرتے وقت آزاد کا نام حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا۔ ادب کا ہر باخبر قاری، معلم، نقاد، طالب علم نثر و نظم کے امتیاز کا شعور، اصناف کے باہمی فرق اور ان کے عناصر ترکیبی کی میزان ہمہ وقت ساتھ رکھتا ہے۔ بہر حال اس رویے کی ایک علمی

بنیاد ہے سو یہاں اس پر تنقید مقصود نہیں۔ میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تخلیقی مزاج کی ایک اپنی منطق ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ مسلمات کی پابند بھی ہو۔ اس منطق کا اظہار وہ کبھی زبان و بیان کی ایک معینہ ہیئت کے حدود میں رہ کر کرتا ہے، کبھی اس سے ماورا ہو کر۔ اسی ہیئت کی فصیلوں میں وہ کوئی دروازہ یا دریچہ بھی ڈھونڈ نکالتا ہے۔ اس سرگرمی کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قید اور پابستگی کے احساس کو کچھ کم کر سکے۔ ضرورت آن پڑے تو اس حصار سے باہر دور تک پھیلے ہوئے دشت امکاں میں چلا جائے یا کم از کم اس طرح باہر کی دنیا کے موسموں، مظاہر اور اشیا سے وہ ایک انفرادی تعلق قائم کر لے۔ اس کے حواس کی قوتیں جس قدر فعال، تخیل جتنا زرخیز، اور نظر جتنی کارکشا ہوگی اس کی جستجو کا سفر بھی اسی تناسب سے تیز تر ہوتا جائے گا۔ ایسی صورت میں زبان اور بیان کے مروجہ سانچوں، آزمودہ نسخوں اور آداب میں چند تبدیلیوں کا در آنا فطری ہے۔

خواجہ صاحب ایک نثر نگار کی حیثیت سے نہ تو اپنی روایت کے منکر تھے، نہ باغی شاید اسی لیے ان کی نثر میں اردو کی پرانی، مانوس مہک محفوظ ہے یوں بھی انکار اور بغاوت بنیادی طور پر منفی رویے ہیں اور اس نفی کی تراداش ادب میں جس اثبات سے ہوتی ہے وہ اگر اجتہاد کے عنصر سے یکسر عاری ہو تو اپنی روایت کا حصہ نہیں بنتی۔ خواجہ صاحب اپنی روایت میں شامل تو ہیں مگر اس طرح کہ الگ سے بھی اپنی پہچان قائم کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی حس مزاج، ان کے موضوعات کا تنوع، ان کی ارضیت انکا تصوف، مضامین کے انتخاب میں ایک طرح کی بصری، حسی، ذہنی اور اخلاقی مساوات کا رویہ جو ان کے شعور پر کسی منظر یا مظہر کا باب بند نہیں کرتا اور بلند و پست کے احساس سے بے نیاز عالم امکاں کے ہر گوشے میں ایک بسیط اور ہمہ گیر وحدت کی تلاش اور دریافت کی جدوجہد سے مربوط ہے، غرضکہ اپنی عام زندگی کی طرح اپنی تحریروں میں بھی وہ کثیر الابعاد نظر آتے ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں خواجہ صاحب کے صرف اس پہلو کی جانب چند اشارے کروں گا جو ان کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ انکی نثر کی بنیادی سرشت کا تعین کرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ پہلو خواجہ صاحب کے تخیل کی منطق اور اس کے طریق کار سے عبارت ہے اور انکی سادہ بیانی کے باوجود انھیں اردو نثر کے ان تمام مشاہیر سے متمائز کرتا ہے جن کے اسالیب زبان و بیان کی حد تک کم و بیش انہی عناصر و اوصاف سے آراستہ ہیں جو ہمیں خواجہ صاحب

کی نثر میں دکھائی دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے نہ تو تصوف کے کسی نئے مسلک کی ایجاد کا بیڑا اٹھایا نہ تہذیبی، سماجی، روحانی فکر کے کسی ایسے منطقے تک رسائی کی جستجو کی جسے ہم ان کی دریافت کہہ سکیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک جانی پہچانی کائنات کو ایک نیا تخلیقی تناظر بخشا۔ مظاہر اور موجودات کی مانوس تنظیم میں ایک نئی باطنی ترتیب اور ارتباط کا سراغ لگایا اور ان حقیقتوں کی جو زندگی کے معمولات کا حصہ بن جانے کے سبب اپنی ندرت کا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں، جو اس کی اس ایک نئی سطح پر اس طرح یکجا کیا کہ پرانے پتوں میں نئی رتوں کی مہک پیدا ہو گئی۔ اس اعتبار سے خواجہ صاحب کا کارنامہ ایک ساتھ کئی وجہتیں اختیار کر لیتا ہے اور ایک ادیب، ایک معلم اور ایک صوفی کی حیثیت سے ان کی شخصیت کے ایک ہمہ گیر تاثر کی ترسیل کرتا ہے۔ کبھی کبھی سچی عظمت اور انفرادیت کی نمود بظاہر عام اور مانوس حقیقتوں کی زمین سے بھی ہوتی ہے۔

فلابیر کہ بجائے خود ایک بے مثال ادیب اور ایک منفرد اسلوب کا مالک تھا، کہتا تھا کہ لکھنے والے کا اسلوب دراصل اسکی روح کی آواز ہوتا ہے گویا کہ الفاظ اور زبان کا مجموعی طور اور بیان کا آہنگ اور ان کی تعیین پر اثر انداز ہونے والے رویے اور ایقانات اور احساسات، یہ سب کے سب ایک اخلاقی انتخاب کے پابند ہوتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی فکر کا بنیادی مسئلہ کیا تھا، کم و بیش وہی جو ہر صوفی کا ہوتا ہے، یعنی یہ کہ مظاہر سے ہم آہنگی کی خاطر ایک طرف تو اپنے داخلی ہیجانات کی تنظیم و تہذیب کی جائے، دوسری طرف باہر کی دنیا کے انتشار میں ایک نئی ترتیب اور ربط کا سرا ڈھونڈا جائے کہ ہر مظہر کا مخزن ایک ہی حقیقت ہے۔ اس نکتے تک رسائی کے لیے بیک وقت رد و قبول کے ایک سلسلے سے گزرنا ہوتا ہے۔ اشیا کو ان کی انفرادی ہیئتوں کے ساتھ قبول کرنا پھر انھیں اس دائرے میں محصور کرنا جو ان سب کا رمز اور نکتۂ ارتکاز ہے، جہاں انکے انفرادی نشانات ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں، خواجہ صاحب کے انشائیوں اور سب سے زیادہ انکی کتاب کائنات بیتی سے، مظاہر کا محاصرہ کرنے والی یہی سچائی ہم پر روشن ہوتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے میر کی طرح سارے جہان کو ایک آئینہ خانے کی مثال، دیکھا ہے جہاں دیواروں کے بیچ منھ نظر آتے ہیں۔ جہاں بقول آزاد پتھر گویا ہیں اور درختان پا در گل چلتے پھرتے باتیں کرتے ہیں۔ یہ کائنات بیتی، ایک آپ بیتی بھی ہے اور اس مہیب اور بے کراں اور بسیط حقیقت کی سرگذشت بھی جس کی کمندوں سے مظاہر کا کوئی نشان آزاد نہیں۔

یہاں خواجہ صاحب ایک صوفی اور ایک تخلیقی آدمی کے حقوق ساتھ ساتھ ادا کرتے ہیں۔ قدر مشترک وہ پراسرار توانائی ہے جسے آپ چاہے صوفی کا کشف کہیں یا فن کار کا تخیل۔ اہل مغرب نے اس ضمن میں بھانت بھانت کی موشگافیاں کی ہیں۔ کوئی اسے فرد کے اجتماعی لاشعور سے جوڑتا ہے۔ کوئی خوابوں کے عمل میں اس کی منطق کا سراڈھونڈتا ہے۔ ایک بزرگ کا خیال ہے کہ تخیل کی مثال اس لپٹی ہوئی پرت اندر پرت چٹائی کی ہے جو ایک لمحے کی ضرب سے کھلتی جاتی ہے اور اس میں مخفی ایک انوکھے جہان معنی کے ساز و برگ سامنے آجاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے تخیل کی بحث ان فلسفیانہ، نفسیاتی اور عمرانیاتی تصورات کی روشنی میں غالباً زیادہ کارآمد نہ ہوگی کیوں کہ ان کا تخیل شاعر کے تخیل سے مماثلت کے چند پہلوؤں کے باوجود تمام و کمال شاعر کا تخیل نہیں ہے۔ وہ ایک خلاق، نکتہ رس، معنی آفریں اور طباع ادیب تھے۔ لیکن اول و آخر ایک نثر نگار تھے۔ نثر بہر حال زمین کی چیز ہے جس کے کچھ معینہ حدود اور ضابطے ہوتے ہیں۔ تخلیقی نثر لکھنے والے کا تخیل چاہے جتنی دور کی کوڑیاں لائے، اس کا گذران بے حساب رفعتوں میں نہیں ہوتا جہاں شاعر کی نگاہ آزادانہ تیرتی پھرتی ہے۔ خواجہ صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ ایک معلوم اور مخصوص مقصد اور منضبط اخلاقی رویے کے حدود میں رہ کر بھی انھوں نے محض تخیل کی وساطت سے اپنے لیے کچھ گنجائش نکالیں اور حواس کی ان قوتوں کو جو خالی خولی نثر نگاروں کے یہاں فکر کے غلبے اور ایک خارجی منطق کے تسلط کی وجہ سے رفتہ رفتہ کند ہو جاتی ہیں، ہمیشہ زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کی تحریروں میں اشیا یا مظاہر کی محض خیالی تصوریں نہیں ابھرتیں بلکہ ایک نو دریافت سطح پر ان کے حواس کی گرفت میں آنے والی ہر شے، ہر مظہر از سر نو خلق ہوتا ہے، متحرک نظر آتا ہے اور قاری کے ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی پوری ذات پر وارد ہوتا ہے۔ کیفیتیں اور تاثرات بھی وقوعوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاری ان تحریروں کو ایک خیال پارے کے بجائے ایک کہانی کی طرح پڑھتا ہے اور حواس کے اسٹیج پر کائنات کے ایک مسلسل تماشے سے خود کو دوچار پاتا ہے۔ شبلی نے اس طریق کار کو ایک نوع کے منطقی مغالطے سے تعبیر کیا تھا۔ مغربی علما اسے logical fallacy کہتے ہیں اس کی غایت صحیح کو غلط یا غلط کو صحیح ثابت کرنے کے بجائے یہ ہے کہ ایک ایسی دلیل وضع کی جائے جو عام استدلال سے الگ اور بہ ظاہر نامانوس نظر آنے کے باوجود پڑھنے والے کی جذباتی تائید حاصل کر سکے اور اسے سچائی کا

ایک نیا تجربہ بخشے۔ چنانچہ خواجہ صاحب اپنے قاری کو صرف قائل یا مرعوب نہیں کرتے بلکہ اسے جذبے کی سطح پر سیرابی اور حسی اعتبار سے آسودگی کے احساس تک لے جاتے ہیں۔ وہ کثرت میں ایک وحدت کا اور انتشار میں ایک ربط کا سراغ پاتا ہے اور اس سچائی کے رمز تک اپنے تعصبات سے آزاد ہو کر جاتا ہے۔ ایک دھیمے اور نرم آثار آہنگ کے باوجود تسخیر کی ایسی قوت ہمیں خواجہ صاحب کے کسی بھی ہم عصر نثر نگار کے اسلوب میں نہیں دکھائی دیتی۔

محمد حسن عسکری مرحوم نے میر امن کے سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ جب ان کے درویش اپنی کہانیاں سناتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارا آسمان کہانی سنا رہا ہے۔ تجربات، واقعات اور واردات کے صفحے الٹتی ہوئی ایک طلسمی صدا روشنی کے ایک مسلسل پھیلتے بڑھتے دائرے کی مثال ساری کائنات کو اپنے اندر سمیٹتی جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب کے سب چپ ہیں اور گوش برآواز۔ خواجہ صاحب نے گنتی کے چند کرداروں یا افراد کے بجائے اس عالم بے حساب کا افسانہ رقم کیا ہے جس کا مرکزی نقطہ انسان کی ذات ہے، چنانچہ ان کی دنیا میں شجر اور حجر، بے جان اور جاندار، انسان اور جانور سب کے سب ایک ساتھ گویا نظر آتے ہیں اور تخلیق کی ازلی گت پر ہزار ہا ملی جلی آوازوں کے نغمے کا ارتعاش محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شبلی نے کہا تھا —

شاعر کی نظم میں عالم کائنات قوت تخیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہے ہم کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں حساس اور غیر حساس لیکن شاعر کے عالم تخیل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش وعقل سے لبریز ہے، آفتاب ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے، سب اس سے ہم زبانی کرتے ہیں۔ سب اس کے راز دار ہیں۔ سب سے اس کے تعلقات ہیں۔

اس موقع پر خواجہ صاحب کی کائنات بیتی کا صرف ایک اقتباس سنیے:—

ذرا خیال کر۔ پہلے تمام کائنات میں پانی تھا اور میں خاک اس کی تہہ میں چھپی ہوتی تھی پھر اس پانی کو سمندر میں ہٹا دیا گیا مگر اس کی تہہ میں بھی میں موجود ہوں اور پانی کے اندر بے شمار جانور ہیں اور ہر جانور مجھ خاک سے بنتا ہے، اور جب مرتا ہے تو پھر میرے اندر سما جاتا ہے۔ سمندر کے اندر پہاڑ بھی ہیں اور درخت بھی ہیں اور دریائی انسان بھی ہیں۔ وہ سب بھی مجھ خاک سے بنتے ہیں اور پھر میرے ہی اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ میں خاک کبھی سمندر کی تہہ میں پاؤں جما کر بیٹھتی ہوں اور کبھی سمندر کے چہرے پر موجوں میں لہراتی ہوں۔ جتنے کنارے سمندر

کے ہیں وہ بھی سب مجھ ہی سے بنے ہیں اور کناروں سے باہر لاکھوں میل کی خشک زمین میں سوائے میرے اور کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ خوبصورت پھول مجھ سے نمودار ہوتے ہیں۔ بلبل ان سے عشق بازیاں کرتے ہیں۔ کہیں وہ پھول خوبصورت گردنوں کے ہار بنتے ہیں اور کہیں وہ پھول مرنے والوں کے مزار پر چڑھتے ہیں اور خیال کرکہ ہر ایک واقعے میں ایک زندگی ہے اور ایک بیتی ہے۔

ہر واقعے میں ایک زندگی اور ایک بیتی کے سرے تک جا پہنچنا ایک خلاقانہ جیت کے بغیر ممکن نہیں- آپ چاہیں تو اسے عشق کی ایک جست کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں قم باذنی کا ایک طور یہ بھی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو خواجہ صاحب کی کائنات بیتی اپنی کھال میں سمٹے ہوئے ایک فرد کی آپ بیتی سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتی۔

(یہ کالم خواجہ حسن نظامی مذاکرات کے لیے لکھا گیا تھا۔)

یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

مختلف قریوں اور علاقوں سے موت ہمیں دانہ دانہ چنتی ہے اور اپنی جھولی میں بھر لیتی ہے۔ ساحر لدھیانوی پھر اطہر نفیس، پھر ساغر مہدی، یہ تین چہرے افراد کے تھے۔ ان کی زندگی کے پیمانے الگ الگ تھے، عمل کے میدان ایک دوسرے سے الگ اور ان کی خدمات کے دائرے بھی جدا جدا تھے۔ اب یہ تین کے تینوں ہمارے کل کا قصہ بن چکے۔ اس امتیاز سے یکسر بے نیاز کہ کون سا دائرہ کتنا بڑا اور کتنا چھوٹا ہے۔

ساحر بمبئی میں رہتے تھے، اطہر نفیس کراچی میں اور ساغر مہدی مشرقی یوپی کے ایک چھوٹے سے شہر بہرائچ میں۔ ایک بات ان سب میں مشترک رہی یہ کہ اچانک رخصت ہو گئے۔ ساحر اور ساغر مہدی کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ اطہر نفیس کچھ دنوں سے بیمار تھے، مگر ایسے نہیں کہ موت اتنی خاموشی اور سہولت کے ساتھ انھیں اپنے غلاف میں چھپا لیتی۔

ساحر ترقی پسند تھے۔ اپنے زمانے کے باغی اور برگشتہ نوجوان۔ انھیں وہ مقبولیت ملی جو ہماری فلمی دنیا میں ہیروز سے منسوب ہے۔ فوجی بھائیوں کے لیے آکاشوانی کے مختلف اسٹیشنوں سے جو پروگرام ہوتے ہیں ان میں ساحر کا نام بہت گونجتا ہے۔ سنا ہے کہ ایک فوجی چوکی کا نام بھی ان کے نام پر رکھا گیا۔ پھر نوجوانوں میں انھیں جی بھر کے سراہا گیا۔ اردو شاعری کو مقبول بنانے اور غیر اردو والوں میں اردو کی محبت کا جادو جگانے میں ساحر کا کارنامہ بے مثال ہے۔ دنیوی اعتبار سے انھوں نے بڑی ترقی کی اور اس معاملے میں اپنے تمام معاصر ترقی پسندوں سے زیادہ کامیاب ٹھہرے۔ ان کی شاعری یا تخلیقی شخصیت کو اس کے لیے کیا مول دینے پڑے، اس حساب کا یہ موقع نہیں۔ پچھلے بہت برسوں سے ان کا کلام رسائل میں بس کبھی کبھار چھپتا تھا اور نام بھی ادبی حلقوں میں کم کم ہی لیا جاتا تھا۔ مگر فلموں کے واسطے سے ساحر کا نام اور کلام معیار اور

مقبولیت کا ایک پیمانہ بن گیا تھا۔ قتیل شفائی نے ایک بار یہ دعویٰ کیا تھا کہ جب وہ گیت لکھتے ہیں تو لفظوں میں گھنگھرو پرو دیتے ہیں۔ سوان کے گانے جب فلم بین سنتے ہیں تو سر دھنتے ہیں۔ مگر ساحر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ فلموں کے کو اپنے معیار تک لانے میں اس طور پر کامیاب ہوئے کہ کم وبیش اپنا پورا مجموعہ فلموں میں کھپا دیا اور کہیں بھی ان کے اشعار اور گیت بھرتی کے محسوس نہ ہوئے۔ اس معاملے میں اختر الایمان ان سے زیادہ ہوش مند نکلے کہ مرتبہ شاعر کا پایا اور فلموں میں بس مکالے اور اسکرین پلے لکھتے رہے۔ مگر ساحر کی یہ خدمت کچھ کم وقیع نہیں کہ فلموں کی ابتری کے دور میں بھی انھوں نے اپنے گیتوں اور نغموں کی لے اونچی رکھی۔ اور کسی نہ کسی سطح پر عوام کو اس ذریعے سے ان ذہنی اور جذباتی تجربوں میں شریک کرتے رہے جو اپنے مقصد میں سنجیدہ تھے۔ ہر چند کہ بعض ایسی فلمیں بھی جن کی شہرت کے معاملے میں ساحر کے گیت ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، ہندی فلموں کے نام سے پکاری گئیں، لیکن ساحر کو فلم بینوں نے ہمیشہ اردو ہی کے ایک اچھے، سچے اور ستھرے شاعر کے طور پر جانا اور پہچانا۔ سوان کی ناوقت موت ایک لحاظ سے بالواسطہ طور پر ہماری فلموں سے اردو کی گرفت اور اس کے طلسم میں تخفیف کا سبب بنے گی۔

اطہر نفیس پاکستان کے ایک معروف غزل گو تھے۔ ان کا نام ہندو پاک کی درمیانی خلیج کو عبور کر کے خود ہمارے ملک کے ادبی حلقوں میں خاصی عزت اور محبت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ کلام کے نام سے ان کا مجموعہ کئی برس پہلے چھپا تھا۔ وہ ایک انتہائی شائستہ شاعر تھے۔ کلاسیکی نفاست اور دروبست کے باوجود ان کی شاعری اپنے زمانے کی روح کا تحفظ بھی کرتی رہی۔ کوئی سترہ اٹھارہ برس ادھر وہ ایک بار دلی کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے اور اپنی ایک غزل پڑھی تو اس کے کئی شعر اگلے دن سے لوگوں کی زبان پر ٹھہر گئے، وہ شعر اب تک یاد ہیں ؎

اتنے شائستۂ آداب محبت نہ بنو
شکوہ آتا ہے اگر لب پہ تو شکوہ بھی کرو

وہ نظر آج بھی کم معنی و بیگانہ نہیں
اس کو سمجھا بھی کرو اس پہ بھروسہ بھی کرو

انھوں نے خالی خولی کرتب بازی کے دور میں بھی اپنی روش سے انحراف نہ کیا اور اپنا شعر کہتے رہے۔ افسوس کہ یہ چراغ ابھی بہت روشن تھا اور بہت ناوقت بجھ گیا۔

ساغر مہدی بہرائچ کے رہنے والے تھے سیدھے سادے، شائستہ، نرم گفتار۔ جس روز ان کی موت کی خبر ملی اس سے ہفتہ بھر پہلے ان کا ایک پیغام ملا تھا۔ وہ بھی ایک صاحب کی مدد کے لیے۔ ہندوستان کے ادبی پرچوں میں ان کی غزلیں اکثر چھپتی تھیں اور مشاعروں میں بھی انکا کلام پسند کیا جاتا تھا۔ یوں وہ مشاعرہ بازی کے فن سے تقریباً ناواقف تھے اور اس جرگے سے بہت منفرد دکھائی دیتے تھے۔ کمال سنجیدگی کے ساتھ اپنا کلام سنایا اور داد و بے داد سے بے نیاز اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ کسی کالج میں پڑھاتے تھے اور ابھی اپنے کیریر کا آغاز ہی کیا تھا۔ ایک بار مشاعرے میں یہ شعر پڑھا ؎

جتنا لہو تھا صرف چمن ہم نے کر دیا
اب بھی نہ گل کھلیں تو نصیب چمن کی بات

تو خاصے ترنم شعرا بھی سامعین کی داد کا شور سن کر اس واقعے پر ایمان لائے کہ مشاعرے میں شعر کا ذوق رکھنے والے بھی کم نہیں ہوتے۔ انتقال کے وقت ساغر کی عمر صرف اکتالیس برس تھی۔

ایک اور موت جو سیاست گزیدہ اخبارات کی سرخی بھی بن گئی اردو کے ایک استاد کے قتل کا سانحہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالودود خاں بھوپال کے قریب سیہور کے ایک کولج میں اردو پڑھاتے تھے۔ اردو میں ادب لطیف کے نام سے ان کی ایک کتاب عرصہ ہوا چھپی تھی اور خاصی مقبول ہوئی تھی۔ نہایت خاموش، سنجیدہ اور نیک انسان تھے اور بہت ہر دلعزیز استاد۔ ملازمت کے سلسلے میں مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں میں بسیرا کیا اور جہاں بھی رہے اردو کی شمع روشن رکھی۔ برابر ادبی جلسوں اور تقریبات کا اہتمام کرتے رہتے تھے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر اچھی نظر تھی اور دونوں میں لکھتے رہتے تھے۔ ابھی چند ہی روز پہلے باہر کچھ کھٹ پٹ کی آواز سنی اور دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک گولی لگی اور ختم ہو گئے۔ مظفر حنفی سے معلوم ہوا کہ غالباً ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا۔ اس بے جگری کے ساتھ مرحوم نے دروازہ کھولا تو یہ سوچ کر کہ انکے پاس کوئی اسلحہ بھی ہوگا، اس گروہ کے کسی فرد نے گولی چلا دی۔ عبرت کی بات ہے کہ یہ واقعہ طلبا کے ہوٹل کے پہلو میں پیش آیا۔ مرحوم اس ہوٹل کے وارڈن تھے ؏

قزاق اجل کا کیسے کیسے روپ بدل کر آتا ہے!

پروفیسر عبدالسلام۔ کچھ یادیں کچھ سوغاتیں

پاکستان کے نوبل انعام یافتہ سائنس داں پروفیسر عبدالسلام کی آمد پر ہمارے علمی اور تعلیمی معاشرے نے جن جذبات کا اظہار کیا، ہر لحاظ سے وہ اس غیر معمولی، منفرد اور ممتاز مہمان کے شایان شان ہیں۔ اخبارات اور ماس میڈیا نے بھی انھیں برابر ''خبر میں رکھا''۔ جا بجا انھیں استقبالیے دیے گئے۔ اعزازی ڈگریاں تمغے اور امتیازات پیش کیے گئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ان کی ضیافت اور مہماں نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ افسوس کہ خود انکے ملک میں عوام کے ایک حلقے نے ان کے اعزاز پر جس ردعمل کا مظاہرہ کیا اس سے اس حلقے کے انداز فکر اور آداب و اخلاق کی کچھ اچھی تصویر نہیں ابھرتی۔ یہ صورت حال تشویش ناک بھی ہے۔ علوم اور افکار کے معاملے میں تنگ ذہنی اور تعصب سے کام لیا جائے تو نقصان اپنا بھی ہوتا ہے اور اس کی سزا ڈھیرے ڈھیرے پورے معاشرے کو بھگتنی پڑتی ہے۔ ادعائیت ذہنی ہو یا نظریاتی، ذہنی آزادی کی سب سے بڑی دشمن ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ علوم اور افکار کی ترقی کا کوئی تصور ذہنی آزادی کے تصور سے الگ ہو کر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ خیر یہ بات تو ضمناً آ گئی تھی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ پروفیسر عبدالسلام کا استقبال جس پر جوش انداز میں کیا گیا اس سے علم کے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اس طرح اچھوں کی عزت کر کے ہم اپنی نظروں میں اور دوسروں کی نظروں میں اپنی عزت بھی بڑھاتے ہیں۔

پروفیسر عبدالسلام کو جو اعزاز اور شہرت ملی ہے وہ اچھے اچھوں کا سر پھیر دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر ان کی دو ایک باتیں دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ ذہن شائستہ ہو تو علم اور اس کے واسطے سے ہاتھ آنے والے اعزازات کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ الٹے طبیعت اور شخصیت میں درشتگی اور غرور کی جگہ ایک مستقل انکسار اور نرمی پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ بعض

افراد کو ذرا سی عزت اور مقبولیت اور امتیاز ملا کہ ان کی چال تک بدل گئی۔ ہر جگہ نمایاں اور دوسروں سے مختلف نظر آنے کی خواہش انھیں مضحک بنا دیتی ہے۔ یہ ایک طرح کی کم ظرفی بھی ہے اور ذہنی اور اخلاقی طور پر ٹٹ پونجیا ہونے کی دلیل بھی۔ پھر کسی عالم یا دانشور کے منصب سے تو یہ باتیں اتنی چھوٹی ہیں کہ انھیں اس سے منسوب کرتے ہوئے بھی جھجک ہوتی ہے۔ اس حقیر نے اپنے زمانہ طالبعلمی میں کچھ ایسے اساتذہ بھی دیکھے جن کے علم کا شہرہ مغرب کے اعلیٰ ترین علمی مراکز تک پہنچ چکا تھا۔ وہ ہمیشہ عام وضع قطع سے معمولی اور ہر طرح کی نمائش اور ریلز مین شپ سے گریزاں نظر آئے۔ ایک ایسے ہی استاد پروفیسر ستیش چندر دیب تھے، الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور بین الاقوامی شہرت کے عالم اور استاد۔ مرحوم محمد حسن عسکری نے اپنے کتاب ''جزیرے'' کا انتساب انہی بزرگ کے نام کیا تھا۔ دیب صاحب کا حال یہ تھا کہ جس حلقے میں جاتے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے مگر انھوں نے طور یہ اپنایا تھا کہ ایک تو جلسہ جلوس سے بالعموم دور رہتے تھے اور کبھی ادھر جا بھی نکلے تو اس طرح کہ حتی الوسع نمایاں نہ نظر آئیں۔ کوشش کرتے کہ کسی گوشے میں سر جھکا کر بیٹھ جائیں۔ شعبے میں بھی وہ یا تو پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے یا پھر پڑھاتے ہوئے۔ محفل جمانے یا سیاست لڑانے کی بات تو دور رہی، جو اس زمانے میں ہمارے اساتذہ کا عام کردار بنتی جارہی ہے، دیب صاحب کے پاس ہم میں سے کوئی طالب علم بے سبب بیٹھنے اور محض نیازمندی کے اظہار کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ علم اگر اساتذہ یا طالب علموں کی شخصیت میں ستھرا پن ذہن میں کشادگی اور نفس کے احترام کا جذبہ بھی پیدا نہیں کر سکتا تو پھر کس مرض کی دوا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ تعلیمی ادارے استاد اور شاگرد کے صاف ستھرے تعلق کی جگہ خوشامد اور خوف کے اڈے بنتے جارہے ہیں۔ ان نسخوں کی مدد سے جن افراد نے ترقی اور فراغت کے درجات طے کیے وہ بالآخر انہی نسخوں کو حرز جاں بنا لیتے ہیں اور انھیں اپنے طلبا پر آزماتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

اس پس منظر میں پروفیسر عبدالسلام کے حوالے سے دو واقعات پر نگاہ کیجیے تو خیال ہوتا ہے کہ بروں کا اقتدار بڑھتا جارہا ہے مگر دنیا اچھوں سے خالی بھی نہیں ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس ہال میں ان کے استقبال کا انتظام کیا تھا وہ بہت تنگ تھا اور پروفیسر عبدالسلام کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے لیے جو مجمع اکٹھا ہوا تھا وہ خاصا بڑا تھا۔ سو آدھے لوگ

ہی اندر جا سکے۔ پروفیسر عبدالسلام کو جب پتہ چلا کہ آدھا مجمع اندر آنے سے محروم رہا تو ایک بار پھر اپنی تقریر دہرانے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ مجمع زیادہ تر طلبا کا تھا اور پروفیسر عبدالسلام کی مصروفیتوں کا بار بھی کچھ کم نہ تھا۔ یہ تو رہا ایک واقعہ بظاہر ذرا سی بات۔ سوچیے تو بہت بڑی، خاص طور سے ہمارے معاشرے میں جہاں ذرا سا مقبول شاعر، مشاعرے میں کلام سنانے سے پہلے بھی نخرے ضروری سمجھتا ہے اور لوگ سچی مصروفیت سے زیادہ مصروفیت کا طلسم باندھنے کی لذت کے اسیر ہوتے ہیں۔ دوسرا واقعہ پرفیسر عبدالسلام کے سفر کلکتہ سے متعلق ہے۔ اس شہر کو گئے تو اپنے ضعیف العمر استاد پروفیسر انیلیند رگنگو پادھیائے کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ پروفیسر گنگو پادھیائے کی عمر پچاسی برس سے زائد، فریش ہیں اور اب سے بہت آگے ۱۹۴۵-۴۶ء میں پروفیسر عبدالسلام کو لاہور کے ایک کالج میں ریاضیات پڑھاتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے بہت پہلے ایسی کتابوں کی ''ضبطی'' کا مشورہ دیا تھا ''جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔'' مگر ایک ہمارے پروفیسر عبدالسلام ہیں کہ اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کہا کہ اس ناچیز نے جتنا کچھ آپ سے سیکھا تھا اس میں کوئی بھی اضافہ نہ کرسکا۔ بوڑھے استاد کے لیے شاید دنیا کا بڑے سے بڑا اعزاز و اکرام بھی ایک سعادتمند شاگرد کی اس بات سے زیادہ قیمتی اور وقیع نہیں ہوسکتا۔ اور شاگرد بھی کس پائے کا؟

یہ باتیں دیکھنے میں عام اور معمولی ہیں، مگر انہی میں ہمارے تعلیمی معاشرے کے لیے کچھ سوغاتیں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ کیا سوچتے ہیں اساتذۂ کرم پیچ اس مسئلے کے؟ استاد نہیں سوچتے تو طالبعلموں کو ہی سوچنا چاہیے۔ مٹی نم نہ ہو تو زرخیز بھی نہ ہوگی۔

رولس رائس سے گدھا گاڑی تک

روایت ہے کہ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدلسلام نے جب تھیوریٹیکل فزکس کا ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز رکھی تو اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک فرنگی دانشوریوں گویا ہوئے: اے عزیزو! اس نوع کے مرکز کے خواب دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے رولس رائس خریدنے کا منصوبہ باندھنا، جبکہ پسماندہ ملکوں کے عوام کی اصل ضرورت بس گدھا گاڑی کی فراہمی تک محدود ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ بات ہمارے پروفیسر عبدالسلام کو اچھی نہیں لگی۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے مغربیوں کے اس حقارت آمیز رویے پر سخت برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک، جو آج سائنسی اور تکنولوجیکل ترقی کی بنیاد پر عیش کر رہے ہیں ہم مشرقیوں کو کچھ زیادہ عزت کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ نہ ہی یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی برابری کے دعوے دار ہو سکیں۔

خیر، جہاں تک برابری کا تعلق ہے ہم خود بھی بس مسجد کے صحن تک محمود و ایاز کی تفریق ختم کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اس بیان میں شک ہو تو شیوخ عرب سے پوچھ لیجیے۔ جو غریب ہندی مسلمانوں کو مسکین سمجھتے ہی نہیں بلکہ انھیں اپنے برتاؤ اور عمل سے مسکین بنائے رکھنے کی کوشش سے پل بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے۔

لیکن اسی انٹرویو میں پروفیسر عبدالسلام نے ایک ایسی بات بھی کہی جس سے یہ اندیشہ بھی سامنے آتا ہے کہ کیا عجب اگلے دس بیس برسوں میں خود شیوخ بھی رولس رائس سے دست بردار ہو کہ گدھا گاڑی پر قانع ہو جائیں۔ تاریخ کی آواز پر کان نہ دھرے جائیں تو بادشاہ کو فقیر بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی ؏

مٹے ناميوں کے نشاں کیسے کیسے

اس سوال کے جواب میں کہ عرب جنھوں نے اب سے آٹھ نو سو برس پہلے تک باقی دنیا کو سائنس اور حکمت کے درس دیے اب سائنس کے فیضان اور سائنسی تحقیقات کے فروغ کی اہمیت سے بے نیاز کیوں ہو چلے ہیں؟ پروفیسر عبدالسلام نے کہا کہ انھیں اپنے حال کے نشے سے نکل کر اپنے عظیم الشان ماضی کے ایک نئے شعور سے بہرہ ور ہونے کی ضرورت ہے۔

کیا قیامت ہے کہ جب بھی سائنسی شعور کا ذکر چھڑتا ہے، بات مغربی تمدن کے شباب تک جا پہنچتی ہے۔ پروفیسر عبدالسلام تو اس معاملے میں اتنے غیور واقع ہوئے ہیں کہ بیماری میں انگریزی دوا کھانے سے پہلے یہ سوچ کر شرمندہ ہوئے ہیں کہ اس دوا کی تیاری میں خود ان کی علمی روایت اور تحقیق کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس حد کو پہنچی ہوئی قومی غیرت بھی ایک نفسیاتی مسلہ ہے کہ اتنی ذرا ذرا سی باتوں پر دنیا کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کرنا اور سمجھنا بھی ایک لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ کم سے کم ہم جیسے عالم انسان ایسے موقعوں پر اتنی دور کی کوڑی ڈھونڈ نکالنے کے عادی نہیں ہوتے۔ مگر پروفیسر موصوف نے اس ضمن میں ایک بات ایسی بھی کہی ہے جس پر تمام مشرقیوں اور اللہ توفیق دے تو عرب شیوخ کو بھی، ذرا ٹھنڈے دماغ کے ساتھ سوچنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم مشرقی فطرتاً بھکاری واقع ہوئے ہیں۔ یوں ہمی میں جاپانی بھی شامل ہیں جنھوں نے اتنی زبردست صنعتی اور سائنسی ترقی حاصل کر لی ہے کہ مغرب کے بعض ممالک ان کے مقابلے میں بقول پروفیسر عبدالسلام "ناخواندہ" دکھائی دیتے ہیں۔ مگر یہ تو ایک استثنائی صورت ہوئی ورنہ مشرق کے پسماندہ ملکوں کا عام چلن یہی ہے کہ اپنا کاسۂ گدائی لیے مغرب کے بازاروں میں اور علمی و تحقیقی اداروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ جہاں تک علم کی طلب کا سوال ہے وہ دنیا کے دوسرے کونے تک بھی کھینچ لے جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر بہت سے مشرقی ممالک تو بس پکے پکائے مال کے خواہاں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اپنی صنعتوں کا حال ایسا خراب ہے کہ اسے صرف بدحالی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ابھی ہمارے ایک دوست سرحد پار کے سفر سے لوٹے تو اس واقعے سے بہت مرعوب نظر آئے کہ وہاں سڑکوں پر ہر طرف بس امپورٹڈ کاروں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے اور دکانوں کے شیلف مغربی ساز و سامان سے اٹے پڑے ہیں۔ عرب ممالک تو اس باب میں اور بھی آگے ہیں۔ اندازہ مقصود ہو تو کبھی حج سے لوٹنے والوں کے سامان پر ایک اچھلتی ہوئی نظر ڈال لیجیے۔ جانماز تک

جو وہ وہاں سے لے کر آتے ہیں بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ جناب میڈان فلاں ہے اور جناب والا! اسے غلطی سے عربی نہ سمجھ لیجیے گا! شیوخ عرب کا رویہ اس معاملے میں یہ ہے کہ جب تک ہماری جیبیں سونے سے اور ہماری زمینیں پٹرول سے بھری پڑی ہیں ہمیں سوچنے اور ہاتھ پیر چلانے کا کیا ضرورت ہے؟ روپے پیسے سے آسودہ حال کباڑیے جس طرح اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے "ماسٹر نوکر رکھ کر" اپنی ذمہ داری کے احساس سے آزاد ہو جاتے ہیں وہی حال آج ان ممالک کا بھی ہے جو پیڑوڈالر کی مدد سے کیا آدمی کیا مشین سبھی کچھ خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ روپیہ پیسہ ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اس سے اپنی سہولت کا سامان فراہم کیا جائے۔ مگر دولت کا رول اگر بس یہی کچھ رہا تو مغربیوں کا یہ خیال محض بے بنیاد نہ ہوگا کہ پیڑوڈالر کی حیثیت محض ایک اقتصادی قوت کی ہے اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں گے اس میں تخفیف ہوتی جائے گی۔

پروفیسر عبدالسلام نے اس آرزومندی کا اظہار کیا ہے کہ اے کاش عرب ممالک اپنی اسی قوت کا اس سے بہتر مصرف بھی نکال سکیں۔ سائنسی اور علمی تحقیق اور جستجو کے بڑے سے بڑے مرکز کا قیام جو فراغت دوام کی ضمانت بن سکے اس قوت کے استعمال کا معمولی سا کرشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مشرق، خاص طور سے وہ ممالک جنھیں آج معاشی بنیادوں پر تمام مشرق میں امتیاز حاصل ہے، اپنے اندر ایک نیا عملی اور سائنسی مزاج پیدا کر سکیں۔ بارہویں تیرہویں صدی تک عربوں اور عجمیوں نے مغربی دنیا کو علم و دانش کے جو سبق سکھائے تھے اور جنھیں آج خود بھلا بیٹھے ہیں، انھیں ایک بار پھر سے دہرانے کی ضرورت ہے۔ مقام شکر ہے کہ ہندوستان میں بہت محدود سہی لیکن ابھی وہ حلقہ موجود ہے جس کے حافظے پر خود فراموشی کی گرد نہیں جم سکی۔ خود پروفیسر عبدالسلام نے بھی ہندوستانی سائنس دانوں کے شوق تجسس اور ان کی کامرانیوں پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا ہے۔ عربوں کے وسائل فی الوقت بظاہر غیر محدود ہیں اور اگر وہ ان وسائل کو صحیح سمت پر ڈال سکیں تو کچھ عجب نہیں کہ مشرق کو ایک بار پھر اپنی عظمت رفتہ کا کھویا ہوا سرا مل جائے۔ یوں بھی اب رسل و رسائل کا کاروبار جس انتہا کو پہنچ چکا ہے اس کے بعد بس یہی باقی رہ جاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب پٹرول کی ٹنکیاں خالی نظر آئیں گی۔ ایک معروف سائنس داں نے کہا تھا، تیسری جنگ کا حال تو میں نہیں جانتا، البتہ اتنا یقینی ہے کہ اگر چوتھی عالمی جنگ کی نوبت آئی تو وہ پتھر کے ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ

اس قیاس کے لیے بھی کسی نجومی سے مدد لینے کی ضرورت نہیں کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا جب گدھے روس رائس میں جتے ہوئے دکھائی دینگے۔ مغرب تو شاید اس وقت تک پٹرول کا بدل تیار کرلے مگر مشرق؟ اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ ہمارے پروفیسر عبدالسلام نے کہ دیا ہے۔ رہے شیوخ عرب، تو وہ ہر غم کو ابھی غرق پٹرول کیے ہوئے ہیں۔

علی گڑھ — تیرا مورخ کون ہوگا؟

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ!

یہ نشان ہے، ایک نصب العین کا

یہ نام ہے، ایک تحریک کا

یہ حرف تعبیر ہے، ایک خواب کا

یہ نقش ہے، ایک خون جگر کا

یہ حاصل ہے، ایک سفر کا۔

اور یہ سفر جب شروع ہوا، اس وقت سے اب تک کئی دشوار مرحلے اس راہ میں آئے، کئی سخت موڑ، آزمائش کے کئی لمحے۔ کچھ لوگوں نے کہا— علی گڑھ ہندوستان کی سرزمین پر ایک اور پاکستان ہے۔ علی گڑھ فرقہ پرستی کا ایک مستقل اڈا ہے۔ علی گرھ ایک فرقے کی جذباتی ظلمت پسندی اور ذہنی رجعت پرستی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ایسی باتیں اب سے پہلے بھی کہی گئیں۔ آج بھی کہی جارہی ہیں، آگے بھی کہی جائیں گی۔ ہندوستان کی تاریخ ہندی مسلمانوں کو اب تک ان غلطیوں کا قصوروار سمجھتی ہے جن سے ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ آبادی کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ تاریخ انسانی حافظے کا عمل ہے۔ لیکن ہر قوم کی زندگی میں کسی نہ کسی سطح پر یہ ضرورت بھی سر اٹھاتی ہے کہ کچھ باتیں بھلادی جائیں یا انھیں تاریخ کی اپنی منطق کا جبر سمجھ کر چپ چاپ قبول کرلیا جائے۔

مختلف علاقوں، عقیدوں، نسلوں، فرقوں اور سمتوں سے تعلق رکھنے والے بہت لوگ باگ ہندوستان آئے۔ کبھی تاجر بن کر، کبھی حملہ آور کی حیثیت سے، کبھی ایک عام سیاح یا صوفی یا مصلح کی شکل میں۔ ان میں کچھ آئے اور چلے گئے، کچھ نے اسے اپنا گھر بنالیا اور وہ لوگ جنھوں نے ہندوستان کو اپنا گھر جانا انھوں نے اپنے گھر کے علاوہ یہاں اور بھی بہت کچھ بنوایا۔ سڑکیں، پل، قلعے، محلات، عبادت گاہیں، کتب خانے، مدرسے، مقبرے ان میں سے بہت کچھ کل کا قصہ ہے

اور ایک قوم کے اجتماعی شعور کا وہ حصہ جس پر ماضی کی تختی لگی ہوئی ہے۔ مگر بہت کچھ ہمارا کل بھی ہے اور آج بھی۔ ہمارا ماضی بھی ہے اور حال بھی اور شاید استقبال بھی ہو۔

ایسا ہی ایک نقش علی گڑھ بھی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی جس نصب العین، تحریک، خواب، خون جگر اور سفر کا سرمایہ ہے اس کی کہانی خاصی پرانی ہو چکی مگر ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملک کی دوسری درجنوں یونیورسٹیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا ایک مرکز بھی ہے۔ علمی اور فکری سرگرمیوں کی ترقی اور تحفظ کا ایک ادارہ نالندہ، تکشلا، جامعہ ازہر، آکسفرڈ، کیمبرج، برلن، میونخ اور پیرس، یہ بھی ایسے ہی مرکز اور ادارے تھے۔ ان میں کچھ وقت کی دھند میں کھوئے گئے، کچھ آج بھی روشن ہیں۔ اور جب کبھی ہم ان کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں خیال آتا ہے ان علوم اور افکار کا جن کی لہریں ان مراکز اور اداروں سے اٹھیں، ان علما کا جنھوں نے یہاں درس دیے، ان طلبا کا جنھوں نے علم کے حصول کو سچائی کی تلاش کا ایک ذریعہ سمجھا اور اسی تلاش میں عمریں صرف کر دیں۔

کسی یونیورسٹی کا بنیادی اور حقیقی مفہوم انھی باتوں سے متعین ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کی تاریخ اس کے اساتذہ کے علم و دانش اور طلبا کی تلاش و تحقیق کی مرہون منت ہوتی ہے اور کسی بھی حقیقت کے مفہوم کا تعین یا کسی ادارے کی تاریخ کا تجزیہ ہم سے اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اس حقیقت یا اس ادارے کی طرف ہمارے رویے محض جذباتی نہ ہوں۔ یوں جذباتی ہونا نہ تو خلاف فطرت ہے نہ ہمیشہ باعث خرابی و خفت۔ محمد حسن عسکری صاحب نے ایک بار یہ فقرہ لگایا تھا کہ جذباتی اگر آدمی نہ ہوں گے تو کیا گائیں اور بھینسیں ہوں گی؟ کبھی کبھی جذبات وہ کچھ کر دکھاتے ہیں جو عقل حیلہ جو کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ مگر انسانی صورت حالات، مسائل اور معاملات سے متعلق ہزاروں گوشے ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں جذباتیت معاملات کو سلجھانے کی بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہے۔ علی گڑھ کا المیہ بھی یہی ہے۔

ہم ہندوستانی یوں بھی ضرورت سے کچھ زیادہ، بہت زیادہ جذباتیت پسند واقع ہوئے ہیں، کبھی کبھی تو خطرناک حد تک جذباتی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے معاشرے میں جذبہ فروشوں کی بن آئی ہے۔ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور تعصب کی آواز کسی بھی حلقے، فرقے مسلک اور مکتب کے حامیوں کے ہجوم سے بلند ہو، سننے والوں کی ایک بھیڑ آناً فاناً جمع ہو جاتی ہے۔ اس

نوع کے نعرے بلند کرنا اور ان پر کان دھرنا، یہ دونوں کام بہت آسان ہیں اور ایک طرح کی ذہنی اور جذباتی تساہل پسندی کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ جب کبھی کوئی یہ کہتا ہے کہ علی گڑھ صرف اور صرف مجموعۂ خرابی ہے تو سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں آنکھ بند کر کے اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ صرف اور صرف ایک گنج خوبی ہے تو سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں بلا سوچے سمجھے اس پر یقین کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک علی گڑھ صرف رجعت اور پسماندگی اور عصبیت کا نشان ہے کچھ کے لیے محض مظلومیت کا نقش اور مخالفین کی جارحیت کا ہدف۔ دانا دشمن اور نادان دوست دونوں نے اپنی مصلحت اور مفاد پرستی کا کاروبار الگ الگ سطحوں پر جما رکھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی، کسی بھی تعلیمی اور تحقیقی ادارے میں بڑے سے بڑا ہنگامہ ہو جائے ہم اسے عام سماجی مسئلے یا تعلیمی معاشرے کا عام انتشار سمجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ لیکن علی گڑھ میں چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی فوراً ایک سیاسی رخ اختیار کر لیتا ہے۔ کمیونسٹ، کانگریسی، جن سنگھی اور مہا سبھائی، مسلم لیگی اور جماعتی — سب کے سب اپنے اپنے مصالح اور مقاصد کے تحت اس واقعے کی من مانی تعبیریں پیش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سیاست ہماری زندگیوں میں جس حد تک دخیل ہو چکی ہے اس کے پیش نظر یہ سوچنا بھی غلط ہوگا کہ یونیورسٹیوں کے طلبا، اور اساتذہ سیاسی رویوں اور مسئلوں سے یکسر لاتعلق ہو کر اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کرتے رہیں۔ لیکن تعلیم اور تعلم کے اپنے مطالبات بھی کچھ کم نہیں اور اگر اساتذہ اور طلبا، ایمانداری کے ساتھ یہ فرض ادا کرتے رہیں تو شاید بہت سی الجھنیں پیدا ہی نہ ہو سکیں۔

ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تعلیم اور تعلم کی اپنی ایک اخلاقیات بھی ہوتی ہے اور اس کے لیے کچھ حدود ایسے بھی ہیں جنھیں سیاست بازی کی ضربوں سے محفوظ رہنا چاہیے بشرطیکہ ہم سیاست اور تعلیم کے دائروں کو آپس میں گڈمڈ نہ ہونے دیں۔ یاد آتا ہے کہ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں ہوسٹل کی لائبریری کے نگراں ایک بزرگ نے ایک کتاب خریدنے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ اس کے مصنف نیاز فتح پوری مرحوم تھے۔ اور یہ بزرگ نظریاتی سطح پر نیاز کو اپنا حریف تصور کر بیٹھے تھے۔ انفرادی حیثیت سے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی پسند اور سوجھ بوجھ کے مطابق اپنی

عینک یا سیاسی اور سماجی اور مذہبی رویے کا انتخاب کرے۔ یونیورسٹیاں علم یا سچائی کی جستجو کا سب سے بڑا مرکز ہوتی ہیں اور اس بات پر اصرار کرنا محض ہٹ دھرمی ہوگی کہ سچائی کی جستجو کا بس ایک ہی راستہ ہے یا بس وہ طور ہے جسے کسی شخص نے اختیار کرلیا ہو۔ نظریاتی اور فکری اختلافات انسانوں میں ہی ہوتے ہیں گدھوں اور گھوڑوں میں نہیں۔ لیکن تعلیم ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ حصول علم کا پہلا سبق ذہنی کشادگی اور معروضیت ہے۔ ایسے اشخاص، وہ اساتذہ ہوں یا طالب علم، جنھیں علوم لہر لزم، عام آداب اور اقدار کا شعور بھی نہ بخش سکیں، دنیا کی بہترین کتابیں، افکار کے اعلیٰ ترین نمونے بھی ان کا کچھ بنا اور بگاڑ نہیں سکتے۔ کتابیں ان کی شخصیت کی تعمیر کی بجائے اسے پہلے سے زیادہ مضحک اور مسخ کر دیتی ہیں۔

بظاہر دیکھا جائے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے امراض اور المیے بھی وہی ہیں جن سے ملک کی دوسری یونیورسٹیاں دوچار ہیں۔ نااہل اساتذہ، بدشوق طالب علم، کاہل اور تن آسان انتظامیہ۔ یہ وبا تعلیمی معاشرے میں بہت عام ہے۔ وہاں بھی اساتذہ پیسے کمانے کے لیے ایسے دھندے کرتے ہیں جو کسی بھی طرح ان کے منصب کے شایان شان نہیں۔ اپنے علمی مقاصد اور استعداد میں اضافہ کی بجائے صرف زیادہ سے زیادہ کمانے کی دھن میں علمی اور فکری اعتبار سے پسماندہ ملکوں کا سفر، ترقی کے لیے خوشامد، جوڑ توڑ، منافقت اور سمجھوتہ بازی، اپنے مفادات کے لیے طلبا کا استعمال، نامعقول، مہمل لیکن "باا‌ثر" طلبا کی سرپرستی اور اچھے، متین، شائستہ، مخلص مگر "بے ضرر" طلبا کے تئیں ایک سوچی سمجھی لاتعلقی، سیاسی جماعتوں کے ذریعے طلبا اور اساتذہ کا استحصال، اقربا پروری، گٹھ بندی، رسہ کشی، ادعائیت، جہالت، فرقہ واریت، رجعت زدگی اور ذہنی قدامت پسندی، ان شناختی نشانات کا اطلاق ہر یونیورسٹی، ہر تعلیمی ادارے پر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسی غلاظت اور دھند میں روشنی کی بہت سی لکیریں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ اچھے اور ذمہ دار اساتذہ، مخلص اور محنتی طالب علم، فرض شناس اور مستعد کارکن کم سہی، تاہم ہر یونیورسٹی اور ادارے میں دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اور تحقیقی اداروں کی تاریخ ایسے ہی افراد کے عمل اور افکار اور جستجو کا حاصل ہوتی ہے۔ علی گڑھ کی تاریخ بھی اس کی علمی اور تعلیمی کامرانیوں کے قلم سے لکھی جائے گی۔ یہ قلم وہی ہاتھ سنبھالیں گے جنھوں نے ادعائیت، مصلحت کوشی، سیاست بازی، زمانہ سازی، فرقہ پرستی اور تعلیمی اخلاقیات کی پستی کا علم نہ اٹھا رکھا ہو۔ ان ہاتھوں کی پہچان اب سے آگے بھی آسان تھی، آج بھی مشکل نہیں۔

غالب اور غالب کے ایک عاشق کی یاد میں

جس شام فروری نے مہینے نے آخری ہچکی لی، میں غالب اکیڈمی میں تھا۔ سامنے مرزا کی ایک تصویر آویزاں تھی۔ غالب کے شیدائیوں کا ہجوم تھا۔ اچانک خیال آیا، ایک چہرہ جو اس ہجوم میں شامل نہیں، لیکن غالب سے متعلق ہر گفتگو، مباحثے، جشن کے موقع پر دور رہ کر بھی اپنے وجود کا احساس دلاتا تھا، اب ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکا ہے۔ چند روز پہلے ہی اخبارات سے مولانا امتیاز علی عرشی کے انتقال کی خبر ملی تھی۔

عرشی صاحب رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر تھے۔ لیکن ان کی یہ حیثیت تو بس ضمنی تھی۔ ہم نے انھیں ایک ادیب، عالم، محقق کی حیثیت سے جانا۔ ہمارے دوست اکبر علی خاں عرشی زادہ ہر سال آموں کی فصل آتے ہی ایک کارڈ بھیج دیا کرتے تھے "صلائے آم ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے۔" ہر سال ہم یہ ارادہ باندھتے کہ رام پور جائیں گے، کچھ لطف آموں کا اٹھائیں گے، مگر اس سے زیادہ یہ کہ عرشی صاحب وہاں ہوں گے۔ وہ ہمارے زمانے میں غالبیات کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ سب سے ممتاز اور خوش مذاق محقق کہ تحقیق کی خشک سامانی بھی ان کے ادبی ذوق کی شادابی کو کم کرنے میں ناکام رہی۔ ۲۷ فروری کی شام کو شمس الرحمن فاروقی سے ملاقات ہوئی اور عرشی صاحب کا ذکر چلا تو بولے، افسوس کہ دیوانِ غالب کا دوسرا ایڈیشن عرشی مرحوم کی زندگی میں نہ نکل سکا۔ برسوں سے یہ ایڈیشن نایاب تھا اور اکبر علی خاں جب بھی ملتے یہ کہتے کہ نیا ایڈیشن کوئی دم آیا ہی چاہتا ہے۔ مگر اس باب میں انجمن ترقی اردو، جس نے اس بے مثال ایڈیشن کی اشاعت کا بار اٹھایا تھا، بہت سست رفتار رہی۔ عرشی صاحب کا سفر تیز تر تھا۔ وہ اس حد کو پار کر گئے کہ اب ان کا تعاقب بھی ممکن نہیں۔

رام پور ایک بڑی اور معروف ریاست تھی۔ علمی اور ادبی حلقوں میں اسے سب سے زیادہ

شہرت عرشی صاحب کے واسطے سے ملی۔ ریسرچ اسکالرز، ادب کے عام طالب علم، علماء اور محققین جب بھی رضا لائبریری جاتے، عرشی صاحب کی یادوں کی سوغات ساتھ لاتے۔ انھوں نے اس چھوٹے سے شہر میں زندگی گزار دی۔ بغیر کسی کروفر نمود و نمائش اور شان و شوکت کے۔ ایک عالم کی سچی شان اس طرح بھی قائم ہوتی ہے۔ انھیں عربی اور فارسی زبانوں کے ادب، مذہبیات اور مشرقی علوم اور اردو، خاص طور سے اس کے کلاسیکی سرمائے پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ شعر بھی کہتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ اردو کے اکثر محققین کے برعکس مرحوم کو زبان و ادب اور تہذیب کے زندہ سوالوں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ادب کے مجھ جیسے کم سواد طالب علم، جو خالص علمی اور تحقیقی کتابوں سے ربط استوار کرنے میں خاصی دیر لگاتے ہیں، عرشی صاحب کی ہر تحریر، بہت توجہ اور شوق کے ساتھ پڑھتے تھے اور یہ تاثر لے کر اٹھتے تھے کہ اچھی تحقیق کے دائرے اتنے تنگ اور بے لوچ نہیں ہوتے کہ وہاں عام ادبی ذوق کا گزر نہ ہو سکے۔ تنقید، تخلیق اور تحقیق میں جو رشتہ عرشی صاحب نے ڈھونڈھ نکالا اور ان میں مفاہمت کا جو سلسلہ پیدا کیا، اس کی روشنی کبھی کم نہ ہوگی۔

اب تک ہر سال ماہ فروری کے آغاز کے ساتھ غالب کی یاد آتی تھی۔ اب سے آگے یہ مہینہ عرشی صاحب کی یاد بھی دلائے گا۔ اس احساس کے ساتھ کہ زندگی کی سب سے بڑی سچائی سفر ہے۔ دوسری ہر سچائی سفر کے اسی تسلسل اور دوام کی تابع ہے۔

ہمارے شاعروں میں بھی سب سے پہلے اور سب سے زیادہ گہرائی کے ساتھ غالب نے ہی اس سچائی کے بھید کو سمجھا تھا۔ اردو والوں میں یہ خیال بہت عام ہے کہ جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ یا زندگی اور زمانے کی نئی قدروں، معیاروں اور مطالبات کی گونج سب سے پہلے سرسید نے سنی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کا شعور مغلوں کے زوال کے بعد جس سطح پر عام ہوا اس کے پیچھے نمایاں ترین شخصیت سرسید کی تھی۔ سرسید کا اخلاص، دردمندی، حوصلے اور سرگرمیاں مسلمانوں میں ایک نئے تہذیبی تصور زندگی کے تئیں ایک نئے طرز احساس، تاریخ کے ایک نئے عرفان اور ایک نئی بصیرت کا نقیب بن گئیں۔ وہ نہ ہوتے تو ماضی سے حال تک پہنچنے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو کچھ اور زحمتیں اٹھانی پڑتیں اور کچھ زیادہ وقت درکار ہوتا۔ مگر وہ جو ایک بات فرائڈ نے کہی تھی کہ صوفی اور شاعر کی خلاقانہ جست،

صداقت کے اس نقطے تک پہلے ہی جا پہنچتی ہے جہاں عالم اور مفکر کے قدم بعد میں پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی صادق آتی ہے۔ شاعر انسانی کائنات و ذات کے باطن کا سیاح ہوتا ہے اور ہر سچائی ظہور میں آنے سے پہلے باطن کی دنیا کے ایک پر پیچ مرحلے سے گزرتی ہے۔ انقلاب فرانس کے بارے میں کسی مورخ کا یہ قول کتنا درست ہے کہ اصل انقلاب سے پہلے خیال اور احساس کی دنیا میں ایک انقلاب کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ غالب نے بھی اپنے زمانے کو اسی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب سر سید نے ابوالفضل کے آئین اکبری کا کام مکمل کیا اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو ہمارے شاعر نے بلا تکلف یہ لکھ بھیجا کہ مغرب میں نئی نئی چیزیں سامنے آچکی ہیں، بھانت بھانت کی ایجادات کا شور ہے۔ زمانے کا ایک نیا آئین وجود میں آچکا ہے جس کے سامنے ہر پچھلا آئین فرسودہ ہو چکا ہے۔ اب ایسے عالم میں ابوالفضل کیا اور آئین اکبری کیا؟

ہر سال فروری کے مہینے میں غالب کا نام بہت گونجتا ہے۔ جلسے، مذاکرے، مشاعرے، گل پوشیاں، مزارِ غالب پر پھول چڑھائے جاتے ہیں، غرضیکہ مرزا کے دم سے گرمی بازار باقی ہے۔ یہ سب بھی ہوتے رہنا چاہیے کہ زندگی ہمہ وقت مفید مقاصد کے پیچھے بھاگتی پھری تو بے رنگ و بے نمک ہو کر رہ جائے گی۔ مگر علامہ اقبال کی یہ بات یاد رہے تو اچھا ہے کہ زوال اور پستی کی ایک علامت وہ بھی ہے جب حقیقت خرافات میں اور امتیں روایات میں گم ہو جاتی ہیں۔

علامہ اقبال کی بات پر خیال آیا، اور غالب کے ذکر میں اس کا جواز یوں نکلتا ہے کہ اقبال کے تخلیقی اور ذہنی وجود کی ایک جہت غالب کی یاد بھی دلاتی ہے۔ سر عبد القادر مرحوم کو تو اس حد تک کہ انھوں نے اقبال کو غالب ہی کی روح کے ایک نئے پیکر کی مثال دیکھا، کہ اب کے برس ساہتیہ اکیڈمی کا اردو انعام پروفیسر اسلوب احمد انصاری کو ان کی کتاب ''اقبال کی تیرہ نظمیں'' پر ملا۔ اس سلسلے میں ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام غالب اکیڈمی نے بھی کیا تھا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی اسلوب صاحب تھے۔ مقررین میں مشہور ترقی پسند نقاد، پاکستان کے پروفیسر ممتاز حسین بھی تھے۔ ممتاز صاحب نے بتایا کہ اقبال کا بنیادی پیغام آزادی، مساوات اور عالمی برادری کا تصور ہے۔ سنتے ہی خیال آیا کہ یہی تصور اٹھارویں صدی کے انقلابِ فرانس کا بنیادی نعرہ یا منشور تھا۔ اسلوب صاحب نے اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ بات تو ٹھیک ہے مگر اقبال پر نظر

ڈالتے وقت ہمیں اس گہرے، پر پیچ رشتے کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے جو ان کی شاعری اپنے تربیت یافتہ قاری سے قائم کرتی ہے۔ ہم یہ بھی سوچتے ہیں کہ ادبی تنقید ایسی لاٹھی نہیں جس سے ہر کس و ناکس کو ایک ساتھ ہانک دیا جائے۔ نپولین بوناپارٹ یا انقلابِ فرانس کے ذہنی قائدین روسو، والتیئر، آدم اسمتھ سے اقبال کا معاملہ کسی نہ کسی حد پر الگ ہو جانا چاہیے۔ اسی لیے تو ہم جب انیسویں صدی کی تہذیبی بیداری کا قصہ چھیڑتے ہیں تو غالب سے زیادہ سرسید پر گفتگو ہوتی ہے، ہر چند کہ غالب کا نام بھی اس قصے میں شامل ہے مگر غالب کی اصل حیثیت بہرحال ایک شاعر کی تھی۔ اسی طرح جیسے عرشی صاحب محقق اور مدون تھے، مگر کلام غالب کے۔ انھوں نے غالب کے کلام کے مطالعے اور تحشیے میں، اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور جوشِ تحقیق میں شاعری کے اپنے مطالبات کی طرف سے ایک پل کے لیے بھی آنکھیں نہیں پھیریں۔ غالب کے نام پر تو خیر مہر دوام بہت پہلے ثبت ہو چکی، عرشی صاحب کا نام اور کام بھی ہماری ادبی اور علمی تاریخ میں ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

رنگ منت کشِ آواز بھی ہے!

رنگوں کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے اور ہر رنگ کا اپنا ایک تاثر۔ ناصر کاظمی مرحوم نے اپنے اس مصرعے — رنگ منت کش آواز بھی ہے، پر دوسرا مصرعہ یہ لگایا تھا کہ ''گل بھی ہے ایک نواغور سے سن!'' ۷ ۲فروری کی شام کو شہر دلّی کے کناٹ پلیس کی ایک معروف آرٹ گیلری، دھومی مل میں، ہم نے رنگوں کی زبان میں ایک کہانی سنی، یا یوں کہیئے کہ ایک ڈرامہ دیکھا۔ ہندوستان کے ممتاز مصور، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آرٹ کے شعبے کے صدر اے رام چندرن کی ڈرائنگز اور تصویروں کے ایک نئے سلسلے ''کٹھ پتلیوں کا رنگ منچ'' کی نمائش کا وہ پہلا دن تھا۔

دلّی میں آئے دن اس طرح کی نمائشیں ہوتی ہیں اور مصوری کے دس بیس، سو پچاس شیدائی انھیں دیکھ لیتے ہیں۔ سفارت خانوں کے نمائندے، غیر ملکی سیاح، روپے پیسے سے خوشحال افراد جنہیں خرچ سے زیادہ آمدنی میسر ہوتی ہے، یا نو دو لیتے یا کبھی کبھار بعض ادارے یہ تصویریں خرید لیتے ہیں۔ اب تو کتابیں بھی اتنی مہنگی ہوگئی ہیں کہ نچلے متوسط طبقے کی دسترس سے باہر ہوتی جارہی ہیں، پھر مشہور اور ممتاز مصوروں اور سنگ تراشوں کے کارناموں کا مول تو بہت زیادہ ہے۔ ہمارے پس ماندہ ملک میں بھی پانچ ہزار سے ایک لاکھ تک۔ ہم آپ ایسی جگہوں پر اگر جانکلتے ہیں تو بس اس لیے کہ آنکھوں کی کچھ ضیافت ہوجائے۔

لیکن رام چندرن کی اس نمائش میں اردو والوں کی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ سبب یہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی نصف درجن کہانیوں — بو، دھواں، کھول دو، کالی شلوار، ٹھنڈا گوشت اور اوپر نیچے درمیان کی بنیاد پر رام چندرن نے کچھ ڈرائنگز اور ایچنگز بنائی تھیں۔ بلراج مین را ان کا عکس شعور کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع کرنے کے جتن میں مصروف ہیں۔ رام چندرن کے اس کام کی شہرت پوری اردو دنیا میں

پھیلی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم اور اس کے بعد کی ہند پاک جنگوں اور جھگڑوں کے باوجود اس دنیا کا بٹوارہ اب تک نہ ہو سکا۔ اس کا ثبوت یہ واقعہ بھی ہے کہ لاہور کے مشہور ادبی رسالے "ادب لطیف" کی ایک اشاعت میں منٹو سے متعلق رام چندرن کی تین تصویروں کا عکس بھی چھپا ہے۔ انتظار حسین پچھلے برس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فکشن سیمینار میں شرکت کے لیے آئے تھے تو اپنے ساتھ رام چندرن کی منٹو سے متعلق تصویروں کا تحفہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔

منٹو کی یہ کہانیاں مختلف زمانوں میں قانونی احتساب اور سنسر شپ کا شکار ہوئیں۔ رام چندرن نے ایک بڑے ادیب کے تخلیقی استعاروں کو ایک دوسرے فنی استعارے میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے اور خوب کی ہے۔ ٹیگور جیسی داڑھی اور لمبے بالوں والے بزرگ افسانہ نگار دیوندر ستیارتھی، جن کا منٹو سے بڑا یارانہ تھا، یہ نمائش دیکھ کر ایسے بے چین ہوئے کہ رام چندرن سے برملا عشق کا اظہار کر بیٹھے۔

منٹو کی کہانیوں پر اسکیچز کے علاوہ اس نمائش میں رام چندرن کی وہ ڈرائنگز بھی شامل ہیں جن کا تخلیقی تعلق بقول شمس الرحمن فاروقی "جدید افسانے کے معمارِ اعظم" انور سجاد کے تا حال غیر مطبوعہ ناول "خوشیوں کا باغ" سے ہے۔ یہ ناول بھی شعور کے ادارے سے رام چندرن کی ڈرائنگز کے ساتھ اشاعت کا منتظر ہے۔

یہ ادب اور مصوری میں ایک نئے رشتے کے سفر کا نشان ہے۔ اب سے آگے دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاعری اور مصوری کی بعض تحریکیں ساتھ ساتھ ابھریں اور ڈوبیں۔ فنون کا رشتہ آپس میں برابر قائم رہا، مگر برا ہو اختصاص کا کہ دھیرے دھیرے فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے لاتعلق ہوتے گئے۔ مصور اپنی دنیا میں مست ہے، شاعر اور ادیب اپنی دنیا میں۔ اسی شام نمائش میں مصوری کے ایک مشہور مبصر نے کہا — یہ بڑی بات ہے کہ رام چندرن نے ادب اور ادبی تجربے کی بنیاد پر اپنے تخلیقی تجربے اور اس کے اظہار کی ایک نئی راہ نکالی ہے۔

شاعر ہو یا کہانی کار، یا ڈرامہ نگار اور مصور، وسیع تر سطح پر سب کی دنیا ایک ہے۔ ایک جیسے دکھ سکھ، ایک سی الجھنیں اور ایک سے مسائل۔ اور پھر کئی برسوں سے سیاسی اور اقتصادی اقتدار کی دو بڑی دنیاؤں روس اور امریکہ کے ساتھ ساتھ ایک تیسری دنیا کے وجود کا احساس بھی پھیل رہا

ہے۔ ایشیا اور افریقہ کے سماجی یا سیاسی یا اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ملک۔ اس تیسری دنیا کی دستکیں مغرب میں بھی سنی جا رہی ہیں اور اس کی حدیں مغرب تک پھیل چکی ہیں۔

رام چندرن نے اپنی تصویروں کے نئے سلسلے "کٹھ پتلیوں کا رنگ منچ" میں اسی تیسری دنیا کو ایک ہیبت ناک ڈرامے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ استحصال کی مختلف شکلیں، اقتصادی، سیاسی، ذہنی اور جذباتی، اس سلسلے کی چھ تصویروں میں سامنے آئی ہیں۔ فوجی آمریت اور شخصی اقتدار کا جبر، معاشی امداد کے نام پر ذہنی اور اجتماعی آزادی کو سلب کرنے کی سازش، کچلے ہوئے ہاتھ اور مقفل ہونٹ جو زندگی کی توانائی اور شادابی سے یکسر محروم ہو چکے ہیں، ان تصویروں میں ایک بے باکانہ استعاراتی سطح پر انسانی حریت اور آمریت کی کشمکش کا تماشہ دکھاتے ہیں۔

رام چندرن نے اقتدار اور جبر کا منظر بھی اسی طور پر ترتیب دیا ہے کہ جبر کو اپنے قیام کے لیے بیساکھیوں کی ضرورت آن پڑی ہے۔ فوجی وردیاں ہینگرز پر لٹکی ہوئی ہیں، ایک بندر تاشہ پیٹ رہا ہے اور اسی کی گت پر ایک جابر یوں گرم رفتار ہے کہ اس کا بدن تو ایک ہے مگر پاؤں کئی۔ گویا کہ "فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزم جانانہ"۔ ایک طرف فوجی بوٹ میں ایک پالتو کتے کی شبیہ ابھرتی ہے جس کی آنکھیں انسانوں جیسی ہیں لیکن کان ہز ماسٹرس وائس کے گراموفون ریکارڈوں پر بنے ہوئے کتے کی یاد دلاتے ہیں۔ یعنی کہ وہ خود جبر کی علامت ہے مگر اس کی اپنی علامت اور اقتدار بھی اس سے بڑے اور برتر کسی اور آقا کے احکامات سے ماخوذ ہے۔

ان تصویروں میں تمام کے تمام کردار اپنی اپنی فطرت کی روشنی سے محروم، حقیقی زندگی کی تب و تاب سے عاری اور بظاہر تخئیل اور غیر انسانی نظر آتے ہیں۔ ایک گہرا سماجی طنز سب تصویروں میں نمایاں ہے۔ ڈرامے کے مختلف کرداروں کی صورتیں چونکہ غیر حقیقی، غیر فطری اور ایک سطح پر غیر انسانی ہیں، اس لیے یہ تاثر بھی واضح ہے کہ یہ ڈرامہ انسانی دنیا کی ایک غیر انسانی، مضحک اور بدہیئت جہت کی نشاندہی کرتا ہے۔ فطری زندگی کے جوہر سے عاری ہونے کے بعد، کیا جابر اور کیا مجبور، کیا انسان اور کیا جانور، سبھی کاٹھ کی پتلیاں بن جاتے ہیں۔ ان کی ہیئتیں اور حیثیتیں اس حد تک مسخ ہو جاتی ہیں کہ مضحک دکھائی دیتی ہیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر رام چندرن کی تصویروں کا یہ سلسلہ ایک مضحک المیہ ہے، یا ایک ایسا طربیہ جس کے پردے میں تیسری دنیا کے ایک علاقے کی انسانی آبادی کا ایک المیہ بھی چھپا ہوا ہے۔

فن میں تجربہ پرستی کے میلان کے لیے ایک چیلنج سے قطع نظر، یہ تصویریں تیسری دنیا کی صورتِ حال کا ایک روشن زاویہ، احتجاج کی ایک توانا لہر کا اشاریہ بھی ہیں۔ یہاں لفظ چپ ہیں مگر رنگوں اور ہیئتوں اور خطوط کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے؟

سرکاری پنڈت، سرکاری مولوی، سرکاری جیوتشی، سرکاری ادیب، سرکاری دانشور، سرکاری صحافی بس ایک لفظ 'سرکاری' ساتھ لگا کہ ان لفظوں کے معنی بدل گئے۔ یوں ادیب، دانشور، صحافی، مولوی، مولانا، عالم، سنت اور جیوتشی خاصے معزز الفاظ ہیں۔ لیکن کیا قیامت ہے کہ یہی لفظ سرکاری جب ڈاکٹر یا انجینئر یا قانونی مشیر یا ترجمان یا ماہر منصوب بندی کے کاندھے سے کاندھا ملاتا ہے تو ان مناصب کی عزت بڑھاتا ہے یا کم سے کم ان کے وقار میں کسی تخفیف کا سبب نہیں بنتا۔ مگر ادیب یا دانشور یا صحافی یا عالم اور مولوی کے لقب کے ساتھ جہاں لفظ سرکاری کا دم چھلا دکھائی دیا، اچانک ان الفاظ کی ہیئت کے تئیں کچھ شکوک پیدا ہو جاتے ہیں۔ سبب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ القاب اپنے حقیقی جوہر کا اظہار اسی صورت میں کرتے ہیں جب سوائے اپنے ذہن، ضمیر، اپنے منصب کی اخلاقیات اور اس کے مطالبات کے، کسی دوسری مصلحت، مقصد اور خوف کے تابع نہ ہوں۔

چنانچہ ایک روز خبروں میں ہم نے جب یہ سنا کہ پارلیمنٹ کے ممبروں نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو ہماری علاقائی زبانوں اور ان کے ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کرے گی تو فوراً دل میں کچھ وسوسے پیدا ہوئے۔ ویسے دنیا بھر میں حکومتیں ادب، علوم، فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتی ہیں اور اپنے قومی کلچر کے فروغ اور اس کی حفاظت کے وسائل مہیا کرتی ہیں۔ ممتاز علما، ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازتی ہیں۔ یہ تمام باتیں بہت اچھی ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن ہمارے ایک فنکار دوست جو کئی ملکوں کا سفر کر چکے ہیں اور ان میں حکومتوں کے ذریعے فنون کی سرپرستی کا حال دیکھ آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ بیشتر ملکوں میں حکومت کی

سرپرستی انھی فنکاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو حاصل ہوتی ہے جو اوسطیت کی سطح سے اوپر دکھائی نہیں دیتے۔ مستثنیات کی بات اور ہے مگر بالعموم حکومتیں ایسوں ہی پر بارش الطاف کرتی ہیں جو اپنے اظہار اور افکار میں حکومت کے رویوں اور مقاصد سے سو فیصدی متفق ہوں۔ خود ہمارے ملکوں میں ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں کے نیشنل فورم جو چند برس پہلے قائم کیے گئے تھے۔ ان کا حال چال ابھی لوگوں کو یاد ہوگا۔ سب کی تان اس پر ٹوٹتی تھی کہ حکومت کا ہر جبر، ہر احتساب، ہر اقدام مستحسن ہے اور ہم سب کے لیے سامان برکت۔ حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی یہ کاغذی قلعے بھی مسمار ہو گئے۔ سوویت روس جیسے ملکوں میں جسے برٹرینڈ رسل نے فنکاروں کا ملک کہا تھا، عالم یہ ہے کہ جن دانشوروں، ادیبوں، فنکاروں کو حکومت کی مراعات میسر ہیں اور دن رات جن کے نام کا ڈنکا ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کی دنیا میں بجتا ہے ان میں اکثریت دوسرے اور تیسرے درجے کے افراد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومتیں لازمی طور پر فن اور ادیب اور افکار کی قدر و قیمت کے تعین اور فیصلے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتیں۔ ایک بار گاندھی جی نے ایک معروف لیکن سرکاری شاعر کی کتاب کو شاعری کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں ممتاز قرار دیا تو ایک غیر سرکاری شاعر، ہمارے سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا نے نہ صرف یہ کہ گاندھی جی کے اس فیصلے کا مذاق اڑایا بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ اس دنیا کے معاملات میں کیوں الجھتے ہیں جو آپ کی نہیں ہے۔ ادب، فنون، افکار اور علوم کی دنیا ایک ایسی مملکت ہے جہاں کسی بڑے سے بڑے جابر حکمراں، مصلح کسی اچھی سے اچھی حکومت کے اقتدار کا سکہ نہیں چلتا۔ ہماری پارلیمنٹ میں بلاشبہ ایسے افراد بھی ہوں گے جو ادب اور علوم اور فنون لطیفہ کی حرمت اور آزادی کا سچا شعور رکھتے ہوں اور اس میں کسی قسم کا سیاسی کھوٹ ملانے کے روادار نہ ہوں۔ بس شرط یہ ہے کہ برسر اقتدار سیاسی جماعتوں اور ان کے مقاصد کی دھر پکڑ سے آزاد رہیں۔ یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ خیر سے ان دنوں سرکاری ادیبوں، یوگیوں، جیوتشیوں، علما کی بن آئی ہے۔ کسی نہ کسی سطح پر ہر ملک میں اور ہمارے یہاں تو سرکاری جج کا چلن بھی اب عام ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ایک غیر ملکی مہمان صحافی سے ایک خاتون جرنلسٹ نے جب یہ پوچھا کہ آپ کے ملک میں جمہوریت کی بحالی کا امکان کیا ہے اور آپ اس مسئلے پر کیا سوچتے ہیں؟ تو ان بزرگ نے اس عزیزہ کا منھ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ہمارے یہاں فوج عوام کی ترجمان ہے، سو جمہوری اقدار اور

حکومت میں ٹکراؤ کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ گویا کہ پریس کی آزادی یا سنسر شپ کے خلاف جہاد کی باتیں محض خام خیالیاں ٹھہریں۔ یہ واقعہ سرکاری صحافت کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اسی طرح ایک روز ایک نیم سرکاری روزنامے نے جلی حرفوں میں یہ خبر شائع کی کہ یوپی میں اردو دوسری سرکاری زبان بن گئی۔ تو ہم حسب توقع مسرور بھی ہوئے اور اس احساس سے پشیمان بھی کہ بلا وجہ اب تک ریاستی حکومتوں کی لسانی پالیسی کے سلسلے میں ہم لوگ بدگمانیوں کو ہوا دیتے آئے ہیں، پھر بھی برسوں بلکہ 33 برسوں کی بدگمانی پل دو پل میں تو دور ہونے سے رہی۔ چنانچہ ہم نے اس سرخی کے تحت جو کچھ چھپا تھا بہت غور سے پڑھا۔ پہلی بار بات صاف نہیں ہوئی تو پھر پڑھا اور دو تین بار اس خبر کی تفصیل پڑھنے اور اس پر سوچ بچار کرنے سے بھی جب کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلا تو بعض ایسے دوستوں سے اس خبر پر ان کی رائے دریافت کی جن کی سوجھ بوجھ پر ہمیں اپنی ذہانت کے مقابلے میں کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ کچھ اس خبر کے ذکر پر ہنس دیے، کچھ نے صرف اتنا کہا کہ یہ بھی ایک اسٹنٹ ہے یا سیاست کی شعبدہ بازی کا ایک سحر۔ اس روزنامے میں اس عظیم الشان خبر کے ساتھ جو تفصیل دی گئی تھی اس کا یہ اقتباس آپ بھی دیکھیے اور ہو سکے تو حقیقت تک پہنچنے یا اس بھید کو بوجھنے کا جتن کیجیے۔ "جب ان سے (وزیر اعلا یوپی) دریافت کیا گیا کہ کیا اتر پردیش میں اردو کی حیثیت دوسری سرکاری زبان کی ہوگی؟ تو وزیر اعلا نے کہا کہ وہ اسے جو نام چاہیں دے سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات بالکل صاف ہے، حکومت اتر پردیش انتظامیہ اور تعلیمی اداروں میں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرے گی جیسا کہ گزشتہ انتخابی منشور میں عوام سے وعدہ کیا گیا تھا۔ وزیر اعلیٰ نے جو اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے سہارنپور جا رہے تھے، اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ضلع مجسٹریٹوں، سپرنٹنڈنٹوں، پولس اور کمشنروں کے دفاتر میں کم از کم ایک ایک اردو جاننے والے کی تقرری کی جائے گی تاکہ وہ اردو زبان میں لوگوں سے رابطہ قائم کر سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ کابینہ نے دوسری سطحوں پر بھی اردو کے زیادہ سے زیادہ استعمال کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد وزیر اعلیٰ نے اردو کو جو مراعات ملی ہوئی ہیں، ان کی ایک لمبی فہرست پیش کی۔ مثلاً اردو اکیڈمی، اردو کے تربیتی مراکز، اردو اساتذہ کا تقرر وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی بیانات کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بالعموم طول طویل ہوتے ہیں۔ ہاں بھی

اور نہیں بھی۔ یہ بھی اور وہ بھی۔ موقع اور مصلحت کے مطابق مختلف اوقات مین ان کی الگ الگ تعبیریں کی جاسکتی ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس سوال کا کہ "کیا اتر پردیش میں اردو کی حیثیت دوسری سرکاری زبان کی ہوگی؟ دوٹوک اور سیدھا سادا جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ "جی ہاں" یا "جی نہیں"، یہ کہ آپ اسے جو نام چاہیں دے سکتے ہیں۔" بظاہر بس ایک سیاسی داؤں پیچ ہے۔ اس میں گنجائش نکلتی ہے کہ کچھ دنوں تک مسئلے کو ٹال دیا جائے کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا جائے کہ بھائی ہم تو پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔" اس مطالبے کے خلاف اگر کوئی تحریک شروع ہو اور اس کا پلہ بھاری ہو تو یہ عرض کر دیا جائے کہ "صاحب! ہم نے تو بس کچھ سہولتیں دینے کی بات کی تھی۔ غصہ تھوک دیجیے۔"

بہار کے اردو دوست اور بہار کی حکومت دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایک نے اپنے مطالبے میں اور دوسرے نے اپنی منظوری میں کسی لگی لپٹی کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ جو کچھ طلب کیا گیا اور جو کچھ نہیں دیا گیا دونوں صورتیں واضح ہیں۔ یوپی کے اردو دوستوں، اردو تحریک کے علم برداروں اور اردو دوستی کا دعویٰ کرنے والے صاحبان اختیار کو بھی یہی راہ اپنانی چاہیے کہ راستی سیدھی سڑک ہے۔۔۔۔۔۔!

وہ حیلہ جو کہیں رستے میں رہ گیا ہوگا

''۱۹۴۷ء کی سردیوں کی شام کا ذکر ہے۔ میں فلیمنگ روڈ پر ایک چھوٹے سے ٹی اسٹال میں چائے پی رہا تھا کہ چائے خانے میں مراتب علی تائب داخل ہوئے کہ ان سے ہر شام وہاں ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ایک موٹا تازہ شخص سگریٹ کو انگوٹھے اور دو انگلیوں میں تھامے جھومتا جھامتا اندر گھس آیا۔ گندمی رنگ، کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا جسم، توند کچھ بڑھی ہوئی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے جیسے از خود اس کے جسم پر اٹک گئے ہوں، بوسیدہ کوٹ کے بٹن غائب، پاجامہ نما پتلون ڈھلکی ہوئی جس کو وہ بار بار ہاتھ سے پکڑ کر اونچا کرتا تھا۔ گردن پر جمی ہوئی میل کی تہہ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کئی دن سے نہیں نہایا اور آنکھوں میں ایک معصومانہ چمک۔''

یہ حلیہ شاد امرتسری کے مطابق سید عبدالحمید عدم کا ہے، اردو کے مشہور شاعر۔ چند روز پہلے ریڈیو پاکستان نے خبر دی کہ عدم بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔

یوں اس شاعر نے عمر ستر برس کی پائی، مگر زندگی میں ایک دو نہیں سیکڑوں موقع ایسے آئے جب اپنی بے اعتدالیوں کے سبب، موت کی سمت بڑھتے بڑھتے اس نے راستہ بدل دیا۔ کئی کئی روز تک گھر والے تلاش میں سرگرداں رہے، بعد کو پتہ چلا کہ کسی ہم پیالہ دوست کے گھر بسیرا ہے۔

عدم بہت معروف شاعر تھے مگر بڑے شاعر نہ تھے۔ ان کے کلام سے شناسائی اب سے لگ بھگ پچیس برس پہلے ان دنوں ہوئی جب میں اسکول کا طالب علم تھا۔ 'ماہِ نو' مین عدم کے چند قطعات چھپے تھے۔ ایک اب تک یاد ہے:

کام کے لوگ تو بصد دقت
ہر زمانے میں چند ملتے ہیں
ورنہ اس نیک بخت دنیا میں
سب ترقی پسند ملتے ہیں

پھر جو غزلیں اور قطعے پڑھے ان میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربے، روزمرہ کی باتیں، صاف سادہ، سہل زبان و بیان۔ اس شاعری میں ان دنوں جو خوبی دکھائی دی وہ ایک طرح کی رومانیت، مستی اور وارفتگی تھی۔ بعد میں عدم کی شخصیت کا جو احوال پڑھا اس سے اندازہ ہوا کہ اس شاعرِ خرابات کی زندگی اور شاعری دونوں ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ احساس کی جس رومانیت اور جذبے کی جس آزادی کا اظہار اس کے شعروں میں ہوتا ہے، وہی طور اس کی عام زندگی کا بھی ہے۔ عدم کے دوست شاد امرتسری نے اس وارفتگی کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:

''عدم صاحب کی وارفتگی بھی منفرد نوعیت کی حامل ہے۔ منفرد میں نے اس لیے کہا کہ بعض اوقات ان کی وارفتگی نے عجیب عجیب گل کھلائے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ ان دنوں لاہور میں فسادات نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ ایک رات ظہیر کاشمیری اور عدم صاحب میرے گھر ہی سو رہے۔ قریب قریب صبح ہونے والی ہوگی کہ کمرے میں شور ہوا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تو کمرے میں بتی جل رہی تھی اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ ظہیر کاشمیری مجھے چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ عدم صاحب کا تکیہ بالکل جل چکا ہے۔ بستر کی چادر جل رہی ہے، یہاں تک کہ عدم صاحب کے سر کے بال بھی جل رہے ہیں۔ مگر انھیں قطعاً ہوش نہیں۔ آخر بصد مشکل میں نے اور ظہیر کاشمیری نے عدم صاحب کو جگایا۔ تکیے کو صحن کے دستی پمپ کے پانی سے بجھایا۔ عدم صاحب کو یہ معلوم کر کے بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی کہ ان کی گردن جل رہی تھی۔ کہنے لگے: ''حضور! ایسا تو کئی بار ہوا ہے۔'' یہ کہا اور سگریٹ جلا لیا۔ خیر کچھ دیر بعد سب کے سب پھر سو گئے۔ ابھی بمشکل آدھ گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ ظہیر کاشمیری کی آواز پھر گونجی۔ پھر اٹھے تو دیکھا کہ عدم صاحب کی قمیص جل رہی ہے مگر وہ بے سدھ پڑے ہیں۔''

ایک طرف یہ وارفتگی تھی، دوسری طرف یہ ستم ظریفی کہ عدم نے معاش کا جو وسیلہ تلاش کیا وہ ٹھیٹ جمع خرچ کے حساب کتاب کا تھا۔ ملٹری اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں اول اول کلرک کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں اس محکمے کے ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر کی اسامی تک جا پہنچے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ اس کے بعد ریٹائرمنٹ کی گھڑی تک کوئی اور ترقی نہیں ملی۔ اور ۱۹۶۶ء میں اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

یہی حال عدم کی شعر گوئی کا تھا۔غزلیں تھوک کے حساب سے کہتے تھے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام کے تمام شعر یاد رکھتے تھے۔ایک طرف اپنے آپ سے ایسی غفلت، دوسری طرف اپنی شاعری کے معاملے میں حافظے کی یہ بیداری۔روایت ہے کہ ایک بار انھیں اچانک کچھ روپوں کی ضرورت آن پڑی۔اتوار کا دن تھا، دفتر اور بینک بند۔یہ ارادہ باندھ کر بیٹھے کہ ایک مجموعہ ترتیب دے ڈالیں اور ناشر کے ہاتھ فروخت کر دیں۔اس وقت بیاضیں بھی سامنے نہ تھیں۔سادے کاغذ اور قلم لے کر جم گئے اور حافظے کے کونوں کھدروں سے ڈھونڈ کر دو گھنٹے کے اندر اندر کوئی دو سو قطعے نکال لائے۔مسودہ تیار تھا۔فوراً ہی اس کا نام تجویز کیا ''ہوائے برشگال'' اور ہاتھ کے ہاتھ ناشر سے اس کا معاوضہ وصول کرلیا۔

اس پرگوئی نے عدم کی شاعری کو خاصا نقصان پہنچایا۔ان کی زودگوئی کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے—ایک رات جب وہ اپنے ایک دوست کے گھر پڑے ہوئے تھے، بارہ بجے کے قریب دوست کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عدم صاحب چارپائی پر بیٹھے ہیں۔کمرے میں روشنی ہے۔ایک ہاتھ میں سگریٹ دبا ہوا ہے، دوسرے میں پنسل اور سامنے نوٹ بک۔دوسری صبح دوست کے پوچھنے پر بتایا کہ پچھلی رات بس سات غزلیں ہو سکیں۔اس رفتار سے گھاس بھی نہیں کاٹی جاتی، شعر کہنا تو دور رہا۔چنانچہ یہی ہوا کہ ایک درجن سے زائد مجموعوں میں ایسے شعر جو ادب کا تربیت یافتہ ذوق رکھنے والوں کو متاثر کرسکیں، ان کا تناسب ایک دو فیصدی سے زیادہ نہیں ہے

بہار و خزاں کم نگاہوں کے وہم
برے یا بھلے سب زمانے ترے

عشق نے سونپا ہے کام اپنا اب تو نبھانا ہی ہوگا
میں بھی کچھ کوشش کرتا ہوں آپ بھی کچھ امداد کریں

بعض اوقات کسی اور سے ملنے سے عدمؔ
اپنی ہستی سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے

جو اکثر بارور ہونے سے پہلے ٹوٹ جاتے تھے
وہی خستہ شکستہ عہد و پیماں یاد آتے ہیں

ہاتھ سے کھو نہ بیٹھنا اس کو
اتنی خودداریاں نہیں اچھی

اس وقت دس بارہ غزلیں سامنے تھیں ان میں یہی شعر غنیمت دکھائی دیے۔ مگر یہ واقعہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ مشاعرے کے شیدائیوں اور عام لوگوں میں عدم نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو کو خاصا مقبول بنایا۔ ان کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن جو ہمارے ملک میں چھپے اس مقبولیت کا ثبوت ہیں۔ ان میں اچھا شعر کہنے کی صلاحیت تھی لیکن شاعری کے معاملے میں بھی کمال کے نقطے تک پہنچنے کی طلب شاید ان میں پیدا ہی نہ ہوئی اور ان کا رویہ اس میدان میں بھی وہی رہا جس کی طرف ایک شعر میں یوں اشارہ کیا تھا ؂

قریب کعبہ پہنچ کر عدم کو مت ڈھونڈو
وہ حیلہ جو کہیں رستے میں رہ گیا ہوگا

خلیق بھائی!

فنا ہوئے تو کچھ ایسے کہ جیسے تھے ہی نہیں
ہمارے بعد ہمارے نشاں ملے ہی نہیں

انتقال سے ہفتہ بھر پہلے جب خلیق بھائی دہلی کے ہولی فیملی اسپتال کے ایک پرائیوٹ وارڈ میں فریش تھے، انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ یہ ملاقات ان سے آخری ملاقات بن جائے گی۔ دھان پان آدمی تھے۔ بیماری سے پہلے ہر صبح وہ اپنے خوبصورت ننھے سے سفید فام کتے کی زنجیر تھامے چہل قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتے تو یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا کہ کون کسے کھینچ رہا ہے۔ مگر ضعف اور نقاہت کے باوجود ان کی شخصیت میں ایک عجیب طنطنہ تھا۔ آخری ملاقات کے دوران بھی، جب ان کی حالت خاصی غیر تھی، وہ ہنستے، قہقہے لگاتے رہے۔ بڑی کیفیت کے ساتھ اپنی غزل سناتے رہے جس کی لے بہت نشاطیہ تھی۔ پھر فرمائش کی کہ دوبارہ ان کے پاس آؤں تو فیض کا کچھ کلام اپنے ساتھ لیتا جاؤں۔ شاید ''موضوعِ سخن'' پڑھنا چاہتے تھے ؎

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ یہ دھندلی سی حنا کی تحریر

خلیق بھائی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اقتصادیات کے استاد تھے۔ اردو کے مشہور محقق اور صحافی عتیق صدیقی صاحب کے چھوٹے بھائی۔ صحت کی خرابی کے سبب عتیق صاحب کے ہم عمر

نظر آتے تھے۔ مگر اپنی خردی کا بھرم ہمیشہ قائم رکھا۔ عتیق صاحب کے سامنے انھیں جب بھی دیکھا، خاموش دیکھا۔ عتیق صاحب کی طبیعت میں جتنا اضطراب، گفتار و اطوار میں جتنی کاٹ، تیزی اور طراری ہے، خلیق بھائی میں اتنا ہی ضبط، ٹھہراؤ، تحمل اور نرمی تھی۔ یوں دونوں بھائیوں میں علم و ادب سے شغف مشترک تھا۔ عتیق صاحب نے بہت کتابیں لکھیں اور بہت نام کمایا۔ تحقیق کا کام اس محنت اور دل جمعی کے ساتھ کرتے ہیں کہ نہ تو مزاج کی عجلت پسندی ظاہر ہوتی ہے نہ یہ گمان گزرتا ہے کہ کتاب سازی کے فن میں کمال اور اس کی بنیاد پر صاحب کتاب کہے جانے کے طالب ہیں۔ اُدھر خلیق بھائی کا حال یہ تھا کہ جو لکھا اسے چھپائے بیٹھے رہے۔ ترجمہ وہ بہت اچھا کرتے تھے اور اردو انگریزی دونوں زبانوں کے بڑے رمز شناس تھے۔ علمی کتابوں کے کئی ترجمے جو انھوں نے کیے، ان کا ذکر بھی کبھی زبان پر نہ آیا۔ کسی نے یاد دلایا تو ہنس کر بات پلٹ دی۔

اصل میں خلیق بھائی بڑی وضع دار اور رچی ہوئی شخصیت رکھتے تھے۔ کبھی کسی کی بدگوئی نہ کی۔ مگر بعض رویوں کے تئیں ان کی ناپسندیدگی ان کی باتوں سے اور اس سے بھی زیادہ ان کی اپنی زندگی کے طور طریقوں سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔ انھیں اپنی ذات کے ڈھنڈورچیوں اور علم کے معاملے میں کم خرچ بالا نشینوں سے بڑی نفرت تھی۔ اکثر چپ رہتے، دوسروں کی باتیں سنتے رہتے۔ ضبط نہ ہوتا تو بس ایک خندۂ زیرلب یا پھر چبھتے ہوئے دو ایک فقرے جما دیتے۔ اچھے فقرے انھیں بہت سوجھتے تھے۔

شعر بہت اچھا کہتے تھے اور بہت لہک کر پڑھتے تھے۔ اس معاملے میں خلیق بھائی کا ذوق کلاسیکی تھا اور انھیں اردو فارسی کے بے شمار شعر یاد تھے۔ پرانوں میں وہ سب سے زیادہ عاشق میر اور غالب کے تھے۔ فارسی اساتذہ میں حافظ، عرفی اور بیدل کے۔ مگر اس طرح کا ذوق رکھنے والوں میں جو ایک تعصب اور تنگ نظری پیدا ہو جاتی ہے، خلیق بھائی میں نام کو نہ تھی۔ فیض، مخدوم، جذبی، مجاز اور مجروح سے آگے نئے لکھنے والوں کا کلام بھی شوق سے پڑھتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو کہتے ''ناصر کاظمی یا احمد مشتاق یا ظفر اقبال یا شکیب جلالی کا شعر سناؤ!'' لوگوں کے یہاں کم آتے جاتے تھے اور اپنی دنیا میں مگن رہتے۔ کبھی شام کو ہماری طرف آنکلتے تو اس طلب کے ساتھ کہ پاکستان سے کوئی نیا رسالہ آیا ہو تو اُدھر کے کسی شاعر کا کلام سناؤں۔

ایک شام کوئی دو گھنٹے تک مسلسل زاہد ڈار، کشور ناہید اور عباس اطہر کی نظمیں سنتے رہے۔ عزیز

حامد مدنی کا کلام بھی ان کے دل کو لگتا تھا۔ شعر سنتے وقت آنکھیں بند کر لیتے اور بہت سنجیدہ ہو جاتے۔ نہ آہ نہ واہ۔ کبھی کسی کے شعر یا گفتگو یا تقریر میں کوئی گڑبڑ دکھائی دیتی تو ہونٹوں پر بس ایک طنزیہ مسکراہٹ۔ مجھے اکثر خلیق بھائی کی مسکراہٹ میں لوگوں کی اس حماقت کا سراغ ملا جو ستر پردوں میں مستور تھی۔

خلیق بھائی نے خاصی آزمائشوں کی زندگی گزاری۔ بظاہر کمزور مگر اندر سے مضبوط اتنے تھے کہ اپنا درد اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔ غم گساری کی تمنا تو دور رہی، اپنے غم کی حفاظت بھی اس طرح کہ کسی کو اس کے وجود کا اتا پتہ نہ ملے۔ ان میں قصباتی شرفا کا رکھ رکھاؤ تھا۔ زندگی بھی ویسی ہی گزاری۔ گرمیوں میں سفید بے داغ ململ کا کرتا، پاجامہ، سردیوں میں سیاہ شیروانی، اس پر ایک دبیز شال اور ٹوپی۔ یہ ان کا شام کا لباس تھا اور اس میں کبھی فرق نہ آیا۔

کئی بار ان سے فرمائش کی کہ اپنا کلام دوسروں تک بھی پہنچائیں۔ مجھے یقین ہے ان کا شعر چھپتا تو اچھے اچھوں سے کم مشہور نہ ہوتا۔ مگر جب بھی ایسی کوئی بات نکلتی وہ نہ تو دوسروں کی شہرت کا مذاق اڑاتے نہ اپنی بے نیازی اور خلوت گزینی پر کسی قسم کے احساسِ تفاخر کا اظہار کرتے۔ ''ارے یار! چھوڑو! لاحول ولا قوۃ!'' ایسے موقعوں پر خلیق بھائی کا یہی ایک تکیہ کلام تھا۔ اسی طرح اردو زبان اور خاص طور سے اس کی کلاسیکی روایت پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ ان کا ادبی ذوق ادب کے پیشہ ور معلموں سے زیادہ ستھرا اور شائستہ تھا۔ لیکن اس کے اظہار میں بھی وہ بخیل رہے۔ لے دے کے ایک جامعہ کا ترانہ خلیق بھائی کی وہ متاع ہے جو عام بھی ہوئی اور شاید جامعہ کا نام جب تک چلتا رہے گا اس کی روشنی باقی رہے گی۔

یہ بھی غالباً اسی وجہ سے ہو سکا کہ خلیق بھائی کو جامعہ سے بڑی محبت تھی۔ زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے اسی ''غریب و سادہ و رنگیں'' ادارے کی خدمت میں گزارا۔ ایک بات جو اس ادارے کے پرانے کارکنوں کی شخصیت کا وصف امتیاز رہی وہ ہر معاملے میں طبیعت کی سادگی، ستھرا پن اور قلندری ہے۔ اس کی دو بہت روشن مثالیں ڈاکٹر سید عابد حسین اور شفیق الرحمن قدوائی مرحوم کی شخصیتیں تھیں کہ ایک نے علم و دانش کی دنیا میں اور دوسرے نے سیاست اور رفاہِ عامہ کے میدان میں بڑے معرکے سر کیے۔ مگر اپنی سادگی اور قلندرانہ بے نیازی کا بھرم بھی بچائے رکھا۔ خلیق بھائی نے تو تقریباً ایک گمنام آدمی کی زندگی گزاری، مگر کس سلیقے اور دلنوازی کے

ساتھ! جامعہ کے طلبا جو آئے دن اپنا ترانہ گنگناتے ہیں ان میں بھی شاید ہی دس پانچ فیصد کو اس بات کی بھنک ملی ہو کہ اس کا مغنی کون تھا اور کب چپ چاپ ان کی محفل سے اٹھ گیا۔ زندگی اور موت دونوں میں ایک سا وقار بس اکادکا افراد کا مقدر ہوتا ہے۔ خلیق بھائی غالب کے شعر کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کے بھی بہت عاشق تھے۔ اس وقت خلیق بھائی کی یاد کے ساتھ غالب کے یہ بول بھی یاد آئے کہ ''دنیا میں نامور ہوئے تو کیا، گمنام جئے تو کیا۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ وجہ معاش ہو، کچھ صحت جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یار جانی۔'' خلیق بھائی کو معاش کی طرف سے فراغت بہت دیر میں میسر آئی اور صحت جسمانی کا حال تو ہم سنا ہی چکے۔ پھر بھی انھوں نے شہرت اور ناموری کے بھید عجب ڈھنگ سے مٹائے۔ ایسی گمنامیاں شہرت بن جائیں تو شاید زندگی کو کچھ بھولے ہوئے سبق بھی یاد آئیں۔

کتاب تمہاری - نام اور انعام ہمارا!

ایک روز کلاس میں ایک طالبہ کے پاس ایک کتاب دکھائی دی۔ کتاب کا نام تھا ''عالیہ۔'' مصنفہ کوئی بیگم صاحبہ تھیں جن کا نام اب یاد نہیں۔ میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس عزیزہ کے مطالعے کی دلچسپی کا میدان کیا ہے۔ کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالی تو دماغ چکرا گیا۔ اس کتاب کا جو جملہ بھی پڑھا پہلے سے پڑھا ہوا لگا۔ ذرا دیر بعد اچانک یاد آیا کہ یہ ساری کہانی تو خدیجہ مستور کے آنگن کی ہے۔ اب اس کتاب کے ناشر یا اس کی مصنفہ کے طور پر جو بیگم صاحبہ کتاب کے سرورق پر موجود تھیں ان کا سراغ ملے تو یہ بھید کھلے کہ فرضی نام سے کوئی کتاب چھاپنی ہی تھی تو خدیجہ مستور کے آنگن ہی پر نظر کیوں رکی۔ فراق صاحب نے بہت دن ہوئے ایک لطیفہ سنایا تھا کہ ایک بار ایک صاحب مشاعرے میں مطلع عرض ہے کہہ کر غزل سرا ہوئے تو سامعین میں سے کسی نے ٹوکا۔ بھائی یہ شعر تو داغ دہلوی کا ہے۔ اس پر ان صاحب نے گھبراہٹ میں یہ سچ اگل دیا کہ معاف کیجیے، مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے مشہور شاعر کی غزل ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ ہوا۔ وہ بھی سنا ہوا۔ مگر خدیجہ مستور کی کتاب ایک نئے نام سے ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ دوستوں سے اس جعلی کتاب کے ناشر کا اتا پتا پوچھا تو پتہ نہ لگا۔ شاید ناشر کا نام اور مطبع کا نام بھی فرضی تھا۔ مگر کم سے کم یہ تو طے ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے سے یہ کتاب لائبریری تک پہنچی تھی اور خریدی گئی تھی۔

اب ڈر یہ ہے کہ آگے کوئی مہم پسند محقق خدیجہ مستور کے بارے میں یہ ثابت کرنے نہ بیٹھ جائے کہ اصلاً اس مصنفہ کا نام فلاں بیگم تھا چنانچہ اپنی کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن انھوں نے اپنے حقیقی نام سے چھپوایا۔ جعلی ایڈیشن کے سن اشاعت میں کچھ ہیر پھیر ہو جائے تو کچھ عجب نہیں کہ کسی محقق کے نزدیک خدیجہ مستور غریب چور ٹھہریں اور تاریخ اردو ادب کے مرتبین کو آئندہ ایڈیشنوں میں ترمیم کرنی پڑے۔ غرض کہ ادب کی تاریخ کو سخت اندیشے لاحق ہیں۔

ابھی چند روز پہلے معلوم ہوا کہ لائبریری میں قرۃ العین حیدر کی کتاب کوہ دماوند آئی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی یہ کتاب بالاقساط اردو بلٹز میں چھپی تھی۔ ادھر قسطیں مکمل ہوئیں اُدھر پاکستان کے کسی جی دار ناشر نے کتاب چھاپ کر رکھ دی۔ قرۃ العین حیدر حیران ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت پر زرِ کثیر صرف کرنے والے ناشر نے مصنف سے کوئی معاملہ کرنا تو دور رہا اسے اس نیکی کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ ناشر کا کام کتاب چھاپنا تھا سو یہ کام ہوگیا اور اس خاموشی کے ساتھ کہ لکھنے والے کو اس کی خبر بھی اس وقت ہوئی جب کتاب کی ایک جلد اسمگل ہو کر ایک بڑے تعلیمی مرکز کی لائبریری میں پہنچ چکی تھی۔

ہر زبان کے اخبارات اسمگلنگ کے قصے بڑی تفصیل کے ساتھ مزہ لے لے کر چھاپتے ہیں مگر اردو کتابوں کی اسمگلنگ اور اردو مصنفوں کے نام اور کام پر دن دہاڑے ڈاکہ زنی کا جو سلسلہ ہندوستان اور پاکستان میں جاری ہے، اس پر اور تو اور اُردو اخبارات بھی چپ سادھے بیٹھے رہتے ہیں۔ یوں ہندوستان میں پاکستانی ادیبوں اور پاکستان میں ہندوستانی ادیبوں کی کتابیں آئے دن چھپتی رہتی ہیں۔ گاہے ماہے مصنف کی اجازت اور کسی معاہدے کے تحت ورنہ عام طور پر یہ سارا کاروبار نہایت پر اسرار طریقے سے چلایا جا رہا ہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے بعض ممتاز پاکستانی ادیبوں کی کتابیں شائع کی ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ کے ایجوکیشنل بک ہاؤس نے بہت سی کتابیں پاکستان میں بسنے والوں کی چھاپی ہیں۔ جہاں تک میری اطلاع ہے، یہ کام ان اداروں نے ان مصنفین کی اپنی رضامندی اور اجازت سے انجام دیا ہے۔ مگر کچھ دنوں پہلے پاکستان کے بعض ممتاز شاعروں کے مجموعے اور چند علمی کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن کھلے عام بازاروں میں بکتے نظر آتے ہیں۔ واللہ اعلم اس کی اجازت مصنفین یا ان کے متعلقین سے حاصل کی گئی تھی یا نہیں۔ روایت یہ ہے کہ اس طرح کی بیشتر خدمات بس ناشروں کے اپنے حوصلے، توفیق اور اردو نوازی کا نتیجہ ہیں۔

کرشن چندر کے ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' کے ساتھ تو یہ ہوا تھا کہ ابھی اس کی قسطیں ایک ہندوستانی ماہنامے میں مکمل بھی نہیں ہوئی تھیں کہ ایک پاکستانی ناشر نے اپنے شوق کی بے قراری کے سبب کسی دوسرے سے اس کی آخری قسطیں لکھا ڈالیں اور راتوں رات کتاب چھاپ ڈالی۔ گویا کہ جو قصہ کرشن چندر لکھ رہے تھے اس کا انجام کسی اور کے ہاتھوں بخیر ہوا۔

یہ صورت حال تشویشناک ہے کہ اس کی ساری سزا غریب مصنف کو بھگتنی پڑتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول "کارِ جہاں دراز ہے" (دو جلدیں) اور "آخرِ شب کے ہم سفر" بھی پاکستانی ناشروں کی وساطت سے وہاں کے اردو قارئین تک پہنچ چکے۔ ہندوستان میں ناصر کاظمی، شکیب جلالی، احمد فراز کے مجموعے ہاتھوں ہاتھ بکے۔ اب جس کا جو جی چاہے کرلے۔ ناشر کو نہ خدا کا ڈر نہ قانون کا۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ناشر کسی مغربی مصنف کی کتاب چھاپنے کے خیال سے بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ سنا ہے کہ ایک بار ایک ہندوستانی ناشر نے انگریزی کی ایک کتاب کا ترجمہ اس کتاب کے غیر ملکی مصنف یا ناشر کی اجازت کے بغیر چھاپ لیا تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بیسیوں ہزار کا تاوان ادا کرنا پڑا مگر عبداللہ حسین کے ناول "اداس نسلیں" کی دھوم ہندی والوں میں خوب مچی اور مصنف بیچارے کو اپنی کتاب کے ہندی ناشر کی زیارت بھی نصیب نہ ہوئی۔ ایک روز ایک ادیب دوست سے اس صورتِ حال کا ذکر چلا تو بولے اس میں خرابی کیا ہے؟ مصنف کو تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے باہر بھی اتنا مقبول ہے کہ اس کی کتاب چوری سے چھپتی ہے۔ گویا کہ ناشر کی فردِ جرم مصنف کا اسٹیٹس سمبل بن گئی۔ ان دنوں حسنِ اتفاق سے پاکستانی سفارت خانے میں اردو کے معروف ادیب اور دانشور منیر احمد شیخ موجود ہیں۔ ہندوستان میں پاکستان کے پریس قونصلر کی حیثیت سے۔ اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان میں ہندوستانی ادیبوں کے حقوق کی ادائیگی پر بھی کچھ توجہ کرسکیں تو شاید اس نوع کی سرگرمی میں کمی آجائے۔ ہندوستان کے جو ناشر بلا اجازت پاکستانی ادیبوں کی کتابیں چھاپتے رہتے ہیں اس کے خلاف بھی حکومتی سطح پر اقدام ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومتوں کے مسائل کی نوعیت بہت مختلف ہوتی ہے اور کاروبارِ سیاست کے حدود میں شاعر اور ادیب کا گزر مشکل سے ہوتا ہے تاوقتیکہ وہ کم سے کم فیض صاحب جیسے تعلقات اور مقبولیت نہ رکھتا ہو۔ لیکن یہ المیہ ہندوستان کی زبانوں میں صرف اردو کے ساتھ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی زبان ہے اور دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ دونوں ملکوں کی ادبی روایت کے کچھ اپنے امتیازات سہی پھر بھی دونوں کا سرمایہ ایک ہے۔ ہم پاکستانی ادیبوں کی کتابیں پڑھتے ہیں تو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ان کی ادبی روایت اور ہماری ادبی روایت کے درمیان کوئی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔ ادیب بٹ گئے مگر نہ ادب تقسیم ہوا نہ اس

کے قارئین کا مجموعی معاشرہ۔ انگلستان کے انگریزی ادب اور امریکی ادب کے امتیازات کو اس معاملے میں جو حضرات مثال بناتے ہیں وہ حماقت کی حد تک سادہ ذہن ہیں۔ اردو کی ادبی روایت پر اس تصور کے اطلاق کا لمحہ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں اب تک نہیں آیا اور دل اس دن کے خیال سے بھی کانپ اٹھتا ہے جس کے بطن سے اس لمحے کا ظہور ہو۔ ان دونوں ملکوں میں اتفاق کی سب سے مضبوط رسی غریب اردو زبان اور اس کی ادبی روایت ہے۔ یہ ہاتھ سے چھوٹ گئی تو کیا ہوگا؟ سوچیے اور اس لمحے میں اپنے حشر سے ڈریے۔

ہزار چوراسی کی ماں

ان دنوں اخبارات اور کمرشیل پرچوں میں پھولن دیوی کا بہت چرچا ہے۔ اس کی کہانیاں عام گفتگو کا موضوع بن گئی ہیں۔ مگر سب سے دلچسپ کہانی تو خود اس کی زندگی ہے۔ ایک سیدھی سادی دیہاتی لڑکی حالات کے ایک موڑ پر کس طرح اچانک ایک بھیانک کردار بن جاتی ہے اور امن پسند شہریوں کے ساتھ ساتھ پولس والوں کا بھی جینا حرام کر دیتی ہے۔ اس کی تفصیل جاننی ہو تو ذرا اس خاتون کی زندگی پر نظر کیجیے۔ پھولن دیوی کے سماج نے اس کے ساتھ جو ناانصافیاں کی تھیں اب وہ ایک ایک کر کے ان کا بدلہ چکا رہی ہے۔ تشدد کا راستہ کبھی کبھی امن و سکون کے راستے سے بھی نکل آتا ہے۔ یہ واقعہ عبرت ناک ہے۔

کچھ عرصہ پہلے خواجہ احمد عباس کی فلم نکسلائٹ دیکھنے پر بھی یہی تاثر قائم ہوا۔ نکسل باڑی سے ابھرنے والی تشدد کی یہ تحریک بھی ہماری موجودہ سماجی اور انسانی صورت حال کے لیے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔ ایک تشدد کس طرح دوسرے تشدد کے لیے زمین ہموار کرتا ہے اس کی وضاحت بڑے صریح انداز میں خواجہ احمد عباس کی یہ فلم بھی کرتی ہے۔ پھولن دیوی نے تو خیر تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے پہلے ذاتی الجھنوں اور رسوائیوں کی ایک لمبی مسافت طے کی تھی اور اب اس کی زندگی کے طور کا واحد جواز بس ایک جذبہ ہے، انتقام کا، سو وہ سماجی مجرم ٹھہری۔ مگر نکسل وادیوں نے جو راہ اپنائی اس کے سرے ایک باقاعدہ مربوط تصورِ حیات اور سماجی و معاشرتی قدروں کے ایک نظام سے جا ملتے ہیں۔ ان کا تشدد اپنے آپ میں ایک مقصد نہیں بلکہ وسیلہ ہے۔ بعض وسیع تر تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی مقاصد تک رسائی کا۔ پسماندہ طبقوں کا جذباتی اور اقتصادی استحصال، بے زمین کسانوں کی طرف زمینداروں کے رویے، سماجی، تہذیبی اور معاشی نابرابری۔ یہ سب بھی تشدد کی مختلف شکلیں ہیں۔ بظاہر پرامن اور ملکی و

معاشرتی قوانین کی گرفت سے محفوظ۔ مگر انہی شکلوں نے نکسل وادیوں کے تشدد کو ایک منطقی، جذباتی اور سیاسی بنیاد فراہم کی ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے خطرناک نکسل وادی کو سماجی مجرم کہنے سے پہلے بھی جرم کی اصطلاح پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ احمد عباس کی فلم فنی اعتبار سے کمزور تھی لیکن اس کی سب سے بڑی طاقت اس کے ہدایت کار اور کہانی کار کی ذہنی کشادگی اور خلوص ہے۔ اس کہانی کی تہہ میں انسانی روح کے جو مطالبات سرگرم ہیں ان سے ہم ایک پل کے لیے آنکھیں نہیں پھیر سکتے۔ میں نے یہ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ایک پرائیویٹ شو میں دیکھی تھی اور اذیت کا وہ احساس جو اس فلم کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا، ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس شو کا اہتمام خواجہ احمد عباس نے دلّی کے فلمز ڈویژن کارپوریشن کے آڈیٹوریم میں کیا تھا۔ ہال کے دروازے پر وہ خود مہمانوں کی پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ نحیف، لاغر اور بیمار سے۔ مگر زندگی کے اس دور میں جب خواجہ صاحب کی صحت اور اقتصادی حالت کسی نئی فلم کا بار اٹھانے کی متحمل بڑی مشکل سے ہوئی ہوگی نکسل وادیوں پر ان کا ایک غیر کمرشیل فلم بنانا بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ اس سے ان کے انسانی سروکار کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور اس زاویہ نظر کا بھی کہ تشدد کی ساری صورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ اس موقع پر خواجہ صاحب کو دیکھ کر خیال آیا کہ زندگی کی بعض سچائیوں کے تئیں ہمارا رویہ بھی سچا اور کھرا ہو تو فلم یا ادب کے حوالے سے وہ سچائی صرف ایک فنی مسئلہ نہیں رہ جاتی اور ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسے ایک بڑے اور پر پیچ پس منظر میں دیکھا اور پرکھا جائے۔ یہ بات سنسر بورڈ کے اراکین بہت دیر میں سمجھے اور اول اول فلم کی نمائش پر پابندی لگا دی۔ خواجہ صاحب نے بڑی تگ و دو کے بعد اس پابندی سے نجات پائی۔

معاشرے اور ملک کی عافیت اور حفاظت کے لیے پابندیاں برحق، مگر یہ پابندیاں اسی صورت میں موثر ثابت ہو سکتی ہیں جب ان کا اخلاقی اور ذہنی جواز عام معاشرے کے لیے قابل قبول ہو۔ نہیں تو اس طرح کی پابندی اندر ہی اندر اپنی بنیادوں کو کمزور کرتی جاتی ہے، خاص طور پر اس صورت میں جب اسے کسی مربوط اور منظم سیاسی یا معاشرتی یا تہذیبی رویے اور طرز فکر کا سامنا ہو۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ آرٹس و کرافٹس کے اساتذہ نے کچھ ہی دنوں پہلے "ہزار چوراسی کی ماں" کے عنوان سے اسی موضوع پر ایک ناٹک پیش کیا۔ یہ ناٹک دو بار کھیلا گیا۔ پہلی بار نئی

دلی کے فائن آرٹس تھیٹر میں اور دوسری بار جلسہ تقسیم اسناد کے روز جامعہ ملیہ اسلامیہ میں۔ ناٹک کے بدایت کار جامعہ ملیہ میں ڈراموں کے انچارج خورشید لطیف تھے اور کوئی تین چار درجن لڑکوں لڑکیوں اور ساتذہ نے اس کی تیاری اور پیشکش میں حصہ لیا تھا۔ یہ ناٹک بنگالی زبان کی مشہور مصنفہ مہاشویتا دیوی کے ایک ناول سے ماخوذ تھا۔ کہانی سے دلچسپی ہو تو کتاب پڑھ لیجیے۔ مجھے تو جو بات اچھی لگی یہ تھی کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے بڑی لگن اور محنت کے ساتھ تیاری کی تھی اور منجھے ہوئے اداکاروں کی طرح یہ پورا کھیل اس طرح دکھایا گویا سچ مچ وہ اس کہانی کے کردار ہیں۔ ایک کہانی جو ہماری معاشرتی صورتِ حال سے وابستہ ہے اور عام زندگی کے اسٹیج پر جس کا تماشہ ایک عرصے سے جاری ہے. اونچے، متوسط طبقے کے نوجوانوں میں بھی اس زندگی کی طرف سے نا آسودگی. بیزاری اور اشتعال کا جو میلان سامنے آیا ہے اس نے نکسل وادیوں کے مسئلے کو اس کہانی کے مطابق محض ایک طبقاتی کشمکش نہیں رہنے دیا ہے۔ یہ کشمکش اب ایک منظم سیاسی تحریک بن گئی ہے اور اس کے آشوب سے بچنا ہے تو اس صورتِ حال کو بدلنا ہوگا جس نے اس تحریک کو ایک ذہنی، جذباتی اور نظریاتی اساس بہم پہنچائی ہے۔ اس ناٹک میں بھی سب سے پرکشش اور زندہ کردار ایک نکسلائٹ لڑکی نندنی کے روپ میں گیتا سچدیو اور پولس انسپکٹر کے روپ میں امیش کمار دہل تھے۔ دونوں تشدد کی الگ الگ متضاد صورتوں کے ترجمان ہیں اور یہ فیصلہ مشکل نہیں کہ کس کا تشدد زیادہ بامعنی اور مخلصانہ ہے۔ ناٹک کے ڈراپ سین ایک پارٹی کے منظر میں ایک نکسلائٹ نوجوان (ورتی. غفران قدوائی) کی ماں سجاتا (راکاویشین) کی خود کلامی. ذہنی، معاشرتی اور جذباتی تشدد کے نتیجے میں جنم لینے والے دوسرے تشدد کو پسپا کرنے کے لیے ایک تیسرے تشدد کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہوش وحواس زندہ ہوں تو امن کو تشدد تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی۔ ظاہر ہے کہ اس تشدد کا علاج وہ تشدد نہیں ہو سکتا جو سرکاری مشینری اختیار کرتی ہے۔ اگر ہم اسے علاج کہہ سکیں تو بھی یہ محض وقتی ہوگا۔

ان دنوں ساری دنیا میں تشدد کی ایک لہر آئی ہوئی ہے۔ ہر ملک کے نوجوان بغاوت اور توڑ پھوڑ پر آمادہ ہیں۔ آئے دن یونیورسٹیوں میں ہنگامے اٹھتے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ ڈرامہ دیکھ کر ایک ہی بات سوجھی کہ نوجوانوں کا غم وغصہ جب تک ایک سنجیدہ، مخلصانہ سماجی اور معاشرتی

مقصد سے ہمکنار نہیں ہوتا اس کے معنی بھی متعین نہیں ہوتے۔ فرانس کے نوجوانوں کو تو ایک جواں سال بوڑھا قائد سارتر کے روپ میں مل گیا تھا جس نے جذباتی اشتعال اور ذہنی بیزاری کے مظاہر پر قانون، سیاست اور انتظامیہ کے بجائے فعال ذہن دانشور کی صورت نگاہ کی اور اس کے اسباب و علل کا تجزیہ ایک بڑے انسانی تناظر میں کرنے پر زور دیا۔ قیامت ہے کہ ہمارے دانشور اس زندگی کو منھ نہیں لگاتے جو آٹھوں پہر انھیں گھورتی رہتی ہے اور سیاسی قائدین جو دانشوری کا سوانگ بھرتے ہیں ان میں اکثریت مسخروں کی ہے۔ ابھی ہماری دنیا کو ایک اور سارتر کی ضرورت ہے۔ بصورتِ دیگر یہ تماشہ آسانی سے ختم ہونے کا نہیں۔

احمد مشتاق۔ گردِ مہتاب کا ہمسفر

کہانی کی طرح چاند کا رشتہ بھی رات سے ہے۔ دونوں کا حساب نامہ الگ ہے۔ میرے لیے تو احمد مشتاق کی نئی کتاب گردِ مہتاب کئی راتوں کا انعام بن گئی۔ ایسی کتابیں کم ہوتی ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو سانس لیتے ہوئے محسوس کر سکیں اور ان کے واسطے سے ایسے تجربوں تک پہنچیں جنہیں اپنا کہا جا سکے۔ ہمارے مرزا غالب نے شاعری کو معنی آفرینی کا نام دیا تو اچھا برا ہر شاعر ہاتھ دھو کر معنی کے پیچھے لگ گیا۔ کیسی کیسی دور کی کوڑیاں لائی گئیں اور کیا کیا فلسفے باندھے گئے۔ غالب تو خیر غالب تھے کہ اس آشوب سے سلامت گزر گئے مگر بہتوں کا حال خراب ہوا۔ فلسفہ تو بھلا کیا ہاتھ آتا، شاعری بھی گئی!

بہت سال گزرے جب احمد مشتاق کی رفاقت میں شب و روز کے ایک طویل سلسلے سے گزر رہا تھا۔ اس وقت یہ شعر ؎

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں
یہ لوگ ٹوٹی ہوئی کشتیوں میں سوتے ہیں
مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

محض شعر نہیں بلکہ ایک تجربے کی صورت حواس پر وارد ہوئے تھے اور خیال آیا تھا کہ ہم سفر سچا ہو تو تنہائی کے سفر کی حرمت بظاہر تنہا نہ رہتے ہوئے بھی باقی رہتی ہے۔

کسی لمحے یا تجربے یا کتاب سے تعلق اگر صرف ذہنی ہو تو اس کی پائیداری ہمیشہ مشکوک اور ایک مستقل خطرے کی زد پر ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ اس کے بعد کوئی کتاب اس سے زیادہ گہرا ذہنی تعلق قائم کر بیٹھے۔ مگر احمد مشتاق کی گردِ مہتاب کے ساتھ اپنا معاملہ بہت مختلف رہا۔ دو،

تین ،چار راتیں اسی دیار میں گزریں اور ان راتوں کا سلسلہ دن کی دھوپ سے بھی جا ملا۔ کچھ ایسا احساس ہوا کہ یہ شاعری صرف دماغ کی پرتوں کو نہیں چھوتی ،حواس اور اعصاب اور احساس اور جذبے کی پوری کائنات میں حل ہو جاتی ہے۔ ہم اس کے حوالے سے خالص ذہنی مسائل یا دنیا کے آلام اور آزمائشوں تک نہیں پہنچتے بلکہ اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ اس طرح کہ خود احمد مشتاق بھی ہر پل کی کیفیت اور تجربے کے ساتھ سامنے موجود ہوتا ہے۔ شعر کے شہر میں ایسے چہرے خال خال ہی نظر آتے ہیں جو علمی اور نظریاتی مباحث کے ریل میں اس ڈھیٹ پنے کے ساتھ قدم جمائے کھڑے رہیں کہ انھیں عبور کرنا محال ہو جائے۔ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ تخلیقی تجربہ کسی سماجی ،سیاسی ،تہذیبی ،عمرانیاتی اور فلسفیانہ مسئلے کا محرک بنا اور ہمیں اس مسئلے کی ڈور تھما کر آپ روپوش ہو گیا۔ پھر جب تجربہ ہی نہ رہا تو تجربہ کرنے والے کا کیا ذکر!

اس المیے نے ہمارے زمانے کی شاعری کو بھی بہت خوار کیا ہے۔ شعر کی کوئی کتاب اٹھایئے ،صنعتی تمدن کے مسائل کی ایک لمبی فہرست سامنے آجاتی ہے۔ احمد مشتاق کا کمال یہ ہے کہ وہ ہماری آج کی دنیا کا باسی دکھائی دیتا ہے ،تس پر بھی ہمیں اپنی ذات سے الگ کسی سماجی اور ثقافتی اور ذہنی مسئلے کے خم و پیچ میں الجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ شاعری ہمارے بنیادی سروکار اور تجربے کی صورت ظہور کرتی ہے اور اسی سطح پر ہمارا مسئلہ بنتی ہے۔ ہمارا سوال بھی اور جواب بھی۔ ہمیں اس احتیاج کا راستہ نہیں دکھاتی کہ بس علوم و افکار کے ماہرین سے رجوع کرتے پھریں۔ ہمارے علم فروش معاشرے میں دماغ کو اپنا راتب بہت آسانی سے مل جاتا ہے۔

گردِ مہتاب کی شاعری میں وہ سادگی ،برجستگی اور بہاؤ ہے جس کا تجربہ ہم کھلی ہوئی فضاؤں میں اور سانس کے ساتھ سینے میں گھلتی اور بستی ہوئی ہواؤں میں کرتے ہیں۔ یہ تجربہ بارش کی پہلی بوند کے ساتھ مٹی سے اٹھتی ہوئی مہک کی مثال ہے ،ہر طرح کے کھوٹ اور تصنع سے پاک۔ صنایع لفظی سے ماخوذ ایک اصطلاح کے استعمال کو آپ بدمذاقی یا بقراطیت نہ سمجھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ سہل ممتنع کی جس قدر مثالیں گردِ مہتاب میں بھری ہوئی ہیں ،شاید ہمارے کسی اور ہم عصر غزل گو کے یہاں بڑی مشکل سے نکلیں گی

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا
لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا

اب شام تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

ہم ان کو سوچ میں گم دیکھ کر واپس پلٹ آئے
وہ اپنے دھیان میں بیٹھے ہوئے اچھے لگے ہم کو

دل فسردہ تو ہوا دیکھ کے اس کو لیکن
عمر بھر کون جواں کون حسیں رہتا ہے
اک زمانہ تھا کہ سب ایک جگہ رہتے تھے
اور اب کوئی کہیں کوئی کہیں رہتا ہے

ان کہی بات نے اک حشر اٹھا رکھا تھا
شور اتنا تھا کوئی بات نہ ہونے پائی

گرمیاں، سردیاں، بہار، خزاں
سب مزے اس جہان کے دیکھے
گیروا، سبز، چمپئی، دھانی
رنگ سب آسمان کے دیکھے

اجنبی لوگ ہیں اور ایک سے گھر ہیں سارے
کس سے پوچھیں کہ یہاں کون سا گھر اس کا ہے

ترے آنے کا دن ہے تیرے رستے میں بچھانے کو
چمکتی دھوپ میں سائے اکٹھے کر رہا ہوں میں

پھول سے خوشبو بچھڑ جائے گی سورج سے کرن
سال سے دن وقت سے لمحے جدا ہو جائیں گے

یہ کیسی جانی پہچانی، دل اور آنکھوں میں بسی ہوئی دنیا ہے؛ ہمارے روزمرہ احساسات اور معمولات کا حصہ؛ جیتی جاگتی، متحرک، رنگوں اور روشنیوں سے آباد۔ پھر بھی یہ دنیا اسرار کی دھند میں لپٹی نظر آتی ہے کہ ہم اپنے حواس کی آنکھوں سے اسے دیکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ شاید مانوس منظروں کا بھید اسی صورت میں کھلتا ہے۔ یہ بیان کی شاعری نہیں بلکہ ایک طرح کا شعری بیان ہے جس میں پروئے ہوئے لفظ، لمحے، منظر، اشیاء اور مظاہر سب کے سب ہم سے کلام کرتے ہیں۔ ہر شعر ایک کہانی ہے جو ایک بصری تخیل کے اڑن کھٹولے پر کچھ جاگتی کچھ سوتی ہم تک آتی ہے پھر ہماری آنکھوں کو اجنبی اور انوکھی دنیاؤں میں اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ مانوس کو نامانوس اور معمولی کو غیر معمولی بنانے کا یہ طور اس جادوئی کلمے کا عطیہ ہے جو نادیدہ منظروں کا دروازہ آنکھوں سے کھولتا ہے اور ہمیں انجانے دیاروں کے سفر کی دعوت دیتا ہے۔ گردِ مہتاب کے سفر کا دیار بھی آخر رات ہی تو ہے، ہزار رازوں کا مخزن۔ پھر اس کے ہم سفر کا قصہ اس سے الگ اور کیا ہوتا؟

دیکھیے کب ملے کہاں کوئی؟

"غالب احمد کو روزِ ازل سے انتظار ہے۔ اسے انتظار ہے اس لمحے کا جب زندگی اور موت، مشرق اور مغرب، خاک اور خون، خرد اور جنوں، ہجر اور وصال، روشنی اور اندھیرا، خیر اور شر، زمان اور مکان اس کے وجود میں یک جان ہو جائیں۔"

"اسے انتظار ہے اس لمحے کا جب اس کی یہ واردات اس کے ہمراز کی واردات بھی بن جائے کیونکہ وہ خوشۂ گندم سمیت اور اپنی روح کی فرحت سمیت ہی ہمراز کو پانا چاہتا ہے۔"

"غالب احمد کے انتظار نے اسے خاکی اور نوری دونوں جہانوں کا مسافر بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس کی نینوں کی ناؤ اکثر و بیشتر دونوں جہانوں کے سنگم پر صبح کے ستارے کی طرح جھلملاتی رہتی ہے۔"

"راحت گمنام" انتظار کا اٹوٹ راگ ہے۔" یہ جملے حنیف رامے کی اس کتاب سے ماخوذ ہیں جو غالب احمد کی کتاب راحت گمنام کے فلیپ پر درج ہے۔ مجھے اس رائے کو دیکھ کر دو وجوہ سے خوشی ہوئی۔ ایک تو اس لیے کہ حنیف رامے (سابق وزیر اعلیٰ مشرقی پنجاب) پھر اپنی دنیا میں لوٹ آئے ہیں، ہر چند کہ سیاست کے کاروبار نے ان میں جو ایک رویہ خطابت سے دلچسپی کا پیدا کیا تھا، اس کا عکس ان الفاظ میں بھی نمایاں ہے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کے زرخیز دور میں کبھی ریڈیو پر ان کی تقریر سنائی دی تو خیال ہوتا تھا کہ پہلے ہی جملے سے وہ انتہائی کی جگہ انترے تک پہنچ جاتے تھے۔ میں "سویرا" میں ان کے اداریوں اور مذاکروں کو یاد کرتا تھا اور متاسف ہوتا تھا کہ سیاست آدمی سے کیا کچھ چھین لیتی ہے۔ بہر حال اب جو حیرانی ہوئی وہ اس واقعہ پر ہوئی کہ احساس کی دھار اگر کند نہ ہوئی ہو تو بہت سے پردے آخر کو چاک ہو جاتے ہیں اور آدمی اپنی اصل تک پھر سے واپس آجاتا ہے۔

واپسی کا یہ واسطہ راحت گمنام کی تلاش اور اس کا انتظار بھی غالب احمد کے شعری منظر نامے

پر کچھ ایسے رنگ اور نقش ابھارتا ہے جو آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں۔ ادھر وہ کشور ناہید، مستنصر حسین تارڑ اور ذوالفقار احمد تابش کے ساتھ ادب لطیف نکال رہے ہیں اور اس ماحول میں جو بہت بجھا بجھا، گھٹا گھٹا سا ہے، ان لفظوں کی اشاعت میں مصروف ہیں جو باہر کی کھلی فضا سے ایک مستحکم ذہنی اور جذباتی رابطہ قائم کرتے ہیں۔ آنکھیں روشن ہوں تو برہنہ دھوپ میں بھی کچھ سائے ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ یہ تلاش اس صورت میں کامیاب ہوتی ہے جب آپ اپنا سایہ ساتھ ہو اور دشمن آنکھوں کے قہر کا شکار نہ ہونے پائے۔

پھر غالب احمد کی تلاش کا زاویہ تو بہت ایجابی ہے۔ پس ان کا انتظار بھی امید آفریں ہے۔ انھیں انتظار ایسی حقیقتوں کا نہیں جو وقت کی گرد میں کھوئی گئیں بلکہ گرد و پیش کی دنیا میں پھیلے ہوئے بہت سے سائبانوں کو ایک بار پھر سے پہچاننے کا ہے، ایک ٹوٹے ہوئے تعلق کی تجدید کا جو اس گرے پڑے زمانے میں بھی حد امکان سے باہر کی بات نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی روح کے مطالبات کو سننے اور سمجھنے کی استعداد اپنے اندر پھر سے پیدا کر لے۔

اس کے لیے عمل کی کون سی شرط لازم آتی ہے؟ غالب احمد نے اس معاملے میں کوئی ایسی حد مقرر نہیں کی ہے جس تک پہنچنا آج کے آدمی کے لیے ممکن نہ ہو۔ گلہ شکوہ، اپنی ذات سے، غیروں سے، زندگی اور زمانے سے، تقدیر اور تہذیب حاضر سے تو سب ہی کرتے رہتے ہیں۔ مگر آدمی کی ذات صرف شکایتوں کا دفتر تو نہیں۔ نہ دنیا اپنے حال کو پہنچ کر اب ایسی ہو چکی ہے کہ اس سے ساری امیدیں ختم کر لی جائیں۔ ابھی بھی یہاں آدمی بستے ہیں جو تجرید نہیں۔ پھر رنگ بدلتے موسم ہیں، آتے جاتے اور آنکھوں میں ٹھہرتے ہوئے منظر ہیں، چہرے ہیں جو دل میں سما جاتے ہیں اور خواب ہیں جنھیں دیکھنے کی طلب ہو تو کوئی دیوار آڑے نہیں آتی۔ رہا وقت کا عمل تو اس کا ماتم خود وقت کا اپنا مسئلہ بھی ہے۔ اس کی اپنی تباہ کاری کے عمل کا ہی ایک حصہ۔ زندگی صرف غم و غصے صرف اشک و آہ میں گزاری جائے تو آپ بھی خوار ہوتی ہے، دوسروں کو بھی بیزار کرتی ہے۔ پھر رونے کے آداب میں آنسوؤں کو روکنے اور پی جانے کا گر بھی شامل ہے۔ یوں بھی اونچی آواز سے رونے والا شاعر ہو یا عاشق، اس کا سارا درد تو صدابندی کی نذر ہو جاتا ہے ؎

شہر سے دور، دن کا پھول کھلا
دشت میں بھی ہے گلستاں کوئی

چھوڑ دکھ سکھ کی منزلوں کا طواف
دل میاں! ڈھونڈ آستاں کوئی

دشت طلب ہے ختم یہاں ناقۂ نگاہ
یہ وہ زمیں ہے جس میں تمہارا گزر نہیں

یا نظموں کے یہ ٹکڑے
درختوں سے پتے تو ہر سال گرتے ہیں
مٹی میں ملنے کی خواہش لیے
مگر ان کو گن گن کے رکھتا ہے کون

(خوشبو کی خوشیاں)

کب تک ہم بیزار رہیں گے
اپنوں اور پرایوں سے
آخر وہ بھی ہیں ہم سے

(نظم)

دیکھیے کیا اثباتیت ہے۔ گرچہ اس اثباتیت سے۔ بہت مختلف جس نے سادہ لوحوں کے عالم خواب کی مثال چوتھے اور پانچویں دہے کی شاعری میں بہت دُند مچائی۔ خواب بھی وہی معتبر ٹھہرتے ہیں جو زمانے کی آنکھوں میں کبھی بس چکے ہوں، ایک حقیقت بن کر اور جن کے سرے امید اور نامرادی کی کڑیوں سے ایک ساتھ ملے ہوں۔ ایسا نہ ہو تو پھر نظارے کا لطف کیا! راحت گمنام کا ایک شعر ہے:

صدیوں سے انتظار ہے اس ایک شخص کا
"آئے ہو کتنی دیر سے" اتنا کہوں جسے

یہ خواب، یہ انتظار ہم سب کا ہے کہ ہم سے آگے بھی لوگ اس تجربے سے گزرے، کل بھی گزریں گے۔

ہوئے تم دوست جس کے۔۔۔

بہت دن ہوئے گا ہے ماہے اخباروں میں اس طرح کی خبریں نظر پڑتی تھیں کہ فلاں یا فلاں ادیب کی اقتصادی بدحالی یا بیماری سے متاثر ہو کر مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ شری عبدالرحمن انتولے نے امداد کے نام پر ایک خطیر رقم مرحمت فرمائی ہے۔ ہم انتولے صاحب کے حق میں دعائے خیر کرتے تھے کہ اہل سیاست میں کوئی تو ہے جسے ادیبوں کا خیال ہے. جس کا دل درد کی دولت سے مالا مال ہے۔ سیاست آمادۂ زوال ہے تو کیا ہوا کم از کم ایک سیاست داں تو ایسا ہے. جو طبعاً خوش خصال ہے۔ مائل بہ کمال ہے۔ بیمار ادیبوں کا پرسانِ حال ہے۔

ادھر معاصر ہفتہ وار ہماری زبان میں ظ۔ انصاری کے ایک خط سے پتہ چلا کہ انتولے صاحب کی فیاضی اور سخاوت کا دروازہ بیماروں کے ساتھ ساتھ اب صحت مند ادیبوں پر بھی کھل گیا ہے۔ ان کی خصوصی توجہ کے نتیجے میں سلمیٰ صدیقی صاحبہ (واضح رہے کہ اردو کی ایک افسانہ نگار ہیں) ایک نیم سرکاری کارپوریشن کی چیئرمین مقرر کر دی گئی ہیں۔ ماہانہ مشاہرہ کوئی کہتا ہے تین ہزار، کوئی کہتا ہے چار ہزار، خدا جانے۔ البتہ ظ۔ انصاری کے اسی مراسلے سے پتہ چلا کہ انتولے صاحب کی عنایاتِ پیہم کا سلسلہ اسی نقطے پر ختم نہیں ہوا۔ سلمیٰ صدیقی صاحبہ کے نام ایک مکان بھی الاٹ کر دیا گیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اردو زبان کی ایک ادیبہ کے تئیں اس حد کو پہنچی ہوئی دریا دلی ناقابل یقین ہے مگر آپ کو یقین آئے کہ نہ آئے۔ یہ بھی سن لیجیے کہ بمبئی یونیورسٹی میں اردو پروفیسر کی اسامی کے لیے اردو زبان و ادب کے علماء پر مشتمل جو سلیکشن کمیٹی ترتیب دی گئی ہے اس میں بیرونی ایکسپرٹ کے طور پر بھی سلمیٰ صدیقی صاحبہ کا ہی نام نامی سامنے آیا۔ ہمیں اس خبر وحشت اثر پر بھی کوئی حیرانی نہ ہوئی کہ حکایت سیاست کے باب میں یہ معروف مصرعہ آپ نے بھی سنا ہوگا— ''نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم''۔ کل کلاں کو اگر یہ سنا جائے کہ محترمہ کی بے مثال

ادبی و علمی خدمات کے صلے میں انھیں ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز بخش دیا گیا ہے تو آپ کیا کرلیں گے؟ انتولے صاحب کا دم سلامت رہے۔

اس موقع پر ایک ممتاز ادیب کا یہ قول یاد آیا کہ بڑے سے بڑا آدرش بھی پست اور ذلیل ہو جاتا ہے جب سیاست اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ ہندی کے ایک شاعر نے تین مصرعوں کی ایک نظم کہی:

جات پر، نہ پات پر
اندراجی کی بات پر
مہر لگے گی ہاتھ پر

اور ایک ریاستی حکومت کے بہت بڑے ادبی انعام کا مستحق ٹھہرا۔ ذرا دھیان دیجیے کہ شاعرانہ تخیل انسانی تجربے کی کیسی کیسی ان دیکھی دنیاؤں تک جا پہنچتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ادب کا کاروبار خرابی کی کس حد تک جا پہنچا ہے اور دنیاوی کامرانیوں کے کیا کیا نسخے دریافت کیے گئے ہیں، اربابِ اقتدار کی آستاں بوسی، زعمائے سیاست کی خوشنودی یا روپے پیسے سے آسودہ حال ادیبوں کی خوشامد۔ بڑے سے بڑے ادیب کو بھی رائلٹی کے نام پر کیا ملتا ہے؟ دس فیصدی، پندرہ فیصدی۔ مگر اصحابِ سیاست اور دولت کی دریوزہ گری پل دو پل میں لاکھوں کے وارے نیارے کر دیتی ہے۔

عبرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ اسی شہر بمبئی میں قرۃ العین حیدر بھی ہیں۔ اس وقت ہماری زبان اگر اپنے کسی ایک ادیب کا نام عالمی مرتبے کے ادیبوں کے ساتھ لینے کا حوصلہ کر سکتی ہے تو وہ قرۃ العین حیدر کا نام ہے جس نے سیاست، ثروت، اقتدار، مصلحت اور منافقت کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنی خلوت نشینی میں مگن ہے۔

اصل میں مسئلہ بہت صاف ہے۔ انتولے صاحب یا اس قبیل کے اشخاص سے آپ ادب کے سوال پر تو کوئی گفتگو کر نہیں سکتے۔ البتہ ادیبوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ ان کا بنیادی سروکار کیا ہے؟ پیسہ کمانا بلاشبہ ایک فن ہے اور وہ لوگ جو اسمگلنگ یا سٹے کا کاروبار کرتے ہیں، معمولی درجے کے فنکار نہیں ہوتے۔ زندگی کی ضرورتیں بھی اپنی جگہ پر۔ مگر ادب کا نام لینے والے جو ضمیر کی آزادی اور ادب کی حرمت کا راگ الاپتے ہیں اگر وہ بھی سیاسی لیڈروں یا دولتیوں کے

ڈھنڈورچی بن جائیں تو قصہ ختم ہے۔ ایمرجنسی کے دنوں میں قصیدہ گوئی کے فن نے ایک نئی جہت اختیار کی تھی۔ برسرِ اقتدار حکومت کی مداحی کیجیے اور مزدوری لیجیے۔ مقامِ شکر ہے کہ یہ کاغذی قلعہ بہت جلد مسمار ہو گیا لیکن وہ بیماری جو اجتماعی سطح پر روک دی گئی تھی، انفرادی سطح پر اب سے آگے بھی زندہ تھی۔ آج بھی زندہ ہے۔ ہماری آنکھیں اگر بند نہیں ہیں اور ضمیر خوابِ خرگوش کے مزے لینے میں مصروف نہیں ہے تو ہم بآسانی ایسے تمام چہروں کو پہچان سکتے ہیں جن کے دم سے دربار اور اقتدار کی پرستش کا یہ چلن ابھی قائم ہے۔

حال ہی میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں فوجی حکومت نے تعلیمی اداروں میں مشاعروں اور شعری نشستوں پر پابندی عاید کر دی ہے۔ فیض صاحب بیروت سے ہوائی سفر کے ذریعہ شاداں و فرحاں کراچی پہنچے تو ان سے بھی کہہ دیا گیا کہ میاں اب چین سے گھر بیٹھو اور اگر مزید سیر کی طلب ہے تو اپنے عالمِ تخیل میں دھومیں مچاتے پھرو۔ مگر دوسرے ہی روز فوجی حکومت نے ان پر سے یہ پابندی ہٹالی اور فیض صاحب نہایت آرام سے جاپان کے ہوائی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس طرح جنرل ضیاء الحق کی حکومت غالباً یہ جتانا چاہتی تھی کہ اب دوبارہ وطن لوٹنے کی ہمت نہ کرنا۔ تم چین، جاپان، جہاں جی سمائے گھومتے رہو۔ بس گھر میں قدم نہ رکھنا۔ اسی میں دونوں کی عافیت ہے۔

اس واقعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بے ادب زمانے میں بھی ادب کا ڈر سیاستدانوں کے دلوں پر ابھی باقی ہے۔ مگر کون سا ادب؟ جو احساس اور جذبے اور فکر اور یقین کی آزادی کا ترجمان ہوتا ہے، جو ہر قیمت پر اپنی حرمت کی حفاظت کرتا ہے، جو مناصب اور مال و متاع کی ہوس کا غلام نہیں ہوتا۔ جس کی اپنی دنیا اور اپنی مملکت ہوتی ہے۔

اس دنیا میں کون سے ادیب بستے ہیں؟ یہ بات ہم آپ سبھی جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس دنیا کے کسی باشندے کا نام عبدالرحمن انتولے نہیں ہے!

اردو والوں کو کچھ تو آپس کی سیاست نے خوار کر رکھا ہے کہ اردو زبان و ادب کے کم و بیش تمام مراکز، وہ تعلیمی ادارے ہوں یا سرکاری اور نیم سرکاری ادارے، باہمی رسہ کشی، سازش اور گٹھ جوڑ کے شکار ہیں۔ کسی ادارے سے امید بندھنے کی کوئی صورت پیدا بھی ہوتی ہے تو خود اردو والوں کی غفلت یا سیاست کے نتیجے میں دیکھتے دیکھتے معدوم ہو جاتی ہے۔ شمس الرحمن فاروقی ترقی

اردو بورڈ کے سربراہ بنے تھے. آخر کو تھک ہار کر اپنے محکمے میں جا بیٹھے کہ اردو کے ایم اے نہیں تھے۔ یونیورسٹیوں کا حال سب جانتے ہیں۔ اب ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اردو والوں کی آپسی سیاست سے آگے ملکی قومی سیاست کی نااہلی کا در بھی اردو والوں پر کھلا ہوا ہے۔ یہاں جانبداریوں. ذاتی وفاداریوں. منافقتوں. مصلحتوں اور خوشامدوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اندر بہت سے جغادری بیٹھے ہوئے ہیں اور انہی کے بیچ انتولے صاحب کا چہرہ بھی روشن ہے۔

بانیؔ کی یاد میں

بانیؔ کے انتقال کی خبر غیر متوقع نہ تھی۔

برسوں سے وہ موت کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اس کا جسم یہ لڑائی ہار گیا، پھر بھی آخری جیت بانی ہی کی ہوئی۔ اذیت اور درد کے اس دور میں بھی جب بانی کے لیے خود اپنے جسم کا بوجھ ناقابل برداشت ہوگیا تھا، اس نے تخلیقی سطح پر خود کو زندہ، توانا اور شاداب رکھا۔ اپنا شعر کہتا رہا۔

دس برس پہلے کی ایک سہ پہر یاد آتی ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا تو بانی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی پہلی کتاب 'حرفِ معتبر' تھی۔ کمرے میں آیا اور مونڈھے پر بیٹھ کر کچھ دیر ہانپتا رہا۔ میں نے سوچا، سیڑھیاں چڑھنی پڑی ہیں اور دور دلّی سے چل کر آیا ہے، سفر نے بے حال کر دیا ہوگا۔ مہینے دو مہینے میں میرا علی گڑھ سے دلّی آنا ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار کناٹ پلیس کے مرحوم ٹی ہاؤس یا اس کے آس پاس بانی سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں موٹے بید کی ایک چھڑی بھی دکھائی دیتی تھی۔

پانچ چھ برس پہلے دلّی میں بسیرا ہوا تو بانی سے ملاقاتیں کچھ تفصیلی بھی ہونے لگیں۔ اس کی دوسری کتاب 'حساب رنگ' چھپی تو اس کی خواہش پر کتاب کی رسم اجرا کے جلسے مین ایک مختصر سا مضمون بھی باندھا۔ بانی کو میری باتیں ناپسند تو نہیں ہوئیں مگر وہ ان سے کچھ زیادہ مطمئن بھی نہیں ہوا۔ بانی دوستوں کی تعریف اور باہمی تعلقات کے معاملے میں والہانہ گرم جوشی کا قائل تھا۔ اس تعلق کا اظہار بھی وہ ہمیشہ بہت جذباتی انداز میں کرتا تھا۔

کچھ دنوں بعد ایسا ہوا کہ بانی سے ملاقاتیں بہت لمبے وقفوں سے ہونے لگیں۔ ادبی جلسوں اور تقریبوں میں شرکت کا شوق مجھے نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی جب کبھی کہیں گیا، بانی سے ملنا ہو جاتا تھا۔ وہ بڑے پر جوش انداز میں بغلگیر ہوتا، قہقہے لگاتا، باتیں کرتا۔ اب یہ حال کہ دو

چار بار کسی جلسے میں جانا بھی ہوا تو بانی دکھائی نہ دیا۔ پتہ چلا کہ بانی بیمار رہنے لگا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ بستر سے لگ گیا ہے۔ پھر وہ باہر آنے جانے لگا۔ دو قدم چلتا تو ہانپ جاتا۔ دم لیتا۔ پھر چھڑی پر اپنے بھاری جسم کا بوجھ سنبھالتا۔ چند قدم آگے بڑھتا اور پھر دم لیتا۔ سو پچاس گز سے زیادہ چلنا اس کے لیے دوبھر تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دل دکھتا تھا۔ مگر بانی جو دوستوں کے دکھ سکھ کے معاملے میں بہت جذباتی تھا، اپنے تئیں اپنے جذبات حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتا۔ اس نے اپنی بیماری کو عام طور پر موضوع بنانے سے گریز کیا اور بستر علالت پر بھی اسی پر جوش انداز میں شعر کہتا رہا۔

بانی کی لمبی بیماری اس کی روحانی صحت مندی اور تخلیقی شادابی پر ایک لمحے کے لیے بھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ وہ اپنی خود آگاہ شخصیت کے اس رمز سے اچھی طرح باخبر تھا اور یہ جانتا تھا کہ موت اور زندگی کی کشمکش میں گزرنے والے ہر دن کے ساتھ پسپا ہوتی ہوئی زندگی اپنے تحفظ اور بقا کا راستہ پا چکی ہے۔ اس راستے پر اس کے نام اور کلام کا سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔

بانی یاروں کا یار تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دوستوں کی رفاقت میں گزارا۔ بیماری کے آخری اور فیصلہ کن دور میں جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکا تھا، اس کے احباب ان شاموں اور راتوں کو یاد کرتے تھے جن میں یار باشی اور دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی نے جینے کے ایک قرینے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ محمود ہاشمی نے بتایا کہ انتقال سے چند روز قبل وہ بانی کی عیادت کے لیے گئے تو بانی کی بیوی نے اس کے جیتے رہنے کی تمنا کا اظہار بھی اسی طور پر کیا کہ وہ اچھا ہو کر اپنے دن رات گھر سے باہر ایک بار پھر دوستوں میں گزارتا رہے۔

دِلّی کی شامیں اور وہ چائے خانے اور وہ شاہراہیں جو بانی کے قدموں سے آباد تھیں آج بھی اس کی راہ دیکھتی ہیں۔ فاصلوں کے اس شہر میں وہ ہر اس مقام پر دکھائی دیتا تھا جہاں اس کے یار دوست جمع ہوں۔ اور اب کہ وہ عناصر کی حدوں سے آگے جا چکا ہے، اب بھی دوستوں کے بیچ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

اردو غزل کے ایوان میں بانی کی آواز دیر سے گونجی، مگر جب گونجی تو اس طرح کہ اس کے معاصرین میں بہتوں کی آوازیں اس کی آواز میں گم ہو گئیں۔ بانی نے جتنی کم مدت میں غزل کے ایک منفرد مخصوص اور معروف آہنگ کی حیثیت اختیار کر لی اسے دیکھ کر احساس ہوتا

ہے کہ بے چہرہ صداؤں کے ہجوم میں بے چہرگی کے المیے کی زد پر بھی اس کا شعری کردار اپنے چہرے سے کبھی محروم نہیں ہوا۔ ادب کا ہر قاری اس چہرے کو پہچانتا تھا اور خود بانی بھی اس پہچان کے نقش ونشان کی آگہی رکھتا تھا۔ جبھی تو موت کی مملکت میں قدم رکھتے ہوئے بھی اس نے نہ تو موت سے ہار مانی نہ زندگی سے بیزار ہوا۔ حرفِ معتبر کے ابتدائی صفحات میں بانی نے نہ تو خود کوئی مقدمہ ترتیب دیا نہ اپنی شاعری کے جواز میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کی۔ کہا تو بس یہ کہ ''میرا پہلا مجموعہ حاضر ہے آج بہت سے دوستوں کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کا اہل ہوا ہوں۔ میں چاہتا تو یہی تھا کہ جب تک کچھ کہنے کے قابل نہ کہہ لوں مجموعہ اشاعت کے لیے گھر سے باہر نہ کروں۔ لیکن میرے خیر خواہوں کی ضد نے مجھے زیر کر دیا۔ اگر میرے کچھ کلام میں میرا کچھ کھویا ہوا آپ کو مل جائے تو اسے میں اپنی ذات کی دریافت سمجھوں گا۔''

سچ تو یہ ہے کہ ہر اچھے شاعر کی طرح بانی کی غزلوں سے گزرتے وقت بھی ہماری پہلی اور آخری ملاقات بانی ہی سے ہوتی ہے۔ یہی ملاقات اس کی ذات کی دریافت ہے اور نئی غزل کے سفر میں جو کچھ ہمارے ہاتھ لگا ہے اس کا بیش قیمت حصہ۔

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دعا مانگتا ہے میرے لیے
مجھے بچھڑنے کا غم تو رہے گا ہم سفرو
مگر سفر کا تقاضا جدا ہے میرے لیے
اب آپ جاؤں تو جا کر اسے سمیٹوں میں
تمام سلسلہ بکھرا پڑا ہے میرے لیے
یہ حسنِ ختمِ سفر، یہ طلسمِ خانۂ رنگ
کہ آنکھ جھپکوں تو منظر نیا ہے میرے لیے

موت کی اس چٹان کے اس پار وہ ہزاروں فصلوں کا سہاگ دیکھے اور یہ چٹان ہماری آنکھوں کو اندھا نہ کر دے کہ ہم بھی ان فصلوں کا نکھار دیکھ سکیں۔

منھ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

نئی دلی کی ایک قدیمی بستی آشرم میں جدید وضع کے کچھ فلیٹس ہیں۔ انہی میں سے ایک میں گوگی رہتی ہے۔ ایک مصورہ۔ گوگی کے علاوہ اس گھر کے مکینوں میں ایک تو سلیم ہے۔ گوگی کا شوہر۔ پھر ان کا بچہ ماریش۔ ایک ملازم بھیا کچھ اور جاندار بھی اس گھر کے معزز باسیوں میں شامل ہیں۔ کچھوے۔ بلیاں اور کتے۔ جدید وضع کے فلیٹوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ سب کے سب ایک سے دکھائی دیتے ہیں۔ بے چہرہ۔ مگر آپ گوگی کے گھر پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ اس ہجوم بے چہرگاں میں اس گھر کے کچھ اپنے امتیازات اور شناختی نشانات ہیں۔ مالک اور ملازم اور پالتو جانور سب کے سب ایک خاموش معاہدے کے تحت اپنی اپنی زندگی جیتے ہیں۔ عمر اور قد و قامت کے فرق کو چھوڑ کر نہ کوئی کسی سے چھوٹا نظر آتا ہے نہ بڑا۔ سب ایک دوسرے کے حقوق کا احترام اس طرح کرتے ہیں گویا یہ عمل ان کی عادت بن چکا ہے اور اس کے لیے کسی کو دوسرے کی خاطر ایثار کرنے یا مروت سے پیش آنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

حد تو یہ ہے کہ گوگی جو ایک انعام یافتہ مصورہ ہے اور جس کی تصویریں دنیا کے کئی ممالک میں، ذاتی ذخیروں اور آرٹ گیلریز کی زینت بن چکی ہیں، اس گھر کی دیواروں پر خود اس کی یا اس کے بعض ممتاز معاصرین کی تصویروں کے ساتھ ساتھ گوگی اور سلیم کے ننھے بیٹے ماریش کی بنائی ہوئی ایک آدھ تصویر بھی آویزاں دکھائی دیتی ہے۔ اس چھوٹی سی دلچسپ دنیا میں خصوصی اختیارات کا کوئی چلن نہیں۔

اور ابھی حال ہی میں نئی دلی کی معروف گیلری آرٹ ہیریٹیج کی دیواروں پر گوگی کی نئی پینٹنگز دیکھ کر خیال آیا کہ اس مصورہ کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ اس نے اپنی دنیا کے تمام جاندار مظاہر کو، اپنی ذات سمیت، برابری کے اسی احساس کے ساتھ دیکھا ہے۔ اس نے نہ تو

انسان کو اشرف المخلوق جانا نہ چوپایوں کو آدم زاد سے کم تر گردانا۔ زندگی اور وجود کے تماشے میں دونوں ایک دوسرے کے رفیق اور اس تماشے کے عمل میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کی تصویروں میں اکیلی، اپنے آپ میں گم عورت دکھائی دیتی ہے، مرد نظر آتا ہے اور جہاں کہیں انھیں کسی اور جاندار یا چوپائے کا قرب میسر ہے، ان کی تنہائی کا تاثر شدید تر ہو گیا ہے۔ ہماری دنیا میں رفاقت کے تجربے کی یہ ایک نئی اور انوکھی جہت ہے۔

اس نمائش میں گوگی کی بیس پینٹنگز رکھی گئی تھیں۔ ان پر پہلی نظر پڑی تو ایسا لگا کہ پرچھائیوں کی بستی میں آنکلا ہوں۔ دھیمے دھیمے رنگ یا پس منظر میں جذب ہوتے ہوئے پیش منظر، یا چہرے آدمیوں کے عورتوں کے اور چوپایوں کے جن کے خطوط ہر لمحے کے ساتھ پگھلتے اور پھیلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کیفیت اداسی کی ہو یا تنہائی کی، دونوں میں ایک اتھاہ گمشدگی کا سراغ ملتا تھا۔ گویا کہ یہ سارا تماشہ ایک جبر کا اظہار ہے یا ایک مقدر کا حامل۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ مصورہ کے برش نے رنگوں کی زبان میں شعر کہنے کے جتن کیے ہیں۔

حیرت اس بات پر بھی ہوئی کہ یہ نیک بی بی جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے، اچانک اپنی پینٹنگز میں اس درجہ خاموش کیوں ہو گئی۔ نہ اس نے چیختے پکارتے رنگوں اور ہیئتوں کو منھ لگایا نہ یہ تصویریں دیکھنے والے کو کسی شدید، برجستہ اور چونکا دینے والے ردعمل کی نمائش پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان تصویروں کو دستوئیفسکی کے قصوں کی طرح چپ چاپ، تنہا اور وقت کی رفتار کے طلسم سے آزاد ہو کر پہروں پڑھتے رہنے کا جی چاہتا ہے۔ ان کے رمز دھیرے دھیرے کھلتے ہیں، ایک نیم فلسفیانہ درد کے بھیدوں کی مثال اور یہ سحر ٹوٹتا نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔

ایسا شاید اس لیے ہے کہ گوگی لفظوں کی کفایت کی طرح اظہار کی کفایت کے ہنر سے واقف ہے۔ اظہار بہت بے لگام ہو جائے تو آپ اپنا حجاب بن جاتا ہے۔ پھر ہم رنگوں یا لفظوں یا صورتوں کے شور میں کھو جاتے ہیں اور ان کے واسطے سے خود کو سمجھنے یا خود سے باتیں کرنے کا راستہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یوں بھی اداسی کی زبان ہمیشہ خاموشی کے ملبے سے جھانکتی ہے اور سناٹوں کے کاندھے پر سفر کرتی ہے۔

اس طرح گوگی نے کم سے کم رنگوں، ہیئتوں اور شکلوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ کہنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی مقدر اور کائنات میں انسان کی حیثیت کا سوالیہ نشان ان تصویروں

میں بہت نمایاں ہے۔ مادّی کامرانیوں کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی شکست اور پسپائی کا احساس ہمارے زمانے میں اگلے زمانوں سے کہیں زیادہ شدید تر ہے۔ کیا ادب اور کیا مصوری، ہر شعبے میں آج اس سوال کی حکمرانی نظر آتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ انسان اپنی روح کے انکشاف کا وسیلہ لفظ کو بنائے یا رنگ کو، یہ دونوں تجربے بالآخر ایک ہو جاتے ہیں۔ مصورہ نے تجربہ پسندوں اور فیشن پرستوں کے برعکس اس سوال کو انوکھی اور غیر متوقع ہیئتوں کا نقاب اوڑھانے کی کوشش نہیں کی ہے اور اس کی پیش کش کا جو طور اختیار کیا ہے وہ شروع سے اخیر تک بہت شخصی، بہت خود کار اور بہت فطری دکھائی دیتا ہے۔ اس پر طویل خود کلامی کا گمان ہوتا ہے اور یہ بات دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ خود کلامی کبھی بھی بلند آہنگ نہیں ہوتی۔ کمال یہی ہے کہ مغنی کے دل پر جو گزر رہا ہو اس کا نغمہ چیخ پکار نہ بننے پائے۔ شعر و ادب ہو یا ساز و رنگ یہ سب آنسوؤں کو دکھانے کے بجائے انھیں چھپانے کے وسیلے ہیں۔

خالص صناعی کے اعتبار سے بھی یہ تصویریں بہت روشن ہیں۔ گوگی نے اپنے احساس کی طرح اس کے اظہار میں بھی ضبط سے کام لیا ہے اور کینوس پر جو رنگ پھیلائے ہیں وہ ایک پل کے لیے بھی بے قابو نہیں ہوتے ان میں ایک گہری اور متین شائستگی اور جذبے کی طہارت کا تاثر ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ چنانچہ جہاں پیش منظر کے طور پر بظاہر صرف رنگ پھیلے ہوئے ہیں وہاں بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ کچھ صورتیں جھانک رہی ہیں۔ منھ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ۔ جبھی تو میر صاحب نے کہا تھا کہ "آئینہ خانہ ہے یہ سارا جہاں۔" کیا دیوار اور کیا دروازہ، سب ایک ہیں!

حافظے کا ایک ورق: سید احتشام حسین

تاریخیں مجھے یاد نہیں رہتیں ،مگر کچھ تاریخیں ایسی ہیں جو حافظے سے چپک کر رہ گئی ہیں۔انہی میں سے آج سے ٹھیک نو برس پہلے کے دسمبر کی دوسری تاریخ ہے۔اس دن کی یاد کے ساتھ ایک منظر دھیرے دھیرے ابھرتا ہے۔شہر الہ آباد میں خسرو باغ کی دیوار کے پیچھے گڑیا تالاب۔تالاب کے مقابل ایک دومنزلہ مکان۔ بظاہر اس بستی کے دوسرے عام مکانوں جیسا۔اس مکان کے سامنے ایک پتلی سی نیم پختہ سڑک ہے۔سڑک کے نکڑ پر کچھ دکانیں اور چائے خانے۔سب کے سب بند پڑے ہیں۔سڑک پر ایک بھیڑ ہے جو ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔اتنے بہت سے لوگوں کا ہجوم ،مگر ایسی گھنی اور گہری خاموشی۔سب کے سب سر نیوڑھائے کھڑے ہیں،کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا۔اور کہے بھی کیا؟اس وقت سب کے پاس کہنے کے لیے بس ایک بات ہے۔

آس پاس کے دکانداروں نے، پڑوسیوں نے،نکڑ پر کھڑے رکشہ والوں نے روز کی طرح اس دن بھی صبح نو بجے کے قریب اسے گڑیا تالاب کے سامنے والے مکان سے نکلتے دیکھا تھا۔ چہرے پر وہی متانت اور نرمی، آنکھوں میں وہی چمک ،لہجے میں وہی سادگی اور خلوص کی گرمی، کشادہ شفاف پیشانی پر وہی اڑتے ہوئے خوبصورت چاندی بال،وہی روز کی جیسی پر اعتماد اور بے نیازانہ چال۔وہ گھر سے نکلا تھا۔چند قدم چلا تھا۔پھر کوئی بات یاد آ گئی تھی۔گھر میں واپس گیا اور آن کی آن میں یہ خبر اس بستی سے پاس کی بستیوں میں، پھر دور دراز علاقوں میں پھیل گئی کہ ۲ دسمبر ۱۹۷۲ء کی صبح نے اسے آخری بار اس گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔مدرسے، کالج، یونیورسٹی،شہر کے متعدد اشاعتی ادارے اس کے سوگ میں بند کر دیے گئے۔پھر شہر کی مختلف سمتوں سے ہزاروں لوگ اس مکان کی سمت چل پڑے۔

اس منظر کی دھند سے ابھرتا ہوا روشن چہرہ،کل بھی روشن تھا اور نو برسوں کی گرد میں چھپنے کے

باوجود آج بھی روشن ہے۔ اس چہرے کے کئی چہرے تھے۔ ایک ممتاز دانشور کا چہرہ۔ ایک بلند پایہ نقاد کا چہرہ۔ گھر میں ایک بہت متین۔ بہت محبت کرنے والے بزرگ کا چہرہ۔ گھر سے باہر ایک بہت سادہ۔ بہت بے ریا۔ بہت نیک اور بظاہر بہت عام انسان کا چہرہ۔ اور ان تمام چہروں کا نام ایک تھا— سید احتشام حسین۔

احتشام صاحب کے چہرے سے زیادہ خوبصورت اور پرکشش چہرے آنکھوں میں بہت کم سمائے ہیں۔ ایک گھڑی بھی ایسی یاد نہیں آتی جب اس چہرے پر کسی ایسے جذبے، احساس، خیال، رویے، مقصد اور عمل کی لکیر نے سایہ ڈالا ہو جسے اصطلاحی معنوں میں سیاہ کہا جاسکے۔

ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ احتشام صاحب گھر کے بیرونی برآمدے کی دیوار پر لگا ہوا بجلی کا پوائنٹ نیچے ہٹوا رہے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ کہنے لگے: بھئی وہ سامنے کے گھر میں ایک بڑے میاں رہتے ہیں۔ اس بلب کی روشنی کے سبب سونے میں الجھن ہوتی تھی۔ میں نے سوچا اس کی جگہ بدل دی جائے۔ ان بڑے میاں کا گھر احتشام صاحب کے گھر سے کوئی پچیس تیس گز دور تھا۔

میں نے بہت دبی زبان سے کہا۔ آپ تبصروں اور کتابوں کے پیش لفظ لکھنے کے معاملے میں بہت روادار ہیں۔ نہ جانے کیسی کیسی کتابوں پر لکھ دیتے ہیں۔ بولے ''بھئی کیا کریں، فرمائشیں حد سے بڑھ جائیں تو ٹالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر ایسی کیا برائی ہے۔ لوگ تھوڑے خوش ہولیتے ہیں۔''

ان دنوں میں اندور میں تھا۔ احتشام صاحب یونیورسٹی کے ایک کام سے آنے والے تھے۔ میں نے لکھا کہ ''کسی ہوٹل میں آپ کے ٹھہرنے کا انتظام کردیں گے۔'' جواب آیا ''آپ اکیلے اور بے سروسامان ہیں تو کیا ہوا۔ جہاں آپ رہتے ہیں میں بھی وہیں ٹھہر جاؤں گا۔'' خدا جانے کیسے احتشام صاحب دلوں کی بات اتنی جلدی سمجھ لیتے تھے۔

ان کی شخصیت تصنع اور طمطراق سے اتنی آزاد تھی کہ بعض اوقات اس پر خواب کا گمان ہوتا تھا۔ وہ نئے زمانے کے انسان تھے اور اس زمانے کے ہر رنگ ہر ڈھنگ سے اچھی طرح واقف۔ مگر انھوں نے کبھی کسی ایسے طور طریقے، وضع قطع اور رویے کو منہ نہ لگایا جسے شرفا ''سوقیت'' سے اور زمانہ پرست اصحاب اس زمانے کی ''ضرورت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ سماجی اور تہذیبی

اقدار اور پیشے کی اخلاقیات کے اعتبار سے احتشام صاحب گئے زمانوں کے انسان نظر آتے تھے۔ انھوں نے ایک بہت ہی سرگرم ادبی اور ذہنی زندگی گزاری۔ کمیٹیوں، جلسوں، مذاکروں، مباحثوں میں شریک ہوتے تھے مگر ایک پل کے لیے بھی یہ گمان نہ گزرا کہ وہ اس نوع کی مصروفیتوں کو کیریر سازی کے وسیلے کی سطح پر قبول کرتے ہیں۔ وہ مجمع سے گھبراتے نہیں تھے مگر اپنی ذاتی زندگی میں وہ پرانے وقتوں کے علما کی طرح خلوت نشین بھی تھے اور کاروبارِ دنیا سے بے نیاز بھی۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ انھوں نے کبھی اپنے عزیز ترین شاگردوں سے بھی کوئی ایسی بات کی ہو یا انھیں ایسی بات کرنے کی اجازت دی ہو جو ایک سچے عالم کی شان اور ایک اچھے استاد کے منصب سے علاقہ نہ رکھ سکے۔ اپنے طلبا کے تئیں وہ غیر معمولی محبت رکھتے تھے مگر ایک متانت آمیز فاصلے کا تاثر بھی انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا۔ یونیورسٹیوں میں ان دنوں سازش، غیبت، جوڑ توڑ اور اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر طلبا کے استحصال کا جو چلن عام دکھائی دیتا ہے، احتشام صاحب کے زمانے میں اس درجہ عام نہ تھا۔ پھر بھی اکا دکا اساتذہ اس معاشرے میں ایسے نظر آجاتے تھے جن کی استادی علم و ادب کے میدان سے باہر زیادہ چمکتی ہے۔ ناپسندیدہ اشخاص، رویوں اور افکار کے سلسلے میں بھی احتشام صاحب نے اپنے ردِعمل کا اظہار ہمیشہ ایک ایسی سطح پر کیا جو ایک سنجیدہ عالم اور ایک شریف استاد کے شایانِ شان ہوتی ہے۔

احتشام صاحب کے انتقال کے چند روز کے بعد خلیل الرحمن اعظمی مرحوم نے کہا "احتشام صاحب بظاہر اتنے عام اور سادہ تھے جیسے صاف اور کھلی ہوئی فضا۔ ہم اس فضا میں سانس لیتے ہیں اور اس کے وجود سے بے خبر گزر جاتے ہین۔ مگر زندگی کے لیے اس کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہم سے دور ہو جائے۔

ایسا نہیں کہ احتشام صاحب کی موجودگی میں لوگ اس فضا کا احساس نہ کر سکے ہوں جس کے ماتھے پر ایک نام سید احتشام حسین کی تختی آویزاں تھی۔ مگر آج جب وہ نہیں ہیں تو خیال ہوتا ہے کہ ہر طرف کتنی گھٹن ہے اور کتنی تاریکی ہے۔ مرنے والے کی جبین روشن ہے اس ظلمات میں!

ایک مردِ فقیر کا سرمایہ

کھدر کا اُٹنگا سا پاجامہ، بوسیدہ سی سوتی شیروانی، پیروں میں کرمچ کے جوتے، سر پر بے ڈول سی ترکی ٹوپی اور آنکھوں پر ٹیڑھی میڑھی کمانی والا مٹ میلا سا چشمہ! مشاعرہ گاہ میں اعلان ہوا، ''مولانا حسرت موہانی تشریف لا رہے ہیں۔'' مولانا نے بغل میں دبا ہوا جھولا نکالا۔ کرمچ کے جوتے اتار کر جھولے میں ڈالے اور پھر اسی بے پروائی کے ساتھ جھولا بغل میں دبائے ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔

دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں شرکت کے لیے بھی جب مولانا جاتے تھے، سنا ہے کہ یہی سج دھج دکھائی دیتی تھی۔ انھیں کبھی ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بھی نہیں ہوئی جو انھیں اسمبلی یا پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے حاصل ہو سکتی تھیں اور جہاں تک دنیاوی سہولتوں کا سوال ہے، مولانا نے اپنی ذات پر ان کا دروازہ پہلے ہی سے بند کر رکھا تھا۔

آج سے ٹھیک تیس برس پہلے کی ایک گرم سہ پہر یاد آتی ہے۔ ان دنوں بیشتر راستوں پر ریل گاڑیوں کا سفر اس درجہ دشوار نہیں ہوتا تھا۔ نہ اب جیسی بھیڑ نہ وسوسے۔ گاڑیاں بھی آج کی بہ نسبت بہت دھیمی چال چلتی تھیں اور مسافر ریل کے ڈبے میں بھی آداب مجلس کا خیال رکھتے تھے۔ طول طویل سفر بھی اچھی اچھی باتوں میں کٹ جاتا تھا۔ سامنے کی برتھ پر بیٹھے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کے باریش بزرگ مسافر نے اپنے ساتھی سے کہا ''مولانا حسرت چل بسے!'' میرے والد نے چونک کر اس بزرگ کی طرف دیکھا اور سوالیہ لہجے میں بولے ''جی؟'' اس بزرگ نے مکرر یہ اطلاع بہم پہنچائی ''مولانا حسرت چل بسے!'' پھر راستے بھر صرف مولانا کی باتیں ہوتی رہیں۔

میری عمر اس وقت اتنی نہ تھی کہ اس گفتگو کی باریکیاں سمجھ سکتا، مگر حسرت کا نام اور ان کی دھندلی سی صورت ذہن میں محفوظ تھی۔ اردو کے نصاب میں ان کے کچھ شعر بھی پڑھے

تھے اس لیے خیال ہوا کہ بزرگوں کی اس گفتگو میں دلچسپی لینے کا کچھ حق مجھے بھی پہنچتا ہے۔

یوں بھی کسی کی موت کے فوراً بعد اس کا تذکرہ ہو رہا ہو تو عالمانہ بحثیں نہیں چلتیں۔ اس کی باتیں یاد کی جاتی ہیں اور چھوٹے موٹے واقعات اور حسرت کی زندگی تو ایسے مانوس، جانے پہچانے اور سیدھے سادے واقعات کا ایک عجیب گنجینہ تھی۔

مولانا کی قلندری کسی فلسفۂ حیات کا حاصل نہ تھی۔ جینے کا ایک طور تھی۔ اس لحاظ سے وہ اپنے زمانے ہی میں نہیں اس پوری صدی کی ادبی اور سیاسی شخصیتوں میں بے مثال تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کوئی پیچ تھا، نہ شاعری میں، نہ افکار میں۔ احتشام صاحب مرحوم بتاتے تھے کہ ایک بار انھوں نے مولانا کو انھی کا ایک مصرعہ یاد دلایا ''صوفی مومن ہوں اشتراکی مسلم'' اور استفسار کیا: ''مولانا! آپ کو ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا؟'' مولانا نے کمال سادگی سے جواب دیا ''تضاد کیسا؟ ایک اس دنیا کے لیے ضروری ہے، دوسرا عقبیٰ کے لیے۔'' یقین سچا ہو اور شخصیت بے لوث تو بہت سے تضادات اس طرح بھی حل ہو جاتے ہیں۔

مزاج کی سادگی، جذبے کی سچائی اور فکر کی صلابت کو حسرت کی ذات میں ایک نیا مفہوم ملا۔ وہ کانگریس میں جب تک شامل رہے اپنی آن بان پر حرف نہ آنے دیا۔ مکمل آزادی کی پہلی قرارداد انھی کے قلم سے نکلی اور کس شان کے ساتھ کہ سودیشی تحریک سے شدید جذباتی تعلق کے باوجود مولانا نے گاندھی جی سے اختلاف کے اظہار میں بھی کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ اسی طرح مسلم لیگ میں گئے تو وہاں بھی اپنی افکار کی عادت اور آزادی کا تحفظ ہر قیمت پر کرتے رہے۔ مولانا کے پاس اپنی ذات سے گنوانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ قانع ایسے تھے کہ کچھ پانے کی تمنا بھی نہ ہوئی۔

اظہارِ رائے کے معاملے میں مولانا بلا کے بے باک تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس میں فحاشی کی مذمت اور اس مذمت کے بہانے عصمت چغتائی کے ایک افسانے پر ملامت شروع ہوئی تو مولانا ہی سب سے پہلے دفاع کے لیے کھڑے ہوئے ''لطیف ہوسناکی'' کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں!'' یہاں بھی مولانا نے ادب میں فحاشی کے عنصر کی بحث کو کس سادگی کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔

حسرت کی یاد کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے بیگم ارونا آصف علی نے کہا کہ مولانا

اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ میں عندیب گلشن نا آفریدہ ہوں! مگر آج کے ملکی اور قومی معاشرے نے بھی حسرت کو کتنا سمجھا یا سمجھنا چاہا؟ اس سوال پر غور کیجیے تو اپنے آپ پر شرم آتی ہے۔ اس جلسے میں بیگم ارونا آصف علی اور پروفیسر ہیرن مکرجی دونوں نے اس المیے پر افسوس کیا کہ قومی آزادی کی جدو جہد میں حسرت یا بعض دوسرے مسلم قائدین کی خدمات ایک سرے سے بھلا دی گئیں۔ پاکستانی دانشور اس موضوع پر آتے ہیں تو اس طرح کہ حقیقت کا مفہوم ہی بدل کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اس موقع پر ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی کہ قومی حیثیت کے مسلمان قائدین میں مولانا کی اکیلی ذات تھی جس نے سیاست کو مذہب کی حدود سے الگ رکھا۔ یہ راستہ آسان نہ تھا کہ گاندھی جی تک کے سیاسی افکار مذہب کے سائے سے یکسر محفوظ نہ رہ سکے۔

یہ جلسہ حسرت کی صد سالہ تقریبات کے جشن کا ایک حصہ تھا۔ افتتاح نائب صدر جمہوریہ کے ہاتھوں ہوا اور صدارت کے فرائض جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر انور جمال قدوائی صاحب نے انجام دیے۔ مگر کیا قیامت ہے کہ حسرت، جس کی زندگی بجائے خود ایک سیاسی اور سماجی رزمیہ ہے، اس جشن کے موقع پر بھی ان کی ذات کسی المیہ کے ہیرو کی زندگی سے مماثل نظر آئی۔ ایک ایسا شخص جس نے اپنے لیے کسی سے کچھ طلب نہ کیا اور زمانے نے بھی اسے کچھ نہ دیا۔

کیا واقعی اس مرد فقیر کا سرمایہ اتنا حقیر تھا کہ اس سے آنکھیں پھیر لی جائیں؟ انکار کی آزادی، احتجاج، ایک عظیم قومی اور معاشرتی نصب العین میں سچا یقین اور اس کے لیے ان تھک جدو جہد، سیاست کے کاروبار میں ایسی طہارت کہ دامن پر ایک چھینٹ بھی نہ پڑنے پائے، قلندری ایسی جو اقتدار کے آستانے پر بھی ٹھوکریں مارنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ مولانا کتنے اچھے مسلمان تھے اور کیسے سچے انسان۔ اس زندگی میں کتنے سبق چھپے ہیں، صرف عام آدمیوں کے لیے نہیں بلکہ ان باکمالوں کے لیے بھی جنھوں نے عملی سیاست کا مفہوم بس ایک لفظ کی مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ زوال، مستقل اور مسلسل زوال!

اور بھی غم ہیں زمانے میں

پچھلے کئی مہینوں سے "اور بھی غم ہیں زمانے میں" عنوان کے تحت دلّی دوردرشن ڈراموں کا ایک سیریل پیش کر رہا ہے۔ اس سیریل میں ہر بار ریوتی سرن شرما کسی نہ کسی قومی سیاسی، تہذیبی اور سماجی مسئلے پر ایک تماشہ ترتیب دیتے ہیں۔ اس زمانے میں ہماری زندگی یوں بھی ڈراموں کا ایک مستقل سلسلہ بن گئی ہے۔ آئے دن ایسے واقعات پیش آتے ہیں یا ایسی صورتِ حال جنم لیتی ہے جس پر سچائی سے زیادہ کسی غیر دلچسپ ناٹک کا گمان ہوتا ہے۔ پھر ریوتی سرن شرما کی بصیرت روز مرہ زندگی کے معمولات میں بھی انوکھے اور پر پیچ زاویے ڈھونڈ نکالتی ہے۔ اردو کو ریوتی جی کی شکل میں ایک بہت باصلاحیت ڈرامہ نگار ملا تھا۔ بہت سے لوگ انھیں افسانہ نگار کرشن چندر کی افسانہ نگار بہن سرلا دیوی مرحومہ کے شوہر کی حیثیت سے بھی جانتے ہوں گے۔ افسوس کا مقام ہے کہ کچھ تو ڈرامے کی صنف کے تئیں اردو والوں کی بے اعتنائی، کچھ ریوتی جی کی اپنی بے پروائی کے سبب ہماری تاریخ ان کے کارناموں کی طرف مناسب توجہ نہیں کر سکی۔ اب کوئی انھیں اردو کے ایک سابق ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانتا ہے، کوئی ہندی ناٹک کار کے طور پر پہچانتا ہے۔

اِدھر کچھ عرصے سے ڈرامے کی صنف از سرِ نو توجہ کا مرکز بنی ہے۔ نت نئی ناٹک منڈلیاں وجود میں آئی ہیں۔ بعضے بے سر و سامان تھیٹر گروپ دلّی شہر کی سڑکوں اور چوراہوں پر بازاروں اور بستیوں میں عام انسانوں کے دکھ سکھ کا کھیل دکھاتے پھرتے ہیں۔ واضح رہے کہ عام انسان کا دکھ سکھ عام سطح پر بہت کم لوگوں کو متوجہ کرتا ہے، جب اسے کھیل کا روپ دیا جاتا ہے تو تماشائیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

ڈرامے کی یہ مقبولیت اور تو اور دلّی انتظامیہ کی پریشانی کا سبب بھی بن گئی۔ زیادہ دن نہیں

ہوئے جب اس حکم کا اعلان کیا گیا کہ دلی کے چھوٹے بڑے سبھی تھیٹر گروپ جب بھی کوئی کھیل دکھانے کا ارادہ باندھیں پہلے اپنی اسکرپٹ پولس سے پاس کروالیں۔ پولس والے یہ فیصلہ کریں گے کہ یہ کھیل دکھائے جانے کے لائق ہے یا چھپائے جانے کے۔

اس الجھن کا سبب کیا تھا؟ شاید یہ کہ کتابیں پڑھنے کے لیے تو خریدنا بھی پڑتا ہے اور ان کے دام روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔ مگر سرپھرے نوجوانوں کی ناٹک منڈلیاں تو بلا ٹکٹ اپنے کھیل دکھاتی پھرتی ہیں اور لوگوں کو وہ کچھ بتاتی پھرتی ہیں جسے لوگ پہلے سے جانتے ہیں، مگر جس کے تئیں پھر بھی انجان رہتے ہیں اسی میں ان کی بھی عافیت ہے اور انتظامیہ یا حکومت کی بھی۔

انتظامیہ کے اس فیصلے کے خلاف بہت ہنگامہ ہوا۔ مقام شکر ہے کہ لیفٹیننٹ گورنر نے اس احکام کی واپسی کا حکم بھی جاری کردیا اور بات آئی گئی ہوگئی۔ ''اور بھی غم ہیں زمانے میں'' کی پچھلی قسط میں ریوتی جی نے دلی انتظامیہ کے اس ڈرامے پر بھی اپنے ڈرامے میں بہت چبھتی ہوئی باتیں کہیں۔ مزید شکر کا مقام یہ ہے کہ اس طعن وطنز کے اظہار کا وسیلہ خود دلی دوردرشن بھی بنا۔

انکار، احتجاج یا اظہارِ رائے کی آزادی کسی بھی مہذب معاشرے اور قوم کی پہچان کا ایک بہت عام نشان ہے۔ ہماری خوش بختی کہ آج ہم جس معاشرے میں رہ رہے ہیں وہاں یہ آزادی میسر ہے۔ اس آزادی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش اگر کسی طرف سے ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی آزادی بھی میسر ہے۔ مگر اس مہذب دنیا کے بعض علاقوں میں اس آزادی کے ساتھ جو مذاق کیا جارہا ہے اسے دیکھیں تو عبرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں ماس میڈیا کی موجودہ صورتِ حال پر ایک نظر ڈالیے۔ ان دنوں جب اخبارات یا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے گرد پابندیوں کا حلقہ پاکستان میں آج کے جیسا تنگ نہیں تھا، ایک پاکستانی رسالے کے ذریعے یہ اطلاع ہم تک پہنچی تھی کہ ریڈیو پاکستان کے ایک افسر نے ہندوستانی راگ راگنیوں کے نام تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس باکمال کے بے مثال ذہن میں یہ نادر خیال ابھرا تھا کہ راگ باگیشوری کا نام بدل کر راگ ثریا یا راگ عذرا بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح چشم زدن میں راگ کی قومیت بدل جائے گی۔ اسی سلسلے میں یہ لطیفہ بھی سامنے آیا کہ ایک ٹھمری کے بول ''بیاں نہ مروڑو کرشن مراری'' کو ایک اس سے بھی بڑے باکمال نے ''بیاں نہ مروڑو

عبدالباری" سے بدلنے کا مشورہ دے ڈالا۔ ایک تحریک یہ چلی کہ خالص پاکستانی موسیقی پیدا کی جائے اور اس کی صورت یہ تجویز ہوئی کہ سارے ساز بیک قلم موقوف کر دیے جائیں اور گانے کے ساتھ صرف تالی بجائی جائے۔ یہ واقعی انتہائی درجے کی خالص موسیقی ہوتی۔ آپ نے مجاز کا وہ لطیفہ سنا ہوگا کہ ایک مشاعرے میں شعر پڑھتے پڑھتے ایک استاد شاعر کے مصنوعی دانتوں کا چوکھٹا منھ سے باہر نکل آیا تو مجاز نے کہا "حضرات! یہ خالص زبان کا شعر ہے۔"

خیر یہ تو ایک ہنسی کی بات تھی، مگر ادب یا فنونِ لطیفہ کے راستوں کا تعین یا مقدر کا فیصلہ جب بے ادب یا بے فنے اصحاب کے اختیار میں آتا ہے تو اسی طرح کے لطیفے جنم لیتے ہیں۔ پھر حیرت جاگتی ہے اور عقل اپنی جان بچانے کے لیے کسی اور سمت بھاگتی ہے۔

علوم، ادبیات، فنون اور ذرائع ابلاغ کے پودے صرف کھلی ہواؤں میں پنپتے ہیں۔ سیاسی مقاصد اور اقتدار کی سازشوں کا سائبان ان کے سر پر آجائے تو یہ پودے کملا جاتے ہیں۔ پھر کیا شعر وادب اور کیا مصوری و موسیقی ان سب کو اپنی نجات کا راستہ اظہار کے خفیہ مراکز کی زمین میں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ ضمیر سرکش ہوتا ہے، اسے تو اپنی سرکشی کی بہر طور حفاظت کرنی ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، کتابیں، کتب خانے، علمی اور تعلیمی مراکز، ادب اور فکر کے ادارے جلا کر خاک کر دیے جائیں جب بھی وہ ضمیر جو ہر سختی کو سہنے کی قوت رکھتے ہیں اور کسی بھی جبر کے ہاتھوں پسپا نہیں ہوتے، اپنی آزادیِ اظہار اور جرأتِ انکار کو زندہ رکھتے ہیں، آپ اپنے لہو کی غذا پر۔ حرفِ تمنا جسے روبرو نہ کہا جا سکے اپنے وجود سے محروم تو نہیں ہو جاتا۔ بات بظاہر بہت معمولی ہے پھر بھی لوگ سمجھتے کیوں نہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ سمجھتے ہیں اور ڈرتے ہیں! بقول راشد:

آدمی سے ڈرتے ہیں
جو گھڑی نہیں آئی
اس گھڑی کے آنے کی
آگہی سے ڈرتے ہیں!

خوابوں سے جی ڈرتا ہے

خواب ایک خوبصورت لفظ ہے!

اگر آنکھوں سے خواب چھن جائیں تو ان میں کیا رہ جائے گا؟ آج سے آنے والے کل کا رشتہ خواب جوڑتے ہیں۔ آنکھیں ویران ہوں تو خواب ان میں نئے رنگ بھرتے ہیں۔ دل اداس ہو تو خواب دلاسہ دیتے ہیں۔ پاؤں تھک کر بیٹھ رہیں تو خواب صدا دیتے ہیں۔ ایک راستہ بند ہو جائے تو خواب دوسری سمت بلاتے ہیں اور نئے منظر دکھاتے ہیں۔

مگر اس تماشے کا انجام؟

ہر صبح اخبار سامنے آتا ہے اور خوابوں کی ہنسی اڑاتا ہے۔ یہاں انفرادی خوابوں کا ذکر نہیں جو بہت قیمتی، بہت دلفریب، بہت اہم ہوتے ہیں مگر صرف اس شخص کے لیے جس کی پلکوں میں کاجل کی طرح بس گئے ہوں۔ کچھ خواب ایسے بھی ہیں جنہیں ہزاروں آنکھیں ایک ساتھ دیکھتی ہیں، جن کا تانا بانا ہزاروں لاکھوں سانسیں ترتیب دیتی ہیں، جن کے تمنائی ایک ساتھ ہزاروں دل ہوتے ہیں اور جن کی تعبیر ڈھونڈنے کے لیے ایک ساتھ ہزاروں قدم اٹھتے ہیں۔

ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والا ہر تصور، ہر مقصد، ہر سفر، ہر تحریک اور ہر انقلاب ایک اجتماعی ملکیت ہوتا ہے۔

نیا، آزاد، خود مختار اور ایک نیم دیوانے مطلق العنان بادشاہ کے مجنونانہ اقتدار سے محفوظ ایران بھی ایک خواب تھا۔ کتنے برسوں، زمانوں سے ایرانی عوام یہ خواب دیکھ رہے تھے، مسجدوں میں اور گھروں میں، سڑکوں پر اور بستیوں میں، جیل خانوں میں اور اذیت کدوں میں۔

اس خواب کے ہاتھوں بہت خون بہا، بہت گھر اجڑے اور بہت جانیں تلف ہوئیں۔ اس خواب کے ہاتھوں مٹھی بھر لوگ جو ہزاروں لاکھوں لوگوں کے مقدر کا مالک بن بیٹھے تھے

ذلیل بھی ہوئے۔شاہِ ایران اور ان کا خاندان،شاہ کے وفادار غلام اور عمالِ حکومت،شاہ کی خفیہ تنظیم ساواک کے کارندے اور درندے۔

ایک روز ایران آزاد ہوگیا۔ایک نئے ایران کا جنم ہوا جس کا خواب ہزاروں ایرانی طلبا، اساتذہ، دانشوروں، شاعروں، سیاسی کارکنوں، صحافیوں نے دیکھا تھا اور اس خواب کے رنگ اس دیس کے تمام باسیوں کی پلکوں میں انڈیل دیے تھے۔ڈاکٹر علی شریعتی جیسے جلیل القدر عالم اور مجیبی تبریزی جیسی عظیم الشان مجاہدہ نے یہ خواب دیکھا تھا اور اس پر اپنی جانیں وار دی تھیں۔ایک شاعر نے مجیبی تبریزی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

بہن:

تم اپنے دل کی باتیں

مجھ سے کہنا

جب ستارے سو جائیں!

اور سچ مچ پلکوں پر لرزتے ہوئے ستارے بالآخر سو گئے۔کالی اندھیری رات کے بطن سے ایک نیا سورج نمودار ہوا۔

اب اس سورج کی روشنی میں اخبار کے کچھ حرف اور لفظ اور جملے چمکتے ہیں تو دل کانپ اٹھتا ہے۔آج دو مارے گئے،کل دس مارے گئے، پرسوں بیس مارے گئے! یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا-- کتنی آسانی سے مرجاتے ہیں لوگ۔

اسٹاک ایکسچینج کی خبروں کی طرح ایران میں دانشوروں، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، طالب علموں اور اس خواب کے پرانے پجاریوں کا قتل بھی اب روز کا معمول ہے۔یہ معمول کب ختم ہوگا، خاک اور خون کے اس طویل سفر کی لمبی رات سے بھی زیادہ لمبے تماشے کا آخری منظر کب سامنے آئے گا،اس سوال کا جواب بھی بس ایک خواب دے سکتا ہے۔

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب پتہ چلا کہ علی گڑھ میں ایرانی طلباء کے ایک گروہ نے مخالف گروہ کے ایک طالب علم کی جان لے لی۔اس المیے پر کتنی آنکھیں نم ہوئیں، کتنے دل درد سے نڈھال ہوئے، مجھے نہیں معلوم۔مگر اتنا تو ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ نیا ایران بھی پرانے ایران کی طرح لہولہان ہے۔اب سے آگے اس کی پیشانی پر خون کی شفق پھیلی ہوئی تھی، آج

اس کی آستینوں سے بھی خون ٹپک رہا ہے۔

ایک عظیم خواب کی بے حرمتی کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے۔ بہت ملکوں میں بہت موقعوں پر خواب اسی طرح بے حرمت ہوئے۔ ادعائیت، باہمی منافرت، عصبیت ایک زمانے سے خوابوں کو اسی طور بے حرمت کرتی آئی ہے۔ کٹھ ملائیت مذہبی ہو یا نسلی یا قومی یا نظریاتی، عظیم خوابوں کو اسی طرح اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اقتدار کی ہوس، استحصال کی طلب، صرف اپنے یا اپنی قوم یا جماعت یا خاندان کے برحق ہونے کا نشہ اور ہر اختلاف، انکار یا دوسرے ہر رویے، ہر تصور، ہر عقیدے کے ناحق ہونے پر اصرار۔۔۔انہی تاریکیوں کی کوکھ سے سیاہ سورج کا جنم ہوتا ہے۔ اس سورج کے نکلتے ہی سارا منظر تاریک ہو جاتا ہے۔ پولینڈ، پاکستان، افغانستان، ایران، اس تاریکی کے سیلاب نے کتنی سرحدیں ایک کر دی ہیں۔ بس نام اور عنوان الگ الگ ہیں۔ ایک معروف ادیبہ نے ایک بوڑھے، بیمار جلاوطن سے استفسار کیا: ''روسی افغانستان سے چلے جائیں گے؟'' جواب ملا: ''ہاں، چلے تو جائیں گے مگر کیا پتہ کہ اس وقت تک کوئی افغان اس آزادی کا فیض اٹھانے کے لیے زندہ بھی بچے گا یا نہیں!''

بہت دن ہوئے ایک ایرانی شاعر نے کہا تھا: ''ایران کو ایک نیا ویت نام بننا ہوگا!'' جن دنوں شاہ کی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی، ایران ایک نیا ویت نام بن چکا تھا۔ مگر جب سے اب تک کتنی صبحیں آئیں اور گئیں، کتنے سورج ابھرے اور ڈوبے، یہ قصہ ختم ہونے میں نہیں آتا:

یہ کون جوان ہیں
جن کے لہو کی اشرفیاں، چھن چھن چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں!

سیاست کا یہ مشغلہ بہت پرانا ہے کہ بچے جوان ہوں تو قتل کر دیے جائیں۔ وہ جوان کب آئیں گے جن کے قدموں سے ایک ایسا سورج طلوع ہوگا جس کی روشنی سیاہ نہ ہو۔ خوابوں سے جی ڈرتا ہے مگر ان کے بغیر آنکھوں کا حال؟

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اس کی پیشانی، اس کی آنکھیں، اس کی آواز، اس کا سراپا—

اس کے اپنے نام کے علاوہ اگر انھیں کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے تو وہ ہے ایک مستحکم یقین، ایک روشن امکان۔

میں نے علی گڑھ کی سڑکوں پر اسے پہلے پہل اب سے کوئی بارہ برس پہلے دیکھا تھا۔ اس کی عمر بھی کوئی بارہ تیرہ برس کی رہی ہوگی۔ جب بھی میں نے اس کے گھر کی چار دیواری میں قدم رکھا اور وہ نظر آیا اس کا پہلا سوال یہی ہوتا تھا: "آپ ابی سے ملنے آئے ہیں؟"

پھر میں اسے برابر دیکھتا رہا۔ برابر بڑھتے اور بنتے ہوئے۔ ہر گزرتے ہوئے برس کے ساتھ اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ صاف اور شائستہ، اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ تیز اور روشن، اس کی باتیں پہلے سے زیادہ گہری اور سنجیدہ ہوتی جاتی تھیں۔ اسکول میں اسے برابر امتیازات ملتے رہے۔ مگر وہ کبھی مغرور نہ دکھائی دیا۔ اس کی شخصیت آپ سے آپ اس طرح نکھرتی جاتی تھی جیسے گلاب کی کلی دھیرے دھیرے پھول بنتی ہے۔ بظاہر بے ارادہ اور اپنے آپ سے بے نیاز۔

پھر میں نے اسے یونیورسٹی میں دیکھا۔ یہاں بھی وہ عام طلبا میں نمایاں تھا۔ مباحثوں میں، جلسوں میں، گھر میں، گھر سے باہر، دوستوں اور ہم چشموں میں، بزرگوں میں اور اساتذہ کے ساتھ۔ وہ کبھی بھی اپنے گرد و پیش کے ہجوم میں گم نہ ہوا۔ اس کی خاموشی بھی اس کے وجود کی خبر دیتی تھی اور یہ بتاتی تھی کہ زندگی کرنا بجائے خود حسن کی تخلیق ہے۔

پھر جب وہ علی گڑھ سے دلی آیا اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے اپنے شب و روز اس تاریخی شہر میں گزارنے لگا تو اس کی شخصیت میں کچھ اور نئے رنگ شامل ہوئے۔ اس کی باتوں میں گلوں کی کچھ اور خوشبو۔ اپنی دنیا اس نے

کتابوں اور کتب خانوں تک محدود نہ رکھی۔ اس نے زندگی کا رشتہ اس علم سے جوڑنا چاہا جس کی تحصیل ہمارے بیشتر طلبا اور طلبا ہی کیا اساتذہ کے لیے بھی محض ایک کارِ منصبی بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ زندگی اور علم دونوں تعمیر کے ایک موڑ پر ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ سو وہ ایک سی دلجمعی کے ساتھ دونوں کا حق ادا کرتا رہا۔ طلبا کے ہنگامے ہوں یا انتظامیہ کے مسائل، اس نے ہر موقعہ پر زندگی اور علم کے اس رشتے کو سامنے رکھا اور اس کی روشنی میں ان کے حل ڈھونڈتا رہا۔ اسے تنگ نظری، تعصب، ذہنی رجعت پسندی اور سطحی علم نمائی سب سے نفرت تھی۔ مگر اس نفرت نے نہ تو اس میں تلخی پیدا کی نہ وہ اپنے ماحول سے بیزار ہوا۔ وہ ذہین، ذمہ دار نوجوانوں کے مسائل اور طرزِ فکر کی ترجمانی بھی کرتا تھا، اور جب ضرورت آن پڑے اپنے منصب آگاہ بزرگوں کی وکالت بھی اسی جوش اور جذبے کے ساتھ کرتا تھا۔ طلبا اور انتظامیہ کی کشمکش میں اس کی اپنی حیثیت ایک پل کی تھی۔

تاریخ کے ایک ممتاز عالم نے کہا: "جب کبھی طلبا ہمارے قابو میں نہ آتے تھے، ہم اس سے مدد لیتے تھے، اور اگر وہ کسی بات کو ہی سمجھ لیتا تو پھر دوسرے طلبا کو قائل کر لینا ہمارے لیے آسان ہو جاتا تھا۔"

یہی اعتماد اس کی ذات پر اس کے ساتھیوں کا بھی رہا۔ نوجوان اور بزرگ دونوں جانتے تھے کہ وہ مصلحتوں سے مفاہمت کا عادی نہیں ہے اور سچائی جدھر بھی ہو وہی اس کا راستہ ہے۔ سچائی کا یہی شعور انسان کو اپنی طرف سے بے نیازی اور بڑے مقاصد کی ترویج کا چلن سکھاتا ہے۔

وہ ان طلبا میں تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ تعلیم کے معیاروں مین انحطاط کے مفروضے کو اپنی روشن نظری اور باخبری سے غلط ٹھہراتے ہیں اور اسی جیسے طالب علم درس و تدریس کے بظاہر بے روح مشغلے کو بامعنی بناتے ہیں۔ ان دنوں یونیورسٹیوں میں اساتذہ کی کاروباری سیاست، سیاسی لیڈروں اور جماعتوں کے شخصی اور گروہی مفادات کے لیے طلبا کو آلۂ کار بنانے کی عام روایت اور طلبا میں بات بے بات ہنگامے کھڑے کرتے رہنے کی عادت کا جو غلبہ دکھائی دیتا ہے اس کا سب سے افسوسناک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اچھے طلبا اور اچھے اساتذہ کی اکثریت نے خود کو اس تماشے سے یکسر لاتعلق کر لیا ہے مگر اسے اپنے ماحول کی سیاست، ملک کی سیاست اور دنیا کی سیاست، ان سب کے جبر کا احساس تھا۔ ان معاملات میں وہ اپنی رائے رکھتا تھا اور اس کے برملا اظہار

سے گریز نہ کرتا تھا۔

میں اکثر اس سے کہتا تھا: ”رزمی! کبھی کبھی تم مجھے اپنی عمر سے بڑے دکھائی دیتے ہو!“

یہ سن کر اس کے چہرے پر بچوں جیسی نرم مسکراہٹ پھیل جاتی۔ عجیب بات تھی کہ بچوں میں وہ مجھے عام بچوں کی طرح شوخ، نوجوانوں میں عام نوجوانوں کی طرح جوشیلا اور سرگرم، بزرگوں کے بیچ خاصا متین، محتاط اور تجربہ کار نظر آتا تھا۔ مگر اس کی شوخی، اس کا جوش اور اس کی متانت ایک ہی زنجیر کے حلقے دکھائی دیتے تھے۔ اس نے جس سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ اپنی شخصیت کے مختلف عناصر کی تنظیم اور حفاظت کی تھی وہ شاید ان کارناموں کی مثال ہے جو بہت خاموشی کے ساتھ اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک خود کار طریقے سے اپنی دنیا کو بدلتے رہتے ہیں۔

ابھی چند مہینے پہلے رزمی کا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ میں استاد کی حیثیت سے ہوا تھا۔ کالج سے گھر آتے جاتے ہر دوسرے تیسرے روز اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ کبھی شعبے سے نکلتے ہوئے، کبھی بس اسٹاپ پر، کبھی کسی اجتماع میں، کبھی گھر پر، جہاں کہیں وہ دکھائی دیتا یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود اور اس کے اظہار کی روشنی ساری فضا کو منور کر رہی ہے۔ ایک انوکھی شائستگی، ایک دلفریب سنجیدگی، ایک سحر طراز نرمی اور اسی کے ساتھ ساتھ رویوں مین ایک عجیب سی شادابی اور صلابت اچھے بھلے مجمعوں میں بھی اس کی پہچان قائم کرتی تھی۔ اسے دوسروں سے متعارف کراتے وقت مجھے بارہا ایک ایسی بے نام مسرت کا احساس ہوا جو طمانیت، آسودگی اور کامرانی کے لمحوں کا عطیہ ہوتی ہے۔ شاید اس کا سبب ذاتی بھی تھا کہ رزمی ایک دوست کا بیٹا تھا۔ مگر اس سے زیادہ یہ کہ اسے دیکھ کر نیکی، سچائی، شرافت اور شائستگی پر اعتماد کو تقویت پہنچتی تھی اور خیال آتا تھا کہ ہمارے فرسودہ رو اور فرسودہ فکر معاشرے میں رزمی جیسے نوجوانوں کی آمد اور شمولیت کا سلسلہ جاری ہے۔ انہی کی برکت سے علم اور تہذیب کی روایات کا تسلسل باقی رہتا ہے اور دنیا جیسی کہ ہے اس سے بہتر دکھائی دیتی ہے۔

اور پھر وہ شب و روز جو رزمی نے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کے ایک ساکت اور سراسیمہ گوشے میں دنیا سے بے خبر، اپنے آپ سے بے خبر گزارے کتنے عجیب تھے۔ رزمی کے احباب، اساتذہ، رشتے دار اور عام شناسا، ایک ہجوم اسپتال کی چوتھی منزل پر ایک امید کے ساتھ

ہر روز یکجا نظر آتا تھا۔ اسے کسی نے کبھی بیمار، مضمحل، کمزور دیکھا ہی نہ تھا کہ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی اس لمحے کا خیال آتا جو بالآخر آ ہی گیا۔ یہ خیال آتا بھی تو سب ایک دوسرے سے نظریں بچاتے اور سر کو جھٹک دیتے۔ پھر وہ دو ہاتھ جن میں دعا کی کتاب کانپتی رہتی اور ہونٹ ہلتے رہتے۔ ''رضوان! ہمارا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا نا!'' ''ہاں نجمہ! ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ، ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے کبھی ہمیں اتنا پریشان نہیں کیا۔'' یہ جملے کانوں سے اتنی بار ٹکرائے کہ مجھے ان میں ہانپتی کانپتی امید ایک یقین نظر آنے لگی۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ زندگی کا دامن معجزوں سے بھی خالی نہیں رہا۔ ہم سب ایک معجزے کے منتظر تھے۔

انجام کار، دس دنوں اور دس راتوں کی جدوجہد کا حاصل — وہ لمحہ۔ ایک امکان ختم ہوا اور ایک یقین ٹوٹ گیا۔ نوجوان کے بین الاقوامی سال کا آغاز ہمارے لیے جس کہانی کے ساتھ ہوا وہ ایک خواب کی صورت اب بھی آنکھوں پر مسلط ہے۔ وہ آنکھیں جو اس سال کے پہلے دن بند ہوئیں نہ جانے کیا کیا دیکھ رہی ہوں گی۔

مرنے والے سے زندگی کے عناصر الگ ہوئے
موت کی چٹان کے اس پار وہ ہزاروں فصلوں کا سہاگ دیکھے
اور یہ چٹان ہماری آنکھوں کو بھی اندھا نہ کر دے کہ ہم ان فصلوں کا نکھار دیکھیں!

آپ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

روز مرہ مسائل پر حکومتیں جو بیان دیتی رہتی ہیں انھیں جانچنے کا پیمانہ عام آدمی کے پاس کیا ہوتا ہے؟ شاید وہ حقیقتیں جو اس کے تجربے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر فسادات میں، یا ہنگاموں میں یا حادثوں میں کتنے مرے اور کتنے گھائل ہوئے، اس کی خبر حکومتیں کچھ اور دیتی ہیں، اخبارات کچھ اور کہتے ہیں، اور مختلف ذرائع سے عام آدمی تک جو اعداد و شمار پہنچتے ہیں، وہ کچھ اور بتاتے ہیں۔ ایسے معاملات میں تمام اخبارات کا رویہ ایک سا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اخبار حکمراں پارٹی کا ہمدرد ہے تو جس حقیقت پر حکومت پردہ ڈالنا چاہے گی، یہ اخبار بھی سعادت مند بچوں کی طرح اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لے گا۔ اسی طرح اخبار اگر مخالفت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے تو رائی کے پربت بنائے گا، جو نہیں ہوا وہ کر دکھائے گا اور خواہ مخواہ شور مچائے گا۔ عام آدمی بیچارہ حیران ہوتا ہے کہ اس میں کسے سچ جانے، کسے جھوٹ گردانے۔ کس کی مانے، کس کی نہ مانے۔

صحافی قوم کا ضمیر ہوتا ہے۔ مگر ہم آج یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ضمیر کتنی آسانی سے بک جاتے ہیں۔ دعوت تواضع جن میں سب سے زیادہ موثر ان دنوں سیال دعوتیں ثابت ہوتی ہیں، یا پھر روپے پیسے یا رعایت و رشوت کے ہزار ہا بے مثال طریقوں سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ صحافت سے لے کر زندگی کے تمام شعبوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ملازمتیں، ترقیاں، کامیابیاں اب ہمیشہ اپنی محنت اور صلاحیت کا حاصل نہیں ہوتیں۔ کرپشن زندگی کا ایک عام اسلوب بن گیا ہے اور خدا بھلا کرے سیاسی لیڈروں کا کہ انھوں نے اسے ایک معزز حیثیت عطا کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ اب اسے قانونی مراعات بھی حاصل ہوگئی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں فنون لطیفہ کی فہرست میں ابھی کرپشن کو جگہ نہیں ملی۔

اس حال میں وہ انوکھی مخلوق جو ادیب کہلاتی ہے، اس کا رول مشکل بھی ہے اور امتحان

طلب بھی۔ ادب بہر حال انسان کی اپنی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ شخصیت جتنی بے لوث، آزاد، جبر سے بے پروا اور حرص و ہوس سے بے نیاز ہوگی اس کا اظہار اتنا ہی سچا ہوگا۔ شاید اسی لیے سیاسی جماعتیں اور حکومتیں اب صحافیوں کی طرح ادیبوں کو خریدنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ اور دنیا کا قانون ہے کہ قیمت اسی شے کی لگتی ہے جو خریدی جا سکتی ہو۔

چنانچہ ادیب کی ایک قسم وہ بھی ہوتی ہے جو سرکاری ادیب کہلاتی ہے۔ اس کی قیمت، یہی انعامات، وظائف، عہدے، اعزازات، سرکاری وفود میں شمولیت، سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی قیادت۔ ان میں کچھ بے مول بھی بک جاتے ہیں بشرطیکہ ان کے اپنے ذہن اور ان کی حکومت کے مقاصد اور مصالح ایک ہوں۔ ان میں بڑے ادیب بھی ہوتے ہیں اور بڑے ادیب بھی ہوتے ہیں۔ اور جو بڑے ہوتے ہیں ان کی بڑائی سرکاری مناصب تک رسائی کے بجائے دراصل خدا کی شان کا ثبوت ہوتی ہے۔ ان میں اکثریت عام طور پر چھٹ بھئیوں کی ہوتی ہے۔ اس لیے جتنا بڑا چھٹ بھیا ہوگا، اقتدار کی رسی کو اتنی ہی مضبوطی سے پکڑے گا۔ اقتدار کے مرکز میں جب بھی کوئی تبدیلی آئے گی، چشم زدن میں وہ بھی بدل جائے گا۔ ایسوں کے لیے راوی ہمیشہ چین لکھتا ہے۔

لیکن اسی ہجوم بے چہرگاں میں وہ صحافی اور ادیب اور دانشور بھی ہوتے ہیں جو مردہ مچھلیوں کی مثال نہیں ہوتے اور ہمیشہ زمانے کے بہاؤ کے ساتھ نہیں بہتے۔ وہ ہر عذاب سہتے ہیں، مگر اپنی بات کہتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ مصلحتوں، وسوسوں اور مفاہمتوں کے محشرستان میں ان کے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے والے کتنے ہیں۔

ایسی حکومتیں جن کی اخلاقی اساس کمزور ہو، اختلاف رائے سے بہت خوفزدہ ہوتی ہیں۔ اس کا تماشہ ہم نے اپنے ملک میں بھی دیکھا ہے اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔ اس خوف سے نجات کا راستہ ان کے نزدیک بس یہ ہوتا ہے کہ اختلافات کو دبایا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا اختلاف؟ آپ نظام تعلیم کو اپنے سیاسی مقاصد کا تابع کر سکتے ہیں اور اس نظام کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں جو دانشوروں کے بجائے سدھائے ہوئے بندروں کی مثال ہوں۔ آپ سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عاید کر سکتے ہیں اور یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ یہ پابندی ملک و قوم کی عافیت کے لیے ضروری ہے۔ آپ اخبارات کو صرف وہ

کچھ چھاپنے پر مجبور کر سکتے ہیں جو بس سرکاری یا نیم سرکاری نیوز ایجنسیوں کے واسطے سے ان تک پہنچتا ہے۔ آپ سرکاری نوعیت کے ادبی رسائل میں بس سرکاری قسم کے ادیبوں کی تحریریں چھپنے کی سہولت پیدا کر سکتے ہیں، مگر ادب کی دنیا تو سرکاری، سیاسی، نظریاتی اقتدار کی دنیا سے باہر بھی پھیلی ہوتی ہے۔ پس اسے کیونکر اپنی اطاعت کا سبق دیا جائے؟ ایسے حالات میں سرکاری ادیب ادب کے ایک مخصوص تصور کی تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔ کبھی براہ راست طریقے سے اور اکثر بالواسطہ طور پر ایسے معیار قائم کرتے ہیں جو آزادیِ اظہار اور اختلاف کی ہر لہر کو دبا سکیں۔ کچھ ادیب ان حالات میں لکھنا بند کر دیتے ہیں۔ کچھ لکھنے کا ایسا ڈھب اپناتے ہیں جسے سمجھنے کے لیے اور جس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے عقل سلیم کے ساتھ مذاقِ سلیم کی شرط بھی ضروری ٹھہرتی ہو۔ اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لکھتے کہیں ہیں، چھپتے کہیں اور ہیں۔

یوں ادب پر سنسر شپ کا سوال بہت ٹیڑھی کھیر ہے اور یہ کہنے کے لیے غیر معمولی اخلاقی جرأت اور خوش توفیقی کی ضرورت ہے کہ آپ میر یا غالب یا اقبال کے خیالات سے چونکہ اتفاق نہیں کرتے اس لیے ان خیالات کی اشاعت بند۔ بالفرض آپ نے یہ بندش عاید بھی کر دی تو کیا؟ ادب تو دِلوں سے دلوں تک کا سفر ہے اور یہ سفر جن لفظوں کو زادِ راہ بناتا ہے وہ صحافت اور علوم کی زبان سے الگ اپنا ایک انوکھا وجود رکھتے ہیں۔ نہ تو ان کے رنگ مقرر ہوتے ہیں نہ ہیئتیں متعین۔ ان پر روک لگانا ایسا ہی ہے جیسے ہوا کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش۔ ادب پر جن ملکوں میں پری سنسر شپ کا چلن عام ہے وہاں بھی چھن چھنا کر ایسی تحریریں منظر عام پر آتی رہتی ہیں جن کا مفہوم سنسر کرنے والوں کے قابو میں کبھی کبھی نہیں آتا۔ سبب وہی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی ایک تو عقل سلیم اور پھر اس کے ساتھ ساتھ مذاقِ سلیم کی شرط۔ اور یہ دونوں چیزیں سلامت ہوئیں تو پھر سنسر کا پیشہ انھیں راس آنے سے رہا۔

شاید اسی لیے آئے دن ایسی خبریں سنائی دیتی ہیں کہ فلاں یا فلاں ادیب نے حکومت کی فلاں کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا یا فلاں اعزاز لوٹا دیا، یا فلاں انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ابھی حال میں یہ اطلاع ہم تک پہنچی ہے کہ انتظار حسین نے اپنے ناول 'بستی' پر پاکستان رائٹرز گلڈ کا انعام یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ اسے کسی اور مستحق کو بخش دیا جائے۔ انور سجاد کا ناول 'خوشیوں کا باغ' کوئی دو برس تک اشاعت کی راہ دیکھتا رہا اور بالآخر دلّی میں بلراج مین را کے رسالے 'شعور' کے

واسطے سے سامنے آیا۔ ویسے اخبارات کچھ اور بتاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یہ خبر آئی کہ ادب پہ سنسر شپ ختم کردی گئی ہے اور اخباروں پہ بھی۔ لیکن اخباروں کو اشاعت کے لیے جو مواد ملتا ہے اس کے وسائل وہی جوں کے توں۔ ایسی صورت میں آپ لاکھ کہتے رہیں کہ سب خیریت ہے، مگر بدگمانیوں کو تو ختم نہیں کر سکتے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان بدگمانیوں کی تصدیق کے لیے ایک ہزار ایک شہادتیں موجود۔ یہ تفصیل دلچسپ بھی ہے اور عبرتناک بھی۔ سو اس قصے کی اگلی کڑیاں پھر کبھی۔
خاتمہ کلام کے طور پر ظفر اقبال کے یہ چند شعر:

پاؤں کے نام پہ سر لکھنا ہے
یہی صورت ہے اگر لکھنا ہے

تیز تر دھوپ میں سائے کے لیے
صرف کاغذ پہ شجر لکھنا ہے

روشنی کے لیے اس چہرے کو
شمس کہنا ہے قمر لکھنا ہے

خوب انداز نگارش ہے اگر
قفس و قید کو گھر لکھنا ہے

کتابوں کا کمبھ میلہ

الہ آباد کا کمبھ میلہ اور دلّی شہر میں کتابوں کا میلہ. کم سے کم ایک معاملے میں دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کمبھ میلے کے دوران الہ آباد میں لاکھوں جاتریوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کے دام بڑھ جاتے ہیں۔ ہوٹلوں، تفریح گاہوں، سینما گھروں پر ایک مستقل یلغار۔ سنگم پر تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی۔ کتابوں کے میلے میں آدم زادوں کی بھیڑ تو ہوتی ہی ہے. مگر اس سے کئی گنا زیادہ کتابوں کی بھیڑ. ہزاروں چہرے اور لاکھوں کتابیں۔ بچے اور بڑے، نوجوان اور بوڑھے، عورتیں اور مرد جسے دیکھیے اسٹالوں پر پلا پڑ رہا ہے۔ اس چہل پہل کے معاملے میں سوویت یونین کا اسٹال سب سے آگے دکھائی دیا۔ اس ملک کے بارے میں سیاسی اور نظریاتی سطح پر دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس پر سب متفق ہوں گے کہ پڑھنے کی عادت کا ایسا چلن اور کتاب خوانوں کا اتنا بڑا حلقہ مہذب دنیا کے کسی اور دیس میں نظر نہیں آتا۔ شاید اسی لیے وہاں کتابوں کے دام بھی کم ہیں اور چالیس پچاس روپوں میں کتابوں کا ایک گٹھر ہاتھ آجاتا ہے۔ کیا بچے کیا بڑے، جو بھی اس اسٹال پر گیا کامیاب لوٹا۔

ویسے تو اب کاغذ کی گرانی، طباعت کی مہنگائی کے سبب کتابیں بھی سونے چاندی کے بھاؤ بکنے لگی ہیں۔ غریب آدمی شوقیہ اگر کتابوں کی دکان پر جائے تو آپ اپنی ہنسی اڑائے۔ متوسط آمدنی والے بھی جاتے ہیں تو گھبراتے ہیں اور اگر آپ کی جیب بھاری ہے تب بھی اس میلے میں یہ فیصلہ مشکل ہو جائے گا کہ کیا جوڑیں، کیا چھوڑیں۔ دنیا بھر کے موضوعات پر ایک سے ایک کتابیں بھری پڑی ہیں۔ کتابوں کے معاملے میں " تک دیکھ لیا خوش کام ہوئے" اور پھر خالی لوٹ آنا آسان نہیں ہوتا۔

کتنی ہی کتابیں آنکھ کے راستے دل میں اتر جاتی ہیں۔ پھر آنکھیں پچھتاتی ہیں اور دل اداس ہوتا ہے۔ دونوں طرف برابر کی آگ لگی ہوئی ہو تو محبوب آپ سے آپ کھنچ آتا ہے۔ مگر

کتابیں پہلے اپنی قیمت طلب کرتی ہیں۔ اب کے برس پرگتی میدان میں کتابوں کا جو میلہ لگا ہے، پانچواں ہے اور پچھلے چاروں میلوں سے زیادہ سجیلا اور شاندار۔ ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں رکھی گئی ہیں جن کی مجموعی قیمت کا اندازہ تینتالیس لاکھ روپے لگایا جاتا ہے۔ اس میں تیس ملکوں کے پینسٹھ ناشروں نے حصہ لیا ہے۔ ہمارے اپنے ملک کے ساڑھے چار سو ناشروں کے علاوہ۔ دنیا کے بڑے ممالک سے قطع نظر گھانا، کینیا، نیپال، متحدہ عرب امارات، ڈنمارک، کوریا، میکسیکو، مصر، کیوبا، لیبیا، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش اور دور دراز کے بہت سے دیشوں نے اپنی اپنی دکانیں سجائی ہیں۔ غرضکہ اس میدان میں ایک عالم سمٹ آیا ہے۔ ہندوستانی ثقافت، سماج، ادبیات اور علوم سے متعلق سات ہزار کتابوں کا ایک الگ گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔ کم و بیش ہر ملک کی کوشش یہی دکھائی دیتی ہے کہ اس کے ذہنی ماحول اور ثقافتی امتیازات سے لوگ اچھی طرح باخبر ہو سکیں۔ اس ملک کی زندگی کو جانیں اور اس کے کارناموں اور فتوحات کو پہچانیں۔ سچ ہے کتابیں بڑے سے بڑے سفارت خانے سے کہیں زیادہ موثر طور پر ایک ملک یا معاشرے کے افکار و آثار کی ترجمانی کا کام انجام دیتی ہیں۔ اپنی خاموش زبان سے اتنا کچھ بتا جاتی ہیں جسے جاننے کا دوسرا کوئی وسیلہ ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ مہدی افادی مرحوم کتابوں کو "نازنینانِ کاغذی" کہتے تھے۔ اب ذرا سوچیے کہ جہاں ایک ساتھ اتنی نازنینوں سے واسطہ ہو، اس جگہ کے رنگ اور ڈھنگ کیا ہوں گے — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست!

ظاہر ہے کہ اتنا بڑا تماشہ بس سرسری نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر آدمی کی کچھ مخصوص دلچسپیاں ہوتی ہیں، کچھ ترجیحات۔ یوں بھی ایسے موقعوں پر انتخاب کے سوا چارہ کیا ہے۔ ہم بھی سرسری اس جہان سے گزرے۔ دو چار جگہ نگاہ ٹھٹکی تو کچھ زیادہ وقت گزار لیا۔ ایران کے اسٹال پر بھی گئے کہ اردو نے فارسی سے عشق کرنا بھی سکھایا تھا۔ ایک بھاری بھرکم کتاب پر نظر رکی۔ دیوانِ حافظ کا کیسا حسین و جمیل نسخہ تھا۔ ایرانیوں کی خوش مذاقی اور سلیقہ مندی کا جیتا جاگتا نمونہ۔ مگر کتنا قیمتی۔ یہ گہر پارہ ایک کونے میں پڑا تھا۔ دوسری طرف نہایت چمکیلے، بھڑکیلے رنگوں میں امام خمینی گٹھ کے گٹھ، دام فی عدد بس ایک روپیہ۔ یہ پوسٹر اتنی نمایاں جگہ پر رکھے گئے تھے گویا باقی سب کچھ انہی کے طفیل ہے۔ اسٹال کی دیواروں پر ان کے اقوالِ زریں۔ کتابوں کی نمائش شخصیت پرستی کے اظہار کا بہانہ بن گئی۔

پاکستان کا اسٹال، نہایت مختصر اور اس پر ستم یہ کہ اتنا ہی غیر معتبر۔ اردو زبان و ادب کا ہر شیدائی وہاں یہ امید باندھ کر جاتا تھا کہ شعر و ادب، ثقافت و تہذیب، علم و آگہی کے جو گنجینے کتابوں، رسالوں کی آمد و رفت میں مشکلات کے سبب آنکھ سے اوجھل رہ جاتے ہیں کم سے کم اس میلے میں تو سامنے ہوں گے۔ مگر حال یہ کہ جو جائے سو پچھتائے۔ نیا ادارہ کی کوئی کتاب نہیں۔ کوئی نیا رسالہ نہیں۔ نہ محراب نہ نیا دور، نہ اوراق نہ تخلیقی ادب نہ ادبِ لطیف، ننھے سے اسٹال کے ہر گوشے میں بس ایک مخصوص محدود اور مسدود طرزِ فکر کا ارتعاشِ خفیف۔ ادب کے نام پر چند کتابیں ابن انشا کی دو تین ناول، ایک دو شعری مجموعے، نقوش کے کچھ خاص نمبر، باقی مجلس ترقی ادب کی درجن بھر علمی اور تحقیقی مطبوعات ناصر کاظمی، کشور ناہید، احمد مشتاق، منیر نیازی کیا ہوتے، وہاں نسیم مجازی تک لاپتہ تھے۔ خدا جانے کس بھول چوک میں انتظار حسین کی بستی اور انور سجاد کے استعارے کی ایک ایک جلد راہ پا گئی۔ یہاں پاکستانی ادب، دانش اور ذہن کے بجائے بس ایک ذہنیت کی نمائش تھی۔ پاکستان میں نئے پرانے اتنے بڑے بڑے لکھنے والوں کا بسیرا ہے، اس اسٹال کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ہر طرف بس ایک خاموشی کا ڈیرا ہے یا پھر ساری قوم کو محض تنگ نظری اور رجعت پرستی نے آن گھیرا ہے۔ اور تو اور وہاں ممتاز مفتی یا احمد ندیم قاسمی کی بھی کوئی تصنیف نظر نہ آئی۔ ایک پنجابی بزرگ نے پوچھا، ”فیض احمد فیض کی کوئی کتاب ہے؟“ جواب ملا ”جی نہیں!۔“ ”کوئی فہرست کتب؟“ ”جی نہیں!“ ”پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب پر کوئی کتاب؟“ ”جی نہیں! جی نہیں!“ پھر تھا کیا؟ چند قاموسیں، چند فرہنگیں، چند تراجم اور مذہبی لٹریچر! اب اس ماحول کے لٹریچر اور نیچر کا اندازہ آپ لگائیے۔ معیار و مقدار کے لحاظ سے مذہبی لٹریچر بھی بعض ہندوستانی ناشرین کے اسٹالوں کی بہ نسبت فروتر۔ اب جو نہیں جانتا یہی سمجھے گا کہ پاکستان میں نہ تو ادیب بستے ہیں، نہ دانشور۔ نہ سائنس، سماجی علوم، فلسفہ، فنونِ لطیفہ پر کوئی لکھتا ہے نہ پشتو، پنجابی، سندھی اور انگریزی میں۔ نہ زندہ مسائل پر کتابیں چھپتی ہیں نہ رسالے نکلتے ہیں۔ وہ لوگ جنہیں ہم پاکستانی ادیب، شاعر، صحافی، دانشور کی حیثیت سے جانتے ہیں، شاید کسی اور دیس میں بستے ہیں۔ چہ عجب! غضب الغضب!

پس نوشت: اس ”بے مثال علمی اور ادبی ذخیرے“ کے ساتھ جو عملہ آیا اس میں ذوالفقار تابش بھی تھے۔ انھیں ایک ادیب کی حیثیت سے یہاں لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔ واضح رہے

کہ ادبِ لطیف کی مجلس ادارت میں بھی ان کا نام شامل ہے اور اس رسالے کی حالیہ اشاعت میں حبیب جالب کا یہ شعر بھی چھپا ہے:

داورِ حشر بخش دے شاید
ہاں مگر اک غبی سے ڈرتے ہیں!

مزید پس نوشت اینکہ یہ شعر ایک غزل کا ہے۔ چنانچہ غبی کے مرادی معنی "معشوقِ ستم پیشہ وکند ذہن" کے بھی ہو سکتے ہیں۔

عتیق بھائی - ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ایک غیر ملکی مہمان، جو اپنے ملک کی طرف سے دنیا کے کئی بڑے ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں، ایک منتخب مجمع کو خطاب کر رہے تھے۔ اچانک ان کی کسی بات پر پاس بیٹھے ہوئے مردِ بزرگ کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ ''نان سنس!'' انھوں نے دھیرے سے کہا۔ معزز مہمان حیرت سے بولے ''آپ کچھ کہہ رہے تھے؟'' مردِ بزرگ نے پھر اسی انداز میں ہونٹ ہلائے ''نان سنس!'' معزز مہمان بجائے اس کے اپنی بات پر اس بے ساختہ تبصرے کا برا مانتے، اپنی صفائی پیش کرنے لگے۔ اُدھر اُن مردِ بزرگ کے چہرے پر نہ کوئی ناگواری نہ پچھتاوا۔ بے نیازانہ پائپ کے کش لیتے رہے اور یوں بیٹھے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

میں کہ ان مردِ بزرگ کے نیازمندوں میں ہوں ان کی اس ادا کا لطف کئی بار اٹھا چکا ہوں۔ ایک روز مکتبہ جامعہ میں بیٹھے بیٹھے اچانک اٹھے اور فون کی طرف لپکے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا بات ہے عتیق بھائی؟''

''ذرا.......... سے بات کرنی ہے!''

یہ کہتے ہوئے انھوں نے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے پرتپاک لہجے میں آواز آئی، ''اخاہ آپ ہیں۔ آداب عرض! فرمائیے! زہے نصیب!''

''یار تم عجب نالائق آدمی ہو! تمھارا ذہن بہت سازشی ہے، ہونہہ!'' یہ عتیق بھائی کی طرف سے اس تپاک کا جواب تھا۔

اس طرزِ تپاک کا تماشہ دیکھنے والوں میں اس وقت میرے علاوہ مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں صاحب بھی تھے۔ حیرانی نہ انھیں ہوئی نہ مجھے ہوئی۔ عتیق بھائی کے لیے سچ بولنا ایسا ہی ہے جیسے سانس لینا۔ کوئی مجبوری اس راہ میں آڑے نہیں آسکتی۔

عتیق صدیقی صاحب کو ایک نامور محقق، صحافی، عالم اور دانشور کی حیثیت سے، بہت لوگ جانتے ہیں۔ میں نے بھی طالب علمی کے زمانے میں سب سے پہلے ان کی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" کے واسطے سے انھیں جانا تھا اور سخت مرعوب ہوا تھا۔ ان سے بالمشافہ گفتگو اور ملاقاتوں کا سلسلہ پانچ چھ برس پہلے جامعہ آنے کے بعد شروع ہوا۔

اکثر یہ دیکھتا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دوپہر میں کھادی کے کرتے پاجامے میں ملبوس یا سردیوں مین ایک بھاری بھرکم کوٹ میں ملفوف، آنکھوں پر کالا چشمہ، سر پر سفید بالوں کا الجھا ہوا گچھا، منھ میں پائپ دبائے عتیق بھائی تیز تیز قدموں سے یوں بھاگے جا رہے ہیں جیسے ٹرین پکڑنی ہے۔ ان کی یہ عجلت پسندی چہرے بشرے، چال ڈھال، ان کے شیوۂ مقال سے صاف جھلکتی ہے۔ ملاقاتیں ہونے لگیں تو اس طور کے کچھ اور بھید کھلے۔ راہ چلتے نظر آئے۔ کچھ ڈانٹنے والے انداز مگر دھیمے لہجے میں کہا: "اے اِدھر آؤ! اِدھر آؤ۔ یہ بتاؤ کہ فلاں واقعہ قرۃ العین حیدر کی کتاب کارِ جہاں دراز ہے کے کس صفحے پر ملے گا؟"

"یہ تو کتاب دیکھ کر ہی بتایا جا سکتا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ جاؤ!" اور یہ کہتے ہوئے عتیق بھائی یہ جا وہ جا۔

اگر سیمابی کیفیت کو مجسم دیکھنا ہے تو عتیق بھائی سے بہتر مثال مشکل سے ملے گی۔ ان کے آداب و اطوار، ان کی ذہانت، ان کی حاضر جوابی اور صاف گوئی، ان کے تبسم اور ان کی شفقت، سب میں یہ کیفیت جھلکتی ہے۔ ایک طرف یہ عجلت پسندی، دوسری طرف کتابوں کے ہجوم میں تصنیف و تالیف یا مطالعے کے دوران ان کا غیر معمولی ٹھہراؤ اور استغراق، یہ دو ضدیں کچھ عجیب انوکھے ڈھنگ سے ان کی شخصیت میں یکجا ہو گئی ہیں۔ انھیں دیکھ کر گئے وقتوں کے ان علماء کا خیال آتا ہے جن کے ہر انداز میں ایک کھوئی ہوئی سادگی کا اجالا سمٹا ہوتا تھا اور جو نام و نمود یا صلہ و ستائش کی تمنا سے یکسر بے پروا ہو کر اپنی بوریہ نشینی میں مگن دکھائی دیتے تھے۔ کبھی کبھار جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کتب خانے میں اپنی کمزور آنکھیں کتاب کے ورق پر جمائے ہوئے گھنٹوں وہ گمشدگی کے جس عالم میں ڈوبے نظر آتے ہیں اسے دیکھ کر اپنے حال پر شرم آئی۔ خیال آیا کہ یونیورسٹیاں جہاں علم کا کاروبار دانشمندوں کی اکثریت کے ہاتھوں اب فیشن شو بنتا جا رہا ہے کاش اس راہبانہ خلوت نشینی کے کچھ آداب بھی اختیار کر سکتیں۔ عتیق بھائی نے نہ تو علم

کو کیریر بنایا نہ اپنی شہرت کو ترقی کے حربے کی صورت آزمایا۔
البیرونی کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ سال بھر کی غذا خوراک جمع کر کے اپنے گھر میں مقید ہو جاتا تھا اور پھر اپنے شب و روز کا ہر لمحہ حقیقت کی اس تلاش کے لیے وقف کر دیتا تھا جس کا وسیلہ علم ہے۔ وہ زمانے تو خیر اب کل کا قصہ بنے۔ یوں بھی عتیق بھائی کا سابقہ جس زندگی سے ہے وہ ان سے ہر روز کنواں کھودنے اور پانی نکالنے کا تقاضا کرتی ہے۔ قلم کی یہ مزدوری جہاں انھیں جینے کے وسائل فراہم کرتی ہے وہیں ان کی صحت سے اپنا قرض بھی وصول کرتی رہتی ہے۔ دل کا روگ لگا بیٹھے ہیں اور جیسے تیسے جیے جاتے ہیں۔ تس پر بھی شخصیت میں وہی طنطنہ، باتوں میں وہی کاٹ اور لہجے میں وہی برجستگی اور تیزی۔ غلط موقعوں پر بھی صحیح، سچی بات کہنے کی وہی عادت جو ایک مدت کے بعد آدمی کی مجبوری بن جاتی ہے۔ عتیق بھائی کی سب سے بڑی مجبوری بھی اب ان کی اپنی ذات ہے۔

ایسی علمی لگن ہمارے زمانے میں نایاب تو نہیں، کمیاب ضرور ہے۔ اگر وہ کسی مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں اور اس الجھن میں صبح سے شام ہوئی اور بجلی غائب تو عتیق بھائی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ جائیں گے اور مسودے پر نظریں گاڑے رہیں گے۔ ان کے بعض بے تکلف دوستوں نے انھیں شاید اسی لیے عتیق صدیقی کی بجائے تحقیق صدیقی کا نام دے دیا ہے۔

ریڈی میڈ اشیا کی مثال ریڈی میڈ علم بھی یکے از اوصافِ عصر حاضر ہے۔ مباحثوں، مذاکروں، جلسوں میں فی البدیہہ تقریروں کی طرح فی البدیہہ مضمون لکھنے کا چلن عام ہے۔ پھر اللہ نگہبان اور ناشر مہربان ہو تو اپنے یا دوسروں کے یہ مضامین مل ملا کر کتاب بھی بن جاتے ہیں۔ کتاب چھپ گئی تو اس پر فرمائشی تبصروں کی بھرمار۔ اس طرح اصل موضوع کا جو بھی حال ہو، ''مصنف'' مالا مال ہو جاتا ہے۔ عتیق بھائی سال کے سال ایک کتاب لکھ ڈالتے ہیں، کتاب بناتے نہیں اور اس کے لیے جن مرحلوں سے گزرتے ہیں ان کا احوال بجائے خود تلاش و تحقیق کا ایک طولانی قصہ ہوتا ہے۔ سرسید، اقبال، بیگم حسرت موہانی پر ان کی جو چھوٹی بڑی کتابیں پچھلے دنوں سامنے آئیں وہ کیسے کیسے حجابات سے پردے اٹھاتی ہیں اور کیا کیا حقائق سامنے لاتی ہیں، ان کا کچھ اندازہ اس ردعمل سے کیا جا سکتا ہے جس کا اظہار حلقہ یاراں یا بزم نیاز منداں کے بجائے ہندو پاک کے اعلیٰ علمی حلقوں میں ہوا ہے۔ بظاہر ایک چھوٹی سی بات کے دلائل اور

شواہد کی جستجو کہاں کہاں اور کب تک ساتھ لیے پھرتی ہے اس کے عملی تجربے کی سعادت تو مجھے میسر نہ آسکی۔ البتہ عتیق بھائی کی سرگرمیوں سے اس کا کچھ اندازہ ضرور ہوا۔ ان کی مختصر سے مختصر تحریر بھی اسی لیے غیر معمولی چھان بین کا پتہ دیتی ہے۔ اس سے مسلمات پہ ضربیں بھی پڑی ہیں اور نئے مفروضے بھی قائم ہوئے ہیں۔

ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے ملک کی قومی تاریخ میں اردو اور اس کے واسطے سے مسلم صحافت یا قومی تعمیر کی جدوجہد میں مسلمانوں کے رول کی نشاندہی بہت مدلل طریقے سے کی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس رول کا عرفان ہمارے معاشرے میں عام نہیں۔ روشن خیالی اور کشادہ نظری کا علم تو بہت لوگ اٹھائے پھرتے ہیں مگر صحیح معنوں میں انھیں زندگی اور فکر کے ایک قدر یا قرینے کی صورت میں برتنا سہل نہیں ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ ساتھ خود اپنی جذباتی ترجیحات اور اپنے تعصبات بھی نشانہ بنتے ہیں۔ عتیق بھائی کی کتاب "اقبال — جادوگر ہندی نژاد" پر بعضے پاکستانی صحافیوں اور دانشوروں نے جس ردعمل کا اظہار کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ہندو یا صرف مسلمان کی حیثیت سے حقائق کو دیکھا جائے تو ان کے کچھ پہلو نگاہ سے اوجھل بھی ہو جاتے ہیں۔ عافیت کا راستہ وہی ہے جسے عتیق بھائی چھوڑ آئے ہیں اور اپنی آزادہ روی میں بھی مگن ہیں۔ مشکل کو آسان کرنے کا ایک طور یہ بھی ہے۔

کہیں تو ہوگا لکھا اس کا نقش پا دیکھیں

یہ سرگوشی ایک لب لرزاں سے ابھری تھی۔ اس سے ہمارا تعارف فروری کے پہلے ہفتے میں ہوا جب ذوالفقار تابش لاہور سے دلّی آئے۔ مشکل سے پینتیس منٹ کا فاصلہ، مگر کتنا کٹھن۔ صادقین نے بتایا، انھیں یہ دوری طے کرنے میں پینتیس برس لگ گئے۔ بقول انتظار حسین لاہور سے دلّی تک آنے جانے کا معاملہ سفرِ عشق کی مثال ہے۔ عاشق ہزار رنج کھینچتا ہے، خوار ہوتا ہے، ہلکان ہوتا ہے، تب کہیں جا کے منزلِ مراد ہاتھ آتی ہے۔

ذوالفقار تابش کا نام تو ہم پاکستانی رسائل میں دیکھتے رہتے تھے، ان کا سری لنکا کا سفرنامہ بھی جزیرہ کے نام سے قسطوں میں چھپ رہا تھا اور پہلی ہی نظر میں اس مسافر پر میری نگاہ ٹھٹکی تھی کہ اس نے دیارِ غیر میں اپنا وقت دکانوں کے شوکیس جھانکنے کے بجائے آدم زادوں اور پرندوں اور درختوں کے بیچ گزارا تھا۔

پھر لاہور سے نئی سج دھج کے ساتھ ادب لطیف آیا تو اس کی مجلس ادارت میں غالب احمد، کشور ناہید، مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ذوالفقار احمد تابش کا نام بھی دکھائی دیا۔ برسہا برس پہلے وہ نصرت نکالتے تھے۔ مختصر سا رسالہ تھا مگر جب بھی آتا اپنے ساتھ شوق کے بہت سامان لاتا۔ دونوں ملکوں کے اہل سیاست کا پاکستان انھیں مبارک۔ ہمیں اپنے پاکستان کی خبر انہی واسطوں سے ملتی ہے۔ ہمارے عہد کے آشوب میں ایک آشوب یہ بھی ہے کہ آدمی اخبارات پڑھتا ہے اور بہت کڑھتا ہے۔ ملک ملک کے آدمیوں کا طرز احساس، ان کے گہرے سچے دکھ اور سکھ، خوابوں اور خرابوں، ان کے اندر چھپی ہوئی کائنات۔۔۔ ان سب کو جاننے، جانچنے اور بانٹنے کا شاید سب سے بڑا وسیلہ بھی لفظ ہے۔ ان لفظوں کے معنی سیاست نے بدل دیے ہیں، تخلیقی آدمی نے کچھ اور گہرے کر دیے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی گواہی دی ہے۔

ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا تو ذوالفقار تابش کھڑے تھے۔ صبح کا اخبار سرحد پار کی جو خبریں لایا تھا، ان کے نقش دھندلے ہوتے گئے۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو وہ نقش روشن ہوئے جو لوحِ جاں پر پہلے سے مرتسم تھے۔ انتظار حسین، انور سجاد، کشور ناہید، زاہد ڈار، منیر نیازی، پھر ظفر اقبال، وزیر آغا اور جیلانی کامران، عباس اطہر، سلیم الرحمن، شہرت بخاری، احمد مشتاق اور ناصر کاظمی، اور یہ فہرست خاصی طویل تھی۔ اُدھر اخبار میں صرف آغا شاہی اور نرسمہا راؤ۔ کچھ بھید کچھ بھاؤ۔ ہر ایک اپنے اپنے حساب سے بولتا اور سمجھتا ہے۔ ہم نا جنگ معاہدے کے شور شرابے میں روشن آرا بیگم، استاد امانت علی خاں اور ریشماں اور عالم لوہار کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھے۔

ذوالفقار تابش کو اپنی کاروباری مصروفیتوں سے ذرا چھٹی ملی کہ دلّی کی میوزک شاپس کے چکر شروع ہو گئے۔ کمار گندھرو اور وشنو دگمبر پلسکر اور پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کے بھجن، سنتور، سرود اور ستار۔ کیا چھت کیا دیوار۔ سچ ہے کچھ دریچے نہ ہوں تو اس فضا میں آدمی کا دم گھٹ جائے۔ بعضے ایسے کام دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں کہ شیخ سعدی کی اطلاع کے مطابق دمشق کی قحط سالی میں یاروں نے عشق کے سبق بھلا دیے لیکن ایک وقت میں ایک کام بس مشین کرتی ہے۔ آدمی نہیں۔ یوں اب سائنسی آدمی نے اپنے نمونے کی مشین بھی بنا ڈالی ہے جس میں بہت سارے ہاتھ اُگ آئے ہیں اور بیک وقت بہت سا اَلم غلم سمیٹ لیتے ہیں۔

شہر دلّی کہ بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کا مرکز ہے اس آدمی کے لیے بہت مشکلیں پیدا کرتا ہے جو صرف دماغ سے نہ سوچتا ہو۔ جو ایک ساتھ ہزار لمحوں میں جیتا ہو اور جس کے حواس ایک پل میں کئی سمتوں کے سفر کی طلب رکھتے ہوں۔ ذوالفقار تابش نے بھی ایک روز نظام الدین کا قصد کیا، اگلے دن مہرولی کا جہاں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ محوِ خواب ہیں، یا شاید جاگ رہے ہیں کہ حاضری دینے والوں کا تانتا صدیوں سے بندھا ہوا ہے۔

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے فیضؔ نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں یہ رانجھا بھی یہ انشا بھی
فرہاد بھی جو ایک نہر سی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

ابن انشا کی موت پر اپنے مضمون کا خاتمہ ذوالفقار تابش نے انشاجی کے انہی شعروں پر کیا ہے۔ میں نے کہا، ''بھائی اپنے بھی کچھ شعر سناؤ۔'' بس یہ دو شعر:

ہمارے شہر میں آنے کی صورت چاہتی ہیں
ہوائیں باریابی کی اجازت چاہتی ہیں
بہت سے خواب ان میں دھند بن کر رہ گئے ہیں
یہ آنکھیں اذنِ گریہ کی اجازت چاہتی ہیں

جامعہ ملیہ کے آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں صادقین کی نمائش اور کچھ مصور دوستوں کی ملاقات سے نمٹ کر انھوں نے ارادہ باندھا کہ ایک دن آرٹ گیلریز کی سیر بھی ہو جائے۔ اپنے اشعار کی کتاب لب لرزاں کی کتاب کا سرورق خود ذوالفقار تابش نے بنایا ہے اور کیا خوب بنایا ہے۔ اس کتاب کے ایک صفحے پر یہ شعر بھی لکھے ہوئے ہیں:

خواہشوں کی بدنمائی کی سزا اپنی جگہ
اپنے شر کے بھید کا لیکن مزا اپنی جگہ
اس مسافت میں مجھے آئینہ رو کیا کیا ملے
دلکشی ان کی بجا، چہرہ ترا اپنی جگہ
ایک خوفِ خواب کا منظر نگاہوں میں رواں
شہر والوں کے لیے میری دعا اپنی جگہ
چار جانب خامشی کی بیکراں سناٹیں
ان لہو بستہ لبوں کی اک صدا اپنی جگہ
کس نے لکھی ہے در و دیوار پر رودادِ شہر
خوشنما اوراق پر حرف سیہ اپنی جگہ

جوش — کچھ یادیں، کچھ باتیں

اپنے آپ کو ''جوش مرحوم'' تو وہ ایک زمانے سے لکھتے آئے تھے، آخر ماہ فروری کی ایک صبح نے ان کے اس گمان پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

دلّی کے ایک اخبار نے سرخی جمائی: ''ایک آتش فشاں ٹھنڈا ہو گیا۔'' مگر مجھے تو یہی خیال آتا ہے کہ جوش صاحب جس جوالا مکھی کی مثال تھے، وہ کب کا سرد ہو چکا تھا۔ ان کے آخری چند برسوں کی باتیں اور شعر، دونوں اسی المیے کا اعتراف ہیں۔ جوش صاحب نے یہ اعتراف جن لفظوں میں کیا ہے وہ غصے سے زیادہ ایک جانکاہ درد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس درد میں گہرائی بھی ہے اور شدت بھی، مگر اس شدت کا نشانہ جوش صاحب کے مخاطبین سے زیادہ خود ان کی اپنی ذات ہے۔ عرصہ ہوا جوش صاحب نے لکھا تھا: ''میں ٹوٹ تو سکتا ہوں، لچک نہیں سکتا۔'' اور واقعہ بھی یہی ہے کہ پچھلے کچھ برس جوش صاحب کی زندگی کا جو قصہ سناتے ہیں، یہی بتاتے ہیں کہ:

یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

بیماری، ناداری، مخالفتوں کی گرم بازاری اور ملامتوں کی سنگ باری نے اسے زندگی سے انجام کار بیزار کر دیا تھا جس نے ہمیشہ قوت و حیات کی قسم کھائی۔ اس میں کچھ قصور جوش صاحب کا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر بند باندھنے کے قائل تھے نہ زبان پر، مگر اس سے زیادہ قصوروار بلکہ مجرم وہ لوگ ہیں جن کی بے چہرگی جوش صاحب کی پہچان اور ان کی انفرادیت کے نشان کو محض اپنی کوتاہ بینی کے سبب برداشت نہ کر سکی۔ جوش صاحب کے خلاف سارا ہنگامہ اسی بہانے کھڑا کیا گیا تھا کہ انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں چند ایسی باتیں کہی تھیں جو ان کے معاشرے کی عام فکر یا بے فکری سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ لیکن ان کے معترضین نے یہ بات بھلا دی کہ جوش صاحب کے جیتے جی اس انٹرویو کی اشاعت ایک سوچی سمجھی عہد شکنی اور شرارت تھی۔ وہ مقہور و

معتوب انٹرویو جوش صاحب نے اسی شرط پر دیا تھا کہ اسے جوش صاحب کے بعد منظر عام پر لایا جائے گا۔ منافقت کا طوق دراصل کس کی گردن میں دکھائی دیتا ہے۔ اب یہ جاننے کے لیے کسی محقق کی خدمات درکار نہ ہوں گی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اقتدار کے جو مقربین اس جرم کے مرتکب ہوئے ان میں بعض ادیب بھی شامل تھے۔

میں جوش صاحب کا کچھ ایسا شیدائی نہیں، مگر یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی شاعری اپنے تمام تر حدود کے باوجود ہماری ادبی تاریخ کا ایک مستقل اور محفوظ حصہ ہے۔ یہ شاعری دو چار برس کا قصہ نہیں۔ ایک طویل ہنگامہ خیز اور انتشار آمیز دور کا آئینہ خانہ ہے۔ جوش صاحب کے اشعار کی پہلی کتاب غالباً ۱۹۲۱ء میں چھپی تھی۔ جب سے اب تک ہماری زندگی کے اسالیب، ہمارا طرز احساس، ہمارے ذہنی اور تخلیقی رویے بہت کچھ بدلے، مگر جوش صاحب کا نام ہماری روایت اور تاریخ دونوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش صاحب کے استثنا کے ساتھ، ابھی کوئی دوسرا شاعر کمال کے اس مرتبے تک نہیں پہنچا ہے جسے ہم عظمت کی قبا پہنا سکیں۔ ویسے تو لفظ ''عظیم'' اور ''عظمت'' دونوں کثرتِ استعمال کے سبب آج بے حرمت دکھائی دیتے ہیں۔ جوش صاحب کے موضوعات کی کثرت اور ان کے بظاہر جذبہ فروش افکار کی بوقلمونی سے قطع نظر اگر صرف ان کی قادر الکلامی ہی کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے اس میدان میں یہ عہد ان کا کوئی ثانی نہ تلاش کرسکا۔ رہی جذبہ فروشی کی بات تو اس سے اپنی تمام تر فکری برگزیدگی اور عظمت آثاری کے باوجود خود اقبال کی شاعری بھی یکسر آزاد نہ رہ سکی ورنہ اس آسانی سے متاعِ عام نہ بنتی۔ فکر سوچ سمجھ کر اپنے گاہک ڈھونڈتی ہے۔ جذبہ بے مول بھی بک جاتا ہے۔ پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہر ماحول کے کچھ اپنے مطالبے ہوتے ہیں اور ہر زمانے کا اپنا جبر۔ جوش صاحب کی شاعری نے جس ذہنی اور سماجی ماحول میں آنکھیں کھولیں، اس کے بنیادی مسائل کا کچھ حل شاید جذبات کے علاقوں میں قدم رکھے بغیر ہاتھ آنا مشکل تھا۔

جوش صاحب نے غلام ہندوستان میں ''شکستِ زنداں کا خواب'' دیکھا تھا۔ پھر ان کی نظر تعصب، تنگ نظری، فرقہ واریت، استحصال، عقل دشمنی، احیاء پرستی کے ان زندانوں پر گئی جو

بظاہر آزاد انسانوں کی زندگی کو بھی زہر آلود کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ آدمی کے رجز خواں بھی بنے، اس کے نوحہ گر بھی۔ انھوں نے انسان اور اس کی کائنات کے حسن کا قصیدہ بھی لکھا اور ان بدصورتیوں کا ماتم بھی کیا جن سے ہماری فکر، تاریخ اور معاشرہ داغدار ہے۔ شعری اقدار کی میزان پر ان کا یہ رجز یا نغمہ یا نوحہ یا ہجو کیا قیمت و قوت رکھتا ہے، اس بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ رد و قبول کا یہ سلسلہ جوش صاحب کی شاعری کے ابتدائی دور میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ آگے بھی جاری رہے گا، مگر جو بات کبھی بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی، وہ اس شاعری کا غیر معمولی تاریخی رول، اس کی اپنی انفرادیت اور اہمیت ہے۔ جوش صاحب کے بغیر ہماری ادبی روایت اور تاریخ ہرگز وہ کچھ نہ ہوتی جیسی کہ آج ہے۔

جوش صاحب کے آخری اشعار، جو ہم تک پہنچے تھے، ان پر مجھے کبھی ایک دلدوز چیخ کا گمان ہوتا ہے، یا ایک خود کلامی کا۔ یہ اشعار ان کے انسانی سروکار اور ان کی حالت دشوار، دونوں کی گواہی دیتے ہیں:

خداوندا سفر دشوار رکھا جائے گا کب تک
مرے جادے کو ناہموار رکھا جائے گا کب تک
اس انساں کو جو زنجیر دو عالم توڑ بیٹھا ہے
میانِ سبحہ و زُنار رکھا جائے گا کب تک
مجھے ان جاہلان و سوقیانِ سفلہ پرور میں
خداوندا ذلیل و خوار رکھا جائے گا کب تک
خدایا اِن سماعت مردہ مادر زاد بہروں میں
مجھے شرمندۂ گفتار رکھا جائے گا کب تک

''یادوں کی برات'' میں جوش صاحب نے اس خود کلامی کا پس منظر یوں بیان کیا ہے کہ:

''اپنی اس آخری زندگی کا حال کیا بتاؤں۔ جان کی امان پاؤں تو زبان ہلاؤں۔ اللہ اللہ یہ آب و ہوا کی ناسازگاری، یہ کراچی کی علم بیزاری، یہ پرانی یادوں کی کٹاریاں۔ یہ نئے ماحول کی آریاں، یہ مولد و منشا سے دوری، یہ غربت کی رنجوری۔ سینے میں یہ کھٹکتی پھانسیں، یہ حالات کی اکھڑی سانسیں، یہ دل پر چلتے بان، یہ سر پر کڑکتی کمان۔ یہ اخباروں کی ریشہ دوانیاں، یہ حکومت

کی سرگرانیاں، یہ دوستوں کا فقدان، یہ معاشی بحران، اور یہ چہرۂ زندگی پر گرد و غبار کا غازہ، اور یہ دوش پر عزتِ نفس کا جنازہ۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو خون تھوک تھوک کر مر چکا ہوتا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ میں اب بھی جی رہا ہوں اور فقط جی ہی نہیں رہا ہوں، آلامِ حیات پر مسکرا بھی رہا ہوں۔ ان دردمندیوں کے گرداب میں لوہے کا جگر درکار ہے، بحمد للہ کہ میرا جگر لوہے کا ہے:

تھوڑی سی زندگی تھی بہر حال کٹ گئی
تم کو جو ہم پہ رحم نہ آیا تو کیا ہوا

بہر حال، زمانہ کہ سب منصفوں کا منصف ہے اپنے آخری محاسبے میں اس "تھوڑی سی زندگی" کو اپنے دامن میں محفوظ رکھے گا، مگر وہ جو اپنے حال سے بے خبر ہیں، زمانے کو بھلا کیا سمجھیں گے۔

فراق صاحب

یادیں، یادیں، یادیں ...

اس ہجوم میں ایک منظر ابھرتا ہے—

تمولیوں کی دکانیں کہیں کہیں میں کھلی

کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر

سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں

کھڑا ہے اوس میں چپ چاپ ہرسنگھار کا پیڑ

دلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل

یہ موج نور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات

کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول

یہ اک اور منظر:

یہ محوخواب ہیں رنگین مچھلیاں تہہ آب

کہ حوض صحن میں اب ان کی چشمکیں بھی نہیں

یہ سرنگوں ہیں سر شاخ پھول گڑہل کے

کہ جیسے بے بجھے انگارے ٹھنڈے پڑ جائیں

یہ چاندنی ہے کہ امڈا ہوا ہے رس ساگر

اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں

یہ منظر الہ آباد یونیورسٹی کیمپس میں واقع ایک مکان کا ہے۔ ۸/۵ بینک روڈ، اور وہ دکھی آدمی اسی مکان میں رہتا تھا۔ چند روز قبل اسی آدمی نے دلّی کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں آخری سانسیں لیں۔ پھر اسے اسی مکان میں لے جایا گیا جس کے سبزہ زار پر ہرسنگھار کا پیڑ تھا اور گڑہل

کے پھول۔ بے بجھے انگارے۔ اب تو یہ انگارے بھی راکھ بن کر گنگا اور جمنا کے سنگم پر بکھر چکے ہیں! برسوں پہلے ہار سنگھار کا وہ پیڑ سوکھ گیا تھا. گڑہل کے پھول مرجھا گئے تھے اور فراق صاحب نے رنگین مچھلیوں کے لیے جو چھوٹا سا حوض بنوایا تھا. وہ پاٹ دیا گیا تھا۔ اس کی جگہ انھوں نے ایک جھونپڑی ڈلوالی تھی۔ پاس ہی آنولے کے دو پیڑ تھے. ان کے سائے میں ایک پلنگ بچھا رہتا. ارد گرد چند مونڈھے اور کرسیاں۔ فراق صاحب کے شب و روز بیشتر وہیں گزرتے تھے۔ دیواروں میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ یہاں تک کہ دروازوں پر پردے نہ لگانے کا ایک فلسفہ بھی انھوں نے تلاش کرلیا تھا۔ کھلا آسمان. کھلی ہوئی فضا اور تازہ ہوا کے جھونکے۔ گرمیوں میں ایک ساتھ دو دو تین تین پنکھے چلتے رہتے۔ کڑاکے کی سردیوں میں سر سے پیر تک لحاف پھیلانے کے بعد ان کا ملازم پوری رفتار سے سیلنگ فین چلا دیتا تھا۔ گھٹن، گھٹن، گھٹن کے اتنے شدید احساس سے میں نے کم لوگوں کو دو چار پایا ہے۔ پچھلے پہر سے پہلے فراق صاحب کو نیند کم ہی آتی تھی۔ رات گئے تک پریاگ اسٹیشن کی طرف جانے والے اکے. تانگے اور رکشے بینک روڈ سے گزرتے رہتے۔ ان کی گھنٹیوں یا گھنگھروؤں کی آواز میں رہ رہ کر سناٹے کے پر کترنے لگتیں۔ سکوت کے وقفوں میں فراق صاحب کی خود کلامیاں اور اگر اتفاق سے دیر گئے تک کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو ان کی گونجیلی بھاری آواز۔ جیسے جیسے رات گزرتی جاتی اس آواز میں کھرج کی سی کیفیت پیدا ہوتی جاتی۔

اور صبح سویرے، اس سے پہلے کہ پرندے جاگتے. فراق صاحب اٹھ بیٹھتے تھے۔ "چائے لاؤ!" کم خوابی سے بوجھل آواز میں وہ ملازم کو پکارتے۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا کہ یہ آواز دور دور تک پھیلے ہوئے ماحول کو خطاب کر رہی ہے۔ پھر ان کا دن لگ بھگ سارے کا سارا باتوں میں کٹتا تھا۔ کبھی کبھار میں ٹوکتا: "فراق صاحب! آپ کب سے باتیں کر رہے ہیں، تھک گئے ہوں گے. ذرا دم لیجیے!" مگر ایسے مشورے فراق صاحب کو کبھی اچھے نہ لگے۔ کبھی چڑ جاتے. کبھی اداسی سے کہتے: "بھائی باتیں کیا، دماغ سانس لیتا رہتا ہے!"

فراق صاحب کو بس ذہین کہہ دینا ذہانت کی عزت بڑھانا ہو تو ہو، فراق صاحب کی توہین ہے۔ ذہانت نے فراق صاحب کی ذات میں ایک نیا مفہوم پایا تھا۔ میں نے علم و فکر کے شعبوں میں بہت ذہین لوگ دیکھے ہیں، مگر فراق صاحب کی ذہانت ایک انوکھا تجربہ تھی۔ اس تجربے

کے محور پر شوخی، طنز، ملال اور متانت، جلال اور افسردگی، تلخی اور ظرافت، خلاقی اور تخیل کی جست کے ہزار ہا نقش یکجا ہو گئے تھے۔ عالم فاضل لوگ بہت دور کی کوڑیاں لانے اور سیدھی سادی سچائی کو پیچیدہ کر دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ فراق صاحب مشکل سے مشکل موضوع اور مسئلے کو بھی جس زبان اور لہجے میں بیان کرتے تھے اس کا روپ سروپ بدل جاتا تھا اور عقل کیا، سارے حواس کو آئینہ دکھاتا تھا۔ لفظوں کا ایسا جادوگر زمانے کی آنکھ نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہ جادو شام کے سرمئی جھٹپٹے اور رات کے مہیب سکوت میں پوری کائنات کو مسخر کرتا نظر آتا تھا۔ ایک بار فراق صاحب سے یہ شعر سن کر کہ:

اب اکثر چپ چپ سے رہیں ہیں یونہی کبھو لب کھولیں ہیں
پہلے فراق کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولیں ہیں

مجھے خیال آیا کہ وہ ان گنت باتیں جو اظہار کے ایک کبھی نہ ٹوٹنے والے سلسلے میں جگہ نہ پا سکیں اگر تمام کی تمام سامنے آتیں تو اسرار اور حقیقتوں اور خوابوں اور سرابوں کی کیسی کیسی دنیاؤں کے چہرے پر سے پردہ اٹھاتیں۔ فراق صاحب کی لازوال شاعری اور بے مثال نثر تو بس اس کا عشر عشیر ہی لفظوں میں اسیر کر سکی ہے۔

ادھر بیماری اور صحت کی خرابی نے برسوں سے فراق صاحب کو نڈھال کر رکھا تھا۔ فراق صاحب کی ذاتی محرومیوں اور پریشان حالیوں کا ذکر دوسروں سے زیادہ خود فراق صاحب نے کیا ہے۔ ان کا کچھ احساس حقیقت کی بنیادوں پر قائم تھا۔ کچھ اس افسانے کا زائیدہ جسے فراق صاحب کی طباعی نے ڈھالا پھر ایک نیم فلسفیانہ جذباتی استدلال کی مدد سے اسے حقیقت بنا ڈالا۔ فراق صاحب کی کمزوریاں ایک جینیس کی کمزوریاں تھیں۔ انھیں جھٹلانے کا مطلب اردو کے معاصر معاشرے کی سب سے انوکھی، پرکشش، زندہ و تابندہ شخصیت کے بعض ناگزیر عناصر سے آنکھیں پھیر لینا ہوگا۔ فراق صاحب ان غیر معمولی انسانوں میں تھے جن کی بڑائی شخصیت کے اکا دکا کمزور یا ٹیڑھے ترچھے عناصر کو سہارنے کی قوت رکھتی ہے اور اپنے تضادات سے مسخ یا مغلوب نہیں ہوتی۔

عجیب بات ہے کہ مسلسل بیماریوں، تنہائیوں اور اپنی صحت کی طرف سے لاپروائیوں کے باوجود فراق صاحب کے ذہن کی جودت اور تخیل کی رفعت، جذبوں کا وفور اور فکر کی وسعت جوں

کی توں برقرار رہی۔ اس عالم میں بھی ان کی گفتگو کبھی کبھی لطیفوں اور قہقہوں کا ایک اٹوٹ سلسلہ بن جاتی تھی۔ پچھلی جولائی میں ایک دن کے لیے الہ آباد جانا ہوا تو یونیورسٹی کے کاموں سے چھٹکارا پاتے ہی فراق صاحب کے گھر پہنچا۔ سبزہ زار میں آنولے کے درختوں کے نیچے ان کا بستر بچھا ہوا تھا۔ سبزہ مرجھایا ہوا، پودے سرنگوں اور چاروں طرف ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہوئے مرجھائے زرد پتے۔ اور اسی ماحول کے بیچ وہ نیم مفلوج دکھی آدمی — اک آدمی ہے کہ اتنا دکھی ہے دنیا میں۔ مگر وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ مجھے احساس کی تختی پر خوف کی ایک لکیر کھنچتی ہوئی دکھائی دی۔ مگر یہ ڈر کب تھا کہ دکھوں اور قہقہوں سے بٹی ہوئی یہ ڈور بس چند مہینوں کے اندر اندر ٹوٹ جائے گی۔ کوئی بیس برس پہلے فراق صاحب نے کہا تھا:

تھی اک اچٹتی ہوئی نیند زندگی اس کی
فراق کو نہ جگاؤ بہت اندھیرا ہے

سچ مچ بہت اندھیرا ہے کہ اس کا دامن اس روشنی سے خالی ہو چکا ہے۔

اب اور کس قیامت کا انتظار ہے؟

صاحبو! مارچ ۱۹۸۲ء کا دسواں دن آیا اور گزر گیا۔ لوگ نہ جانے کب سے اس دن کے منتظر تھے۔ نجومیوں نے بتایا تھا کہ یہ دن ہم سب کے لیے آخری دن بھی ہو سکتا ہے۔ یوم حساب، اخباروں میں طرح طرح کی باتیں چھپیں۔ بھانت بھانت کے لطیفے۔ ایک خبر یہ ملی کہ کوئی صاحب، جو اپنے دوست کے مقروض تھے، انھوں نے قرض کی ادائگی کا کام دس مارچ کے بعد کی کسی تاریخ کے لیے چھوڑ دیا۔ شاید وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ قیامت آئے گی تو ان کے دوست کو ساتھ لے جائے گی۔ نہ تو نادہند کہلائیں گے، نہ اپنے آپ سے شرمائیں گے۔

اسی روز شام کو سڑک پر ایک صاحب ملے۔ کہنے لگے آج بدیس سے ایک مہمان آنے والے تھے۔ مگر وہ ملک کہ ہوشمندوں کا ہے، آج کے لیے اس نے اپنی ساری فلائٹیں مسترد کر دیں۔ مجھے یقین نہ آیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ ان کی بات درست تھی۔ ضعیف الاعتقادی اب مردِ مومن کے کردار کا لازمی حصہ بھی بن چکی ہے۔

میدان میں کچھ بچے دکھائی دیے۔ میں نے پوچھا "یہاں کیا کر رہے ہو؟" جواب ملا — بس ابھی ابھی سیارے ایک لائن میں آئیں گے، ٹکرائیں گے اور ہم سب کے سب ایک ساتھ ختم ہو جائیں گے۔ بچوں کے لیے اجتماعی موت کا تصور ایک تفریح بن گیا تھا۔

مگر چاند نکلنے کے دو ڈھائی گھنٹے کے بعد میں نے آسمان پر نگاہ کی تو دو سیارے دکھائی دیے۔ چاند سے ذرا نیچے۔ ایک کچھ لال لال سا۔ دوسرا بہت چمکیلا۔ نہ کسی نے کسی کو کھینچا، نہ کوئی کسی سے ٹکرایا۔ سیارے اپنی روز کی آن بان کے ساتھ آسمان پر چمکتے رہے۔ فطرت کا نظام جوں کا توں قائم رہا۔ سچ ہے، فطرت مہربان بھی ہے اور منظم بھی۔ سبھی سیارے اور ستارے جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل پیرا ہیں اور آدم زادوں کے حال پر خندہ زن۔

روز قیامت کا انتظار — جب پہاڑ روئی کے گالوں کی صورت بکھر جائیں گے، سمندر ابل پڑیں گے۔ شجر حجر، آدمی اور جانور سب کے سب ایک اندھی تباہی کی زد پر ہوں گے۔ کسی کو کسی کی خبر نہ ہوگی۔ کوئی کسی کو نہ پہچانے گا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ رشتے مفلوج ہو جائیں گے، حواس معطل اور خدا جانے کیا کیا ہوگا۔ میری حیرانی بار بار مجھ سے پوچھتی ہے: "یہ انتظار کیوں ہے؟"

قیامت تو کب کی آچکی۔ علامہ اقبال بہت پہلے کہہ چکے ہیں:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

مگر حقیقت کیا ہے؟ دفتروں میں کام کم ہوتا ہے، باتیں زیادہ۔ سنجے گاندھی کا نعرہ کہیں شور شرابے میں گم ہو گیا۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، گھروں، محلوں، بستیوں دیہاتوں، شہروں، ملوں، کارخانوں، جدھر دیکھو ایک سا حال ہے۔ زندگی نڈھال ہے۔ ہر خواب پامال ہے۔ ہر مشغلہ جان کا جنجال ہے۔ طلبا پڑھنا نہیں چاہتے۔ اساتذہ پڑھانے کو سزا جانتے ہیں۔ مزدور کام کرنے سے گریزاں۔ سرمایہ اُجرت دینے کے تصور سے پریشاں۔ ہڑتالیں، تالہ بندیاں، ہنگامے، جلوس، توڑ پھوڑ، چوریاں، ڈکیتیاں، قتل اور خون ریزیاں۔ آدمی میں جتنی انرجی اور قوت ہے اپنا اظہار چاہتی ہے۔ یہ اظہار کن سمتوں میں ہو رہا ہے، بتانے کی ضرورت نہیں۔ اخبار وہ اعمال نامہ ہے جو ہر صبح سامنے آتا ہے اور خدا کے نیک بندوں کو آئینہ دکھاتا ہے، مگر لوگ اب تک اپنے آپ سے ڈرنا سیکھ نہ سکے۔

جو اپنے آپ سے نہیں ڈرتا کسی اور سے کیا ڈرے گا؟

اور اس معاملے میں سب سے آگے آدم زادوں کی جو قبیل اینڈتی اکڑتی، مسرور، شاد ماں دکھائی دیتی ہے، سیاست دانوں کی ہے۔ وہ مال مست ہیں، کھال مست ہیں اور حال مست ہیں۔ کامیابیوں کے جتنے گر کتابوں میں بتائے گئے ہیں، سیاست دانوں کی ہنر مندی کے آگے ہیچ۔

آج کامیابی کا معیار کیا ہے؟ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ منافع۔ بینکوں کی ڈکیتی اور ڈاک خانوں کی لوٹ میں جو کچھ ہاتھ آتا ہے، وہ چھپ بھی سکتا ہے کہ لاقانونیت کے ماحول

میں بھی قانون کتابوں میں سسک رہے ہیں، کبھی کبھار اُچھل پڑتے ہیں اور کسی کی گردن دبوچ لیتے ہیں۔

مگر اس طرح کی کامیابی جو ہر قہر سے محفوظ ہے، ہر اعتبار سے مامون، صرف سیاست ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے ایک دوست نے ایک ممتاز انگریزی روزنامے میں سیاست اور کالا دھن کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ راجیہ سبھا میں سوالات ہوئے۔ اہل سیاست کی عزت نفس اور ہمارے قومی وقار کو چوٹ پہنچی تھی۔ پھر سب کچھ ٹائیں ٹائیں فش۔ وہ رہنما جو چھوٹے سیاستدانوں سے زیادہ اخلاقی جرأت رکھتے تھے، کھلے بندوں یہ کہتے پھرتے تھے کہ کرپشن کہاں نہیں ہے؟ کس ملک میں نہیں ہے؟ کون سی سیاسی جماعت اسمگلروں، ذخیرہ اندوزوں، بلیک مارکیٹیوں سے ساز باز نہیں کرتی؟ پس کرپشن کو چپ چاپ ایک مقدر کے طور پر قبول کر لینا چاہیے۔

چند دن ہوئے، دلّی میں ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس تھی یا ورکشاپ۔ شاید شاپ کا لفظ ساتھ لگانا بہتر ہوگا کہ اب علم و ادب سب ہی تجارت کی منڈیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ اس ورکشاپ کی خبر کسی کو نہ ہو سکی، سوائے ان کے جو انہی خبروں میں سانس لیتے ہیں اور چین کرتے ہیں، دکانیں لگاتے ہیں اور علم و ادب کی خدمت کا دم بھرتے ہیں۔

پاکستان سے خالدہ اصغر آئی ہوئی تھیں۔ ملاقات ہوئی تو کہنے لگیں: ”واقعی عجیب بات ہے۔ ہم نے سوچا تھا اردو کے بہت سے ادیب ملیں گے، کوئی نہ آیا۔ قرۃ العین حیدر سے ملنے کی بہت تمنا تھی۔ وہ بھی نہ آئیں۔“ ہم یہ سن کر نہ حیران ہوئے نہ عبرت پکڑی۔ افسانے پر ایفرو ایشین ادیبوں کا اجتماع اور ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادیبوں میں سب سے ممتاز ادیب، بس یہی نا کہ اس کے اظہار کا وسیلہ غریب اردو ہے، یہ اجتماع اس کے بغیر ہو گیا۔ چلیے کچھ سیر تفریح، کچھ خریداریاں، کچھ پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی وساطت سے خود نمائیاں اور پھر ایک خود فریبی کہ ادب کی خدمت ہو گئی۔

بعض ادیبوں نے کہا، یہ سرکاری تماشہ تھا، اور اب ایسا ہر تماشہ چپ چپاتے ہوتا ہے۔ آخر یہ ڈور کن ہاتھوں سے نکل کر کہاں پہنچ گئی، کسی کو خبر نہ ہوئی۔

تو صاحبو! سچ ہے، کرپشن زندگی کا اسلوب ہے، سیاست اور ادب، علم اور فکر، تجارت و

صنعت، کون سا شعبہ ہے جہاں یہ جادو نہیں چلتا۔

جی ہاں، ہر جگہ چلتا ہے، سوائے ایک جگہ کے۔ یہ ایک الگ کائنات ہے۔ ایک الگ نظام۔ انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اب یہ نظام اور کائنات بھی اس کے حوصلوں کا تابع ہوتا جا رہا ہے، مگر جھوٹ!

فطرت آج بھی بے ریا ہے اور اس کا نظم و نسق اسی طرح قائم و دائم کہ اس کی باگ ڈور کرپشن زدہ مخلوق کی دسترس سے ابھی محفوظ ہے۔

مارچ کا دسواں دن بھی آیا اور چلا گیا۔ ہر دن کی طرح۔ نہ ستارے ٹکرائے نہ دنیا تباہ ہوئی۔ مگر دنیا تو کب سے تباہ ہو رہی ہے اور قیامت کب کی آچکی ہے اب اور کس قیامت کا انتظار ہے، اور کیوں؟

ڈی۔ایل۔آر۔7710

ڈی ایل آر سات سات ایک صفر! شہر دلی کے ۲۰ ہزار آٹو رکشاؤں میں سے یہ ایک کار جسٹریشن نمبر ہے۔

اس بستی میں سانس لیتے مدتیں گزریں. کسی ٹیکسی یا رکشا کا نمبر یاد رہا نہ اس کے چلانے والے کا چہرہ۔ اور کیوں یاد رہتا؟ اس طرح کے چہرے بس ایک عام علامت ہوتے ہیں۔ اس وقت اگر یاد بھی آرہا ہے تو اس آٹو ڈرائیور کا چہرہ. جس کی سواری کا کرایہ بتانے والا میٹر وقفے وقفے سے لٹو کی طرح ناچنے لگتا تھا اور جس نے سات روپوں کی جگہ سترہ روپے وصول کرنا چاہے تھے۔ یا پھر اس ڈرائیور کا چہرہ. جس نے صبح سویرے پالم جانے کی شرط یہ رکھی تھی کہ دوگنا کرایہ وصول کرے گا۔ چونکہ اس وقت کوئی اور تھری وہیلر نظر نہ آتا تھا اس لیے اس ڈرائیور کو بالآخر ایک پولس والے کی مدد سے آمادہ کرنا پڑا تھا۔ ویسے یہ دونوں چہرے بھی علامت تھے ٹیکسی یا رکشا والوں کے عام رویے کی۔

مگر ڈی ایل آر سات سات ایک صفر. یہ نمبر ہمیشہ کے لیے حافظے کی تختی پر ثبت ہو گئے کہ انھی کے واسطے سے وہ بزرگ ملا جس نے اپنا نام لکشمن داس بتایا تھا۔ ہمیں پرگتی میدان تک جانا تھا۔ سڑک کے کنارے بس ایک تھری وہیلر۔ ڈی ٹی سی کی بس کا دور دور تک نام نشان نہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ. عمر کوئی ساٹھ برس کے لگ بھگ آنکھوں پر موٹا چشمہ. سر پر کھدر کی ٹوپی اور کوٹ پاجامے میں ملبوس مشکیزہ نما تھیلی ہاتھ میں بھرے چلے آرہے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر اس بزرگ نے. بہت نرمی سے کہا: "ہم ذرا پانی لینے چلے گئے تھے. آپ کو کہیں جانا ہے؟"

"ہاں! پرگتی میدان۔"

"اچھا تو بیٹھو۔ پانی پیو گے؟"

''پانی؟''

''ہاں پانی! سب مسافروں کے لیے پانی۔ پولس والوں کے لیے پانی۔ جو بھی پیاسا ہو اس کے لیے پانی۔ رکشہ چلاتے ہیں۔ مسافروں کو پانی بھی پلاتے ہیں۔ آؤ! آؤ!!''

یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ ہم اس بزرگ کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ پھر ایسا لگتا تھا کہ رفتار کی ایک حد مقرر کر لی ہے۔ سڑک خالی بھی ہوئی تو وہی رفتار قائم۔ اور اس بزرگ کی ڈرائیونگ کیا تھی، ایک چلتی پھرتی درسگاہ تھی۔ کسی دوسری سواری نے اوورٹیک کرنا چاہا۔ بزرگ نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالی، دوسرے سے اشاروں میں ایسی بے صبری سے باز رہنے کی تلقین۔ سامنے سے کسی نے غلط جگہ سے سڑک پار کرنے کی کوشش کی۔ مرد بزرگ کا دایاں یا بایاں ہاتھ پھر باہر ہوا میں لہرایا اور اشاروں اشاروں میں ایک لیکچر جھاڑ دیا۔ کسی چھوٹے موٹے موڑ پر ٹیکسی یا کار کے کسی ڈرائیور نے ذرا جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور مردِ بزرگ نے یا تو شفقت سے ڈانٹ پلا دی یا پھر اشاروں میں سمجھایا— ''اب ایسی غلطی نہ کرنا!'' آس پاس سے گزرنے والے ہر رکشہ ڈرائیور سے ''رام رام!'' یا پھر گزرتے ہوئے کسی ڈرائیور کی پکار۔ ''چاچا! سلام! رام رام!''

میری حیرانی نے اُکسایا۔ ''کیوں صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟''

مردِ بزرگ نے کہا ''نام کیا بتاؤں۔۔۔ رام رام والے کا اسکوٹر، پانی والا اسکوٹر، چاچا کا اسکوٹر۔ ویسے نام تو لکشمن داس ہے۔ پہاڑ گنج کا رہنے والا ہوں۔''

سندر نگر شاپنگ کمپلیکس کے قریب ایک مزدور عورت نے آتی جاتی سواریوں کی پروا کیے بغیر اپنے دو بچوں کے ساتھ سڑک پار کرنی چاہی۔ مردِ بزرگ نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ تاسف کے انداز میں سر ہلایا۔ چیخ کر کہا ''جلدی! جلدی! سب جلدی میں ہیں!''

یہ شاید صنعتی کلچر کی دیوانہ وار بھاگ دوڑ پر مردِ بزرگ کا تبصرہ تھا۔

کیا مجال کہ کوئی بھی شخص، عام ٹیکسی یا رکشا ڈرائیور ہو کہ منجملۂ خواص موٹر سوار اس مردِ بزرگ کے ایک تنبیہ آمیز جملے یا اشارے کی زد میں آئے بغیر ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتا ہوا سامنے سے گزر جائے۔

منزل پر پہنچ کر بزرگ نے گاڑی کا انجن بند کیا۔ کوٹ کی جیب سے ایک آئینہ نکلا۔ مڑ کر

آئینے میں کرایہ بتانے والے میٹر کے ہندسوں پر نظر ڈالی پھر بے نیازی سے آئینہ جیب میں رکھ لیا۔۔" آٹھ روپے! چیک کرنا ہو تو یہ چارٹ سامنے ٹنگا ہوا ہے!" بزرگ نے سادگی سے کہا۔

"یہ گاڑی آپ کی اپنی ہے؟"

"ہاں! ہماری کیا؟ سب کچھ اوپر والے کا ہے۔"

"کب سے چلا رہے ہیں؟"

"بیس برس سے۔ پہلے اناج کی دکان لگائی۔ آئے دن چیکنگ ہوتی تھی اور سرکاری کارندے سیمپل لے جایا کرتے تھے۔اب مال ہی ہمیں ملاوٹ والا خراب ملتا ہو تو اپنا کیا دوش۔مگر قانون کا ڈر تھا۔بھگوان کا ڈر الگ۔ہم نے یہ کام ہی چھوڑ دیا۔"

"خوش ہیں؟"

مردِ بزرگ نے آسمان کی سمت نگاہ کی۔تشکر آمیز انداز میں ہاتھ جوڑ دیے"ایک بیٹا پڑھتا ہے۔ایک کے پاس اپنی گاڑی ہوگئی ہے!"

"دلی کے یہ دوسرے بہت سے ٹیکسی والے رکشہ والے آپ جیسے کیوں نہیں ہو جاتے؟ آپ انھیں کبھی سمجھاتے ہیں؟"

"کوئی کسی کو نہیں بدل سکتا رام رام۔آدمی تبھی بدلتا ہے جب دل اندر سے بدلے۔یہ بھی اوپر والے کے ہاتھ میں ہے!" مردِ بزرگ نے پھر آسمان کی سمت نگاہ کی اور تشکر آمیز انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔اوپر صرف بادل تھے اور نیلگوں فضا میں تیر رہے تھے۔

ہو سکتا ہے کہ لاکھوں کی آبادی کے اس مہانگر میں اب لکشمن داس سے دوبارہ ملنا نہ ہو مگر پل دو پل کی یہ ملاقات بھی ایک عجیب تجربہ تھی۔خیال آیا،ایسے ہی انسانوں سے دنیا بنتی ہے اور اس کی اذیتوں کا احساس کم ہوتا ہے۔دھوپ بھرے راستوں پر کسی سایہ دار درخت کی مثال زندگی کے ہر شعبے میں راہ چلتے اچانک کوئی ایسا شخص ملتا ہے جو دنیا سے مایوسی اور بیزاری کے احساس کو چکر دے جاتا ہے۔اپنی خاموش زبان سے کہتا ہے۔۔۔"ابھی کچھ روشنی باقی ہے!"

ڈی ٹی سی کے اوکھلا اسٹاپ پر انکوائری آفس میں کوئی سال بھر پہلے ایک اور مردِ بزرگ بیٹھا کرتا تھا۔اپنے کام میں ہر آن مصروف۔ہر سوال کا خود ہی جواب۔سب کے ساتھ خندہ پیشانی۔ایک روز اس بزرگ نے کہا"آپ لوگ روز روز ۔۔ وں میں جاتے ہیں۔سادہ کاغذ

لائیے ہم ساری بسوں کا وقت لکھائے دیتے ہیں۔ گھر سے صحیح ٹائم پر چلیے۔ اپنی بس مل جائے گی!"

اور ایک شام انکوائری بتانے والے اس مرد بزرگ نے مطلوبہ بس کا وقت بتانے کے بعد کہا "اچھا جی! رام رام! اب کل سے ہم آپ سب کو یہاں نہیں ملیں گے۔ ریٹائرمنٹ۔ آج نوکری کا آخری دن تھا۔" یہ کہتے ہوئے نہ کسی حسرت کا اظہار، نہ پچھتاوے کا۔ کچھ ہی انسان ایسے ہوتے ہیں جو اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ بیشتر کو بس زندگی ہی گزار دیتی ہے۔

وہ بزرگ اس روز کے بعد پھر کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس کا نام جو بھی رہا ہو، وہ بھی لکشمن داس تھا۔

بہتوں کے لیے اور بہتوں کا کیا ذکر خود اپنے ہم پیشہ افراد کے لیے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بزرگ سنکی ٹھہریں۔ بھلا ایسی بھی کیا اصول پرستی؟ مگر سو باتوں کی ایک بات برٹرینڈ رسل نے کہی تھی — "سنکی کہے جانے سے مت ڈرو۔ ہو سکتا ہے تمہارے وہ رویے جو آج سب کو مضحک دکھائی دیتے ہیں کل یہی سچ ٹھہریں!"

آج اور کل کا بھید کیا؟ سچ دائمی ہوتا ہے۔ لکشمن داس کی طرح۔

ایک صفحہ ضمیر کے قیدیوں کے لیے

وہ ضمیر کے قیدی ہیں!

رات کے اندھیرے میں دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ فوجی کارندے آتے ہیں اور انھیں پکڑ لے جاتے ہیں۔

ان کی سزا۔۔۔ قید تنہائی یا کوڑے۔ یا پھر وہ اذیت کدے جنھوں نے شاہ ایران کی خفیہ تنظیم ساواک کے اذیت کدوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ان میں کچھ چپ چاپ مر جاتے ہیں، کچھ اپاہج ہو جاتے ہیں۔

ان میں نوجوان بھی ہیں، بوڑھے بھی، طلبا بھی اور دانشور بھی۔ مزدور بھی اور سیاستداں بھی۔ وکلا بھی ہیں اور ٹریڈ یونینوں کے سیدھے سادے کارکن بھی۔ مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، صحافی بھی ہیں اور شاعر بھی۔

خواتین قیدیوں کے بدن پر جا بجا جلتی سگریٹوں سے داغے جانے کے نتیجے میں درجنوں زخم۔

انھیں چھت سے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے، پاؤں کے تلووں پر مسلسل ضربیں لگائی جاتی ہیں، بجلی کے شاک دیے جاتے ہیں، ناخن کھینچ لیے جاتے ہیں۔

وہ کسی بھی عدالت میں اپنی صفائی نہیں پیش کر سکتے۔ قانون، آئین، انصاف، سب کے سب وہاں جبر کے تابع ہیں۔

ضمیر کے ان قیدیوں میں کچھ قیدی دور دیسوں میں جا بسے۔ حنیف رامے، عباس اطہر، شہرت بخاری۔ کوئی امریکہ میں ہے، کوئی کینیڈا میں، کوئی انگلستان میں۔

شہرت بخاری کی بیوی فرخندہ بخاری کا نام بہتوں کو یاد ہوگا کہ ہائی جیکنگ کے واقعے کے

بعد جن سیاسی قیدیوں کو پاکستان سے باہر بھیجنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، ان میں ایک خاتون قیدی بھی تھی — فرخندہ بخاری۔

ضمیر کے ان قیدیوں میں ہزاروں لاکھوں آج بھی پاکستان میں بستے ہیں۔ اداس اور مضمحل، پرامید اور مشتعل۔ وہ چپ ہیں مگر ان کے سینے کھول رہے ہیں۔ کچھ کہنا چاہیں تو کہہ نہیں سکتے۔ اذیت کدوں میں اب گنجائش نہیں رہ گئی۔ جیل خانے بھرے پڑے ہیں۔ بہت سی حویلیاں اور قلعے زندانوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔

آئے دن وہ سڑکوں پر نکلتے ہیں، پٹتے ہیں اور تتر بتر کر دیے جاتے ہیں۔ کالج، یونیورسٹیاں، کارخانے، بار کاؤنسلیں، ان کے دروازوں پر جبر کا تالہ پڑا ہوا ہے اور دیواروں کے نیچے زندانی آآ کر جمع ہو گئے ہیں۔

ضمیر کے ان قیدیوں کا جرم کیا ہے؟ اظہار و انتخاب کی آزادی کا مطالبہ اور بس۔ انھیں اپنے وطن سے محبت ہے اور ان اصولوں سے جو ان تک اپنے دین اور آئین کی وساطت سے پہنچے تھے۔ جبر کی اطاعت سے انکار، ظلم اور زبردستی کے خلاف احتجاج، جمہوری اقدار کی بحالی اور آمریت سے آزادی کے راستے میں نہ ان کا دین حائل ہوتا ہے نہ انسانیت کا آئین۔

اسلام نے ہر جبر سے آزادی کا سبق دیا تھا۔ ایک حد قائم کر دی گئی تھی۔ ضمیر کی۔

سو، یہ قیدی صرف اپنے ضمیر کے قیدی ہیں اور بیرونی جبر کی دوسری ہر قید سے آزادی کے طلب گار۔

ضمیر یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اگر مٹھی بھر جابر یہ سمجھتے ہیں کہ سوائے ان کے دوسرے تمام لاکھوں کروڑوں انسان ضمیر کی روشنی کھو بیٹھے ہیں تو وہ اختلاف اور احتجاج سے ڈرتے کیوں ہیں!

کھلی عدالتوں میں ضمیر کے ان قیدیوں پر مقدمے کیوں نہیں چلاتے؟

جمہوریت کے آئین کو بحال کیوں نہیں کرتے؟

صحافیوں اور دانشوروں اور ادیبوں کو یہ آزادی کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنے دل کی بات کھلے بندوں کہہ سکیں؟

اذیت کدوں اور جیل خانوں کے دہانے ان کے لیے کیوں کھول رکھے ہیں؟

یہ نظر بندیاں اور گرفتاریاں کس لیے ہیں؟

اسلام نے تو دین کے نام پر بھی جبر سے انکار کی تلقین کی تھی۔ پھر یہ کون سا دین ہے؟

اور کیا کروڑوں انسانوں کے اس دیس میں بس ایک مطلق العنان فوجی حکمراں اور اس کے حواری ہی دیندار ہیں؟

۲۵ مارچ ۱۹۸۲ء کا اخبار۔ ایک چھوٹی سی خبر۔ ۲۵ ہزار اسکولی اساتذہ، جو سیاسی اور اسی نوع کے دوسرے اجتماعات پر پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی پابندی کے مخالف تھے۔ ان پر پیشاور میں آنسو گیس اور بندوقوں کے ذریعہ حملہ کیا گیا۔ ان میں سو گرفتار ہوئے۔ پندرہ زخمی۔

ایسی خبریں اب روز کا معمول بن گئی ہیں۔

کیا اطاعت کی ''راہ سے بھٹکے ہوئے'' ان وطن دوستوں کو دینداری کے سبق اب صرف بندوقوں کے ذریعے دیے جا سکتے ہیں؟ کیا روشنی اور ہدایت کے تمام سرچشمے خشک ہو گئے؟ کیا ہر لفظ کا رشتہ، سوائے جبر کے، اپنے معنی سے ٹوٹ چکا ہے؟

کیا پوری قوم ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور صرف گنتی کے عمالِ اقتدار ہوش مند رہ گئے ہیں؟

جی ہاں! اقتدار ہمیشہ ہوش مند ہوتا ہے اور اس کے ہوش کو ہمیشہ اپنے ضمیر کی غفلتوں سے غذا ملتی ہے۔ یہ انسانی حقوق کی پامالی سے اپنی توانائی حاصل کرتا ہے اور انصاف و اخلاق کی تخریب میں اپنی تعمیر و تحفظ کا سامان پاتا ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے پاکستان پر اپنی رپورٹ شائع کر دی ہے۔ یہ رپورٹ ایک دردناک داستان ہے۔ خاک و خون کے ایک ہولناک تماشے کا مرقع۔

اب سے آگے بھی ایمنسٹی نے اپنی رپورٹیں شائع کی تھیں اور اس کی دریافتوں کو ایک دنیا نے بالآخر سچ جانا تھا۔ شاہِ ایران کے دور کا ایران بھی ان رپورٹوں میں جن تفصیلات کے ساتھ سامنے آیا تھا اسے اور تو اور خود پاکستان کے فوجی حکمراں بھی غلط نہیں ٹھہراتے۔

تو کیا ایران کے بعد پاکستان تک آتے آتے ایمنسٹی نے سچ کا راستہ چھوڑ کر صرف جھوٹ سے مفاہمت کر لی ہے؟

کیا ایمنسٹی نے جن افراد کو ضمیر کے قیدیوں کا لقب دیا ہے، اور جو آج فوجی حکومت کے قیدی ہیں، انھوں نے جبر کی یہ قید محض تفریحاً اختیار کی ہے؟

ضمیر کے ان قیدیوں کا جرم کیا ہے؟

یہ اپنے دیس کو دنیا کے دوسرے مہذب دیسوں کی طرح جمہوری اقدار کا امین دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کی آرزو بس یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے مہذب دیسوں کی طرح ان کے دیس میں بھی انسانی حقوق پامال نہ ہوں۔ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ انھیں اپنے مقدر کے انتخاب کی آزادی میسر آئے۔اور اپنی زندگی کا راستہ یہ اپنے اجتماعی فیصلوں کی روشنی میں طے کرسکیں۔ یہ بس اتنا چاہتے ہیں کہ ان کی آزادیِ اظہار و انکار پر پہرے نہ بٹھائے جائیں۔

یہ خواب ہر مہذب سینے میں جنم لیتا ہے۔جاگتی ہوئی ہر آنکھ یہ خواب دیکھتی ہے۔ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ کھلی فضاؤں میں سانس لے سکے۔

اس خواب کے ہاتھوں اسے کیا کیا اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔اذیت کدے،جیل خانے، املاک کی ضبطی،ذہنی اور جسمانی سزائیں اور،اور،موت!

کتنے موت کے دریا کے اس پار جاچکے اور کتنے موت کے منتظر ہیں کہ کبھی کبھی زندگی کا مفہوم موت ہی کے واسطے سے ہاتھ آتا ہے۔

یہ ضمیر کے قیدی ہیں اس لیے آزادی چاہتے ہیں۔جبر وظلم سے،آمریت سے،اس اقتدار سے جو محض اپنی مرضی سے کروڑوں انسانوں کے مقدر کا مالک بن بیٹھا ہے۔جسے آئین،اخلاق، انسانیت کسی کی تائید حاصل نہیں۔جو عوام کے انتخاب اور اختیار سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔

مگر اسے شاید معلوم نہیں کہ ہر آزادی کا علم انھیں ہاتھوں میں ہوتا ہے جو ضمیر کے قیدی ہوتے ہیں۔

یہ قید بھی آزادی ہے۔اجتماعی آزادی کی پہلی دستک!

ایک اور صفحہ - ہندوستان اور پاکستان کے انسان دوستوں کے لیے

مجھے اعتراف ہے کہ میں ایک جذباتی آدمی ہوں۔ مگر وہ جذبہ جو اخلاقی منطق سے یکسر عاری ہو اس کا احترام میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ معاصر ہفتہ وار "سنڈے" کے ایک حالیہ شمارے (۱۳ر اپریل) میں ہندوستانی دوستوں سے ایک گزارش کے عنوان سے ایک تحریر شائع ہوئی ہے۔ مجھے یہ اعتراف بھی ہے کہ اسے پڑھتے وقت میں درد کے ایک تجربے سے گزرا ہوں اور رگ وپے میں غصے کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی ہے۔ اس تجربے کی نوعیت محض ذاتی ہوتی تو میں چپ رہتا اور شاید کسی سے کچھ نہ کہتا۔ مگر یہ تحریر ایک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے، ان تمام لوگوں کے لیے جو انسانی مسائل سے سروکار رکھتے ہیں۔

یہ تحریر طارق علی کی ہے۔ برصغیر کے کم نوجوانوں کے افکار اور انقلابی سرگرمیوں نے اتنی کم مدت میں ایک عالم کو اس درجہ متوجہ کیا ہے جتنا کہ طارق علی نے۔ آپ اس نوجوان کے سیاسی رویوں اور معتقدات سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس کے فکر وعمل کی دنیا میں انسانی مطالبات کی جو گونج سنائی دیتی ہے اس سے انکار کر کے اپنی انسانیت کا تحفظ نہیں کر سکتے۔

طارق علی نے لکھا ہے کہ ان کے والد مظہر علی خاں نے چار برس پہلے پاکستانی حکومت سے علاج کے لیے ملک سے باہر جانے کی اجازت مانگی تھی۔ وہ دل کے مریض ہیں۔ ان کی عمر ۶۶ سال ہے۔ لاہور سے View Point نام کا ہفتہ وار نکالتے ہیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ ہندوستان اور پاکستان میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں، ان کی روشن خیالی، انسانی حقوق کے لیے ان کی جدوجہد، آزادیِ اظہار کے لیے ان کی مسلسل اور جرأت آمیز جستجو کا شہرہ مہذب

دنیا کے ہر گوشے تک پہنچ چکا ہے۔ وہ عالمی امن کونسل کے رکن ہیں۔ ایک زمانے میں پاکستان ٹائمز کے مدیر تھے۔ ان کی ادارت نے اس روزنامے کو ایشیا کے ایک منفرد اور موقر اخبار کی حیثیت دے دی تھی۔

پاکستانی حکومت نے مظہر علی خاں کی درخواست کے جواب میں یہ شرط رکھی کہ فوج کے ایک میڈیکل بورڈ کے سامنے وہ خود کو پیش کریں۔ انھیں علاج کے لیے باہر جانے کی ضرورت ہے بھی یا نہیں اس کا فیصلہ بورڈ کی رائے جاننے کے بعد کیا جائے گا۔ فوجی میڈیکل بورڈ نے اپنے معائنے کی رپورٹ کے ساتھ یہ سفارش بھی کی کہ مظہر علی خاں کو دل کے ایک آپریشن کے لیے ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ پاکستانی حکومت اس کے بعد بھی ٹال مٹول کرتی رہی۔ معاملہ آج بھی وہیں ہے جہاں چار برس پہلے تھا۔

یہ انتقام ہے، یا بے حسی، یا مصلحت، پتہ نہیں۔ اگر یہ ایک مقتدر اور باضمیر صحافی کی ترقی پسندانہ سرگرمیوں کی سزا ہے تو اس کا قانونی جواز کیا ہوگا؟ اگر یہ صرف بے حسی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستانی حکومت انسانیت کی ابجد اور سماجی اخلاق و انصاف کے عام اصول بھی فراموش کر بیٹھی ہے۔ اور اگر یہ مصلحت کا تقاضہ ہے تو ہر انسان دوست کو ایسی مصلحتوں سے نفرت کا اظہار کرنا چاہیے۔ سماجی انصاف اور انسانی حقوق کے احترام سے عاری ہو جانے کے بعد کوئی بھی اقتدار، اس کی بنیادیں نظریاتی ہوں یا مذہبی، صرف درندگی کا ترجمان بن کر رہ جاتا ہے۔ ابھی زمانے نے انسانیت کی کوئی ایسی تعریف متعین نہیں کی جس میں اس نوع کے انتقام، بے حسی یا مصلحت کی گنجائش نکل سکے۔

پاکستانی حکومت نے مظہر علی خاں کو جبر کا نشانہ کیوں بنا رکھا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ اس بزرگ صحافی نے پاکستان کی تاریخ کے کسی بھی دور میں فوجی اقتدار کی حمایت نہیں کی۔ اس کا اختلاف مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی بعض پالیسیوں سے بھی رہا مگر جس وقت فوجی عدالت نے بھٹو کو موت کا مستحق ٹھہرایا اور انھیں پھانسی دی گئی اس وقت مظہر علی خاں نے اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر بھٹو کی وکالت اور اس مجنونانہ فیصلے کی مخالفت سے بھی گریز نہیں کیا۔ وہ قید و بند کی آزمائش سے بھی گزرے مگر ذہنی آزادی کا راستہ نہیں چھوڑا اور زمانہ شاہد ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں انسانیت اپنی بقا کے لیے خسارے بھی اٹھاتی آئی ہے۔

مظہر علی خاں کی درخواست یہ نہیں کہ انھیں علاج کے لیے کسی ایسے ملک میں جانے کی اجازت دی جائے جس سے وہ کوئی ذہنی، جذباتی اور نظریاتی رشتہ رکھتے ہیں۔ یہ جگہ ماسکو، واشنگٹن، لندن یا پیرس کوئی بھی ہوسکتی ہے۔

طارق علی نے ۱۹۷۷ء سے اپنے والد کی صورت نہیں دیکھی۔ بیٹا جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے، باپ وطن میں بھی ایک قیدی کی مثال ہے—

''مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ مگر میرا صبر جواب دے چکا ہے۔ چونکہ فوجی حکومت اب تک انھیں علاج کے لیے باہر جانے کی تمام مقامی گزارشوں کو نظر انداز کرتی آئی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آچکا ہے، جب وہ سب کچھ کیا جائے جو باہر سے کیا جاسکتا ہے۔ میں ہندوستان میں اپنے والد کے دوستوں اور دیگر حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ایک مہم شروع کریں تاکہ (پاکستانی) حکومت کو اس بات پر مجبور کیا جاسکے کہ وہ ایک بوڑھے انسان کو، اس سے پہلے کہ وقت گزر جائے، باہر جانے کی اجازت دے دے۔''

یہ طارق علی کی تحریر کا اختتامیہ ہے۔ یہ اختتامیہ مطلوبہ مہم کا آغاز بن سکے گا یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اگر پاکستانی حکومت یا اس کے ہندوستانی سفارت خانے تک اس سلسلے میں احتجاج کا ایک لفظ بھی پہنچ سکا تو میں سمجھوں گا کہ ابھی وہ انسان زندہ ہے جو انسانیت کے زوال کا مخالف، منکر یا کم سے کم نوحہ گر ہوسکتا ہے۔ طارق علی کی یہ تحریر پاکستانی حکومت کے لیے تو ایک آئینہ ہے ہی، اچھا ہو کہ ہم بھی اس آئینے میں اپنے آپ پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

یہ کیسی تعلیم ہے؟

ایک مڈل کلاس زاویہ نظر

کچھ دن ہوئے، شہر دلّی میں امتحان سے پہلے ہی بعض پرچے آؤٹ ہونے کا تماشہ سامنے آیا۔ اخباروں نے کچھ شور مچایا پھر سناٹا۔ کھلے بازار میں پرچے بیچے اور خریدے گئے۔ دانشوروں نے عالمانہ افکار کا نقشہ جمایا۔ کسی نے کہا یہ سب موجودہ نظامِ تعلیم کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ کسی نے اساتذہ کو مجرم ٹھہرایا، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ ایسی خبریں بھی سنی گئیں کہ امتحان کے بعض مراکز پر جویانِ علم بغیر کسی شرم، جھجک یا ڈر کے نقلیں کر رہے تھے۔ وہ اساتذہ جو نگرانی پر مامور تھے، جیتی جاگتی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے رہے، مگر مجبور تھے۔ کون اپنی جان خطرے میں ڈالے!

ایک ہفتہ وار میں کسی کا خط نظر سے گزرا۔ لکھنے والا کوئی طالب علم ہے۔ اس نے جان ہتھیلی پر رکھ کر دوٹوک انداز میں یہ بات کہی ہے کہ ''زیادہ سے زیادہ پروفیسر اور لیکچرر حضرات خوشامدی ہوتے جاتے ہیں اور اپنے طلبا میں برائی کو ترقی دے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اساتذہ کی خوشنودی حاصل کیے بغیر میں اپنی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل نہیں کرسکتا۔ ان دنوں ہمارے ملک میں تجارت کا بس یہی راستہ رہ گیا ہے۔''

ایک مغربی یونیورسٹی کے اسکالر ہندوستان آئے۔ کسی کام سے ایک ہندوستانی یونیورسٹی کے ایک شعبے میں گئے۔ کہنے لگے ''جن صاحب سے ملنا تھا وہ تو تھے نہیں، ان کے چپراسی نے بتایا کہ دیر سے آئیں گے۔'' بعد کو ان پر یہ بھید کھلا کہ جن صاحب کو وہ صدرِ شعبہ کا چپراسی سمجھ بیٹھے تھے وہ دراصل ایک استاد تھے۔ وہ حیران ہوئے، ہم پشیمان کہ ایسے قصے یہاں کا معمول بن گئے ہیں۔

علم سچائی کی جستجو ہے۔ یہاں تعلیمی اداروں میں سچائی کا جو روپ دکھائی دیتا ہے اس پر اب لوگ شرمانا بھی بھولتے جاتے ہیں۔

انگریزی کے ایک موقر جریدے میں ایک صوبائی یونیورسٹی کا حال احوال چھپا ہے۔ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ادیب کہے جاتے ہیں۔ انعامات و اعزازات سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ انھوں نے علم کی قدر اس حد تک کی کہ اپنی بیٹی اور بہو سے بطور طالب علم کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کروادیے۔ اس کے لیے انھیں مارکس لسٹ میں بس ذرا دائیں بائیں کرنا پڑا تھا۔ مان لیجیے کہ ۳۸ نمبر تھے، اسے ۸۳ کردیا اور بس۔ ہندسے وہی مگر ہاتھ کی صفائی نے ان کی تقدیر بدل دی — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ ان بزرگ پر اقربا پروری کے علاوہ رشوت ستانی کے بھی سنگین الزامات عاید ہوئے ہیں۔ ملازمت کے لیے ان کی دعائیں درکار ہوں تو دس بیس ہزار کے چڑھاوے سے کم پر کام نہیں چلے گا۔ غرضکہ افواہوں کا بازار گرم ہے۔

ایک چیف منسٹر صاحب کی بیگم اپنی تعلیمی استعداد میں اضافے کی طلب گار تھیں۔ امتحان میں شریک ہونے کے لیے انھیں صوبائی راجدھانی سے دور ایک شہر میں جانا تھا۔ امتحان سے فارغ ہو کر ہر شام گھر واپس آنا تھا۔ سو اُن کے لیے روزانہ ایک ہوائی جہاز حاضر۔ اب سے آگے طلبا، اساتذہ کی خدمت کرتے تھے، چلم بھرتے تھے۔ ان نیک بی بی نے جس یونیورسٹی کو اپنے امتحان کا مرکز ٹھہرانے کی عزت بخشی اس کے وائس چانسلر سے لے کر صدرِ شعبہ اور رجسٹرار اور اساتذہ سب سے حقہ تازہ کروالیا۔ ان کے استقبال کے لیے سب کے سب موجود، اشارۂ چشم کے منتظر۔ یہ امید کہ اسی زینے سے ترقی کے کوٹھے تک جا پہنچیں گے۔ کمال سا کمال ہے۔

گاہے گاہے ایسی خبریں بھی سنائی دیتی ہیں کہ کسی سادہ لوح طالب علم نے اپنی حق تلفی سے ہلکان ہو کر خودکشی کرلی۔ اور یہ بات تو اب خبر نہیں رہ گئی کہ کچھ جی دار طلبا رشوت اور خوشامد کے بجائے زور زبردستی اور دھمکی کے سہارے کامیابی کی راہ ڈھونڈ نکالتے ہیں — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

امتحانات میں دھاندلی، داخلوں میں دھاندلی، وظائف اور امتیازات کی تقسیم میں دھاندلی، تقرری اور ترقی کے معاملے میں دھاندلی ایسا لگتا ہے کہ آنوے کا آنوا ہی بگڑ گیا ہے۔ طلبا پڑھنے کی مشقت سے گریزاں، اساتذہ پڑھانے سے زیادہ جوڑ توڑ، سازشوں، گروہ بندیوں اور چشمکوں میں مصروف یا پھر اپنے منصب کی روٹی کھاتے ہیں اور دنیا کماتے ہیں۔ جن راستوں سے گزر کر آپ کامیابی کی راہ تک پہنچے وہی راستہ نوجوانوں کو دکھاتے ہیں — لوگ ساتھ آتے گئے اور

کارواں بنتا گیا۔

پیشہ ورانہ کورسوں میں داخلے کے لیے پچیس پچاس ہزار کی رشوت یا نذرانے کی شرط عام ہے۔ اس ماحول میں جو تعلیم دی جائے گی اس کا حشر معلوم۔ بس جو بات معلوم نہیں یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی معاشرہ انجام کار کہاں جا کر دم لے گا!

جے پرکاش نرائن نے ایک نعرہ دیا تھا کہ یونیورسٹیاں کچھ دنوں کے لیے بند کر دی جائیں۔ اس نادر مشورے کا جو حال ہونا تھا وہی ہو کر رہا۔ مرض چاہے جتنا مہلک ہو مریض کا گلا تو نہیں گھونٹتے۔ پھر علاج کی کیا صورت ہو؟

کیا ہمارے تعلیمی معاشرے کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے؟ جی نہیں۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں ایسی مایوسی کی باتوں سے کوئی مسئلہ کبھی حل نہیں ہوا۔ اچھے طلبا، اچھے اساتذہ کل بھی تھے، آج بھی ہیں۔

اچھے لفظ بے حرمت ہوئے غلط معنوں کے سبب۔ معانی غلط ہوئے غلط رویوں اور ارادوں اور مقاصد کی وجہ سے۔ رویے یا ارادے اور مقاصد غلط ہوئے تو اس لیے کہ ان کا رشتہ اپنے محور سے ٹوٹ چکا ہے۔

یہ محور کیا ہے؟ وہی جو انسان کی ہر سرگرمی کا محور ہے۔ کچھ اس محور کے نام پر ہنسیں گے، کچھ چپ رہیں گے، کچھ کہیں گے پرانی باتیں ہیں، اب ہمارے کس کام کی۔ ٹھیک ہے۔ زمانہ بدلا، زندگی بدلی۔ زندگی اور زمانے کے اسالیب کے ساتھ ساتھ ان کے تقاضے بھی بدلے۔ مگر خود زمانہ بھی کل یا پرسوں پیدا نہیں ہوا۔ نہ ہی زندگی خلائی عہد کی تحقیقات کا حاصل ہے۔ جس طرح انسان پرانا ہے اور زندگی پرانی ہے مگر اس کا سلسلہ قائم ہے، اسی طرح زندگی کو با معنی بنانے کے لیے اگلوں نے جو اقدار کے ایک نظام کی تشکیل و تعمیر پر زور دیا تھا اس کی اہمیت اور ضرورت بھی قائم ہے، دائم ہے۔ حضرت علی کا ارشاد ہے کہ پرانی باتیں کب کی ختم ہو گئی ہوتیں اگر دہرائی نہ جاتیں۔ زمانے اور زندگی نے بھی کسی نہ کسی شکل میں خود کو دوہرایا ہے۔ پھر اس میں عجوبہ کیا ہو گا اگر ہماری کچھ قدریں جو ہماری تہذیب اور روایت کے محور کی حیثیت رکھتی ہیں، انھیں بھی قائم رکھا جائے۔ رہی ترمیم و تبدیلی کی بات تو پودے بھی کاٹے چھانٹے جاتے ہیں۔ تراش خراش کے اس عمل میں ان کی جڑیں نہیں سوکھ جاتیں۔ انھیں نئی زندگی ملتی ہے۔ ان سے نئی قلمیں تراشی اور

لگائی جاتی ہیں اور ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا جاتا ہے۔ فطرت کا قانون یہی ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا تعلیمی معاشرہ روز بروز سکڑتا سوکھتا جاتا ہے۔ زندگی سے اس کا تعلق کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اپنے محور سے ہٹ کر یا کٹ کر تو یہ زمین بھی خود کو نہ بچا سکے گی پھر اس تعلیمی معاشرے کی کیا بساط جس کے چاروں طرف آج بھی ایک نیم ترقی یافتہ اور اخلاقی طور پر ناخواندہ سماج کا حصار ہے۔

اگر آپ کو جدید بننے کا شوق بہت زیادہ ہے تو آپ کہیں گے کہ یہ پٹی پٹائی باتیں مڈل کلاس طبقے اور اس کی فکر کا آئینہ ہیں۔ یہ ہم مانتے ہیں۔ مگر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہے کہ ہمارے ملک اور معاشرے کی نجات کے لیے بالآخر اونچے طبقے اور نچلے طبقے ان دونوں کو بھی مڈل کلاس بننا ہوگا۔ تعلیم بھی اس جبر کو اختیار کرے تو اچھا ہے۔

قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم

شہر بستے ہیں تو بہت کچھ اجڑتا بھی ہے۔ جب سے دلّی میں فلائی اوورز کا ہنگامہ شروع ہوا ہے، ہزاروں پیڑ کاٹ ڈالے گئے۔ چلیے مان لیا کہ توسیع شہر کا انحصار اسی قہر پر ہے مگر کچھ توازن تو چاہیے تھا۔ یہ کیا کہ فٹ پاتھ بنانے ہیں تو پیڑ کاٹے جا رہے ہیں۔ پل بننے ہیں تو پیڑ کاٹے جا رہے ہیں۔ اور تو اور، یہ تماشہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب کے دروازے تک موٹر ٹیکسی کا آنا جانا راستے کے نکڑ پر ایک چھتنار پیڑ کی موجودگی کے سبب ممکن نہ تھا، اس پر بھی آرے چلا دیے گئے۔

جن بستیوں میں پیڑ نہیں ہوتے وہاں پرندے بھی نہیں آتے۔ اور جہاں پرندے نہ ہوں وہ جگہ چاہے جتنی آباد ہو، ویران نظر آتی ہے۔ دلّی شہر کی ہزار خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہاں پیڑ بہت ہیں۔ سڑکوں کے ساتھ دورویہ درختوں کی قطاریں، پارک، سبزہ زار، پھر رج کا لمبا چوڑا علاقہ جسے اس شہر کے پھیپھڑوں کا نام دیا جاتا ہے۔ پرانے قلعے کے آس پاس یا جمنا کے کنارے کنارے یا تغلق آباد، سیری، حوض خاص اور مہرولی کی طرف غیر آباد علاقوں کا حسن بھی پیڑوں کے دم قدم سے قائم ہے۔ بھری پری آبادیوں میں بھی پیڑ کھڑے ہیں۔ نیم، پیپل، برگد، جامن، مولسری، املی شیشم، گل مہر اور املتاس کے پیڑوں کا شمار مشکل ہے۔ مگر پیڑ چاہے جتنے ہوں بستی کا دم نہیں گھٹتا۔ اس کے برعکس پرانی دلّی کے گنجان محلوں اور گلی کوچوں کا تصور کیجیے۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ چاندنی چوک کا بازار جہاں کبھی میر صاحب سیر کے لیے نکلتے رہے ہوں گے، آج وہاں سانس لینا دشوار۔ پٹرول کی بدبو، شور، رکشے اسکوٹر، تھری وہیلر، موٹریں، سائیکلیں۔ جب دیکھیے یہی محسوس ہوتا ہے کہ تمام آدم زادوں کو کہیں نہ کہیں پہنچنے کی جلدی ہے۔ کوئی قیام پر قانع نہیں۔

او کھلے میں آگرہ نہر کے کنارے کنارے میلوں تک دورویہ درختوں کی صفیں تھیں۔ سب تتر

بتر ہو گئیں۔ ابھی تین چار برس پہلے تک جہاں مور، بندر، بلبل، تیتر، فاختائیں، بگلے اور بطخیں بسیرا کرتی تھیں اب بدصورت، بدوضع، بدرنگ شیڈ بنا دیے گئے ہیں۔ ہر نیا دن یہ بتاتا ہے کہ کچھ اور سبزہ پامال ہوا، کچھ اور منظر بے حال ہوا۔ آموں پہ بور آتے ہی کوئل کی کوک کانوں میں شہد انڈیلتی تھی۔ اکادکا آم کے پیڑوں پر بور دکھائی دیے مگر کوئل کی آواز کو کان ترستے ہیں۔ اب کسی کسی روز اس کی پکار پر آنکھ کھلتی ہے — از کجامی آید ایں آوازِ دوست؟ آنکھیں بھٹکتی ہیں مگر ان کا مقدر وہی محرومی۔ یہ سب اپنے کیے کی سزا ہے۔

گرانی، چور بازاری، رشوت ستانی کے ماحول میں درختوں اور پرندوں کی بات مجھے کبھی کبھی بے موقع لگتی ہے۔ لیکن ملک اور معاشرے اور دنیا کے مسائل تو اب زندگی کا معمول ہیں۔ ان کا ماتم کہاں تک کیا جائے؟ پھر کیا عجب کہ کوئی معجزہ نمودار ہو اور آدمی اپنے آپے میں آ جائے۔ کل، پرسوں، ترسوں، دس، بیس، پچاس برس بعد پتہ نہیں دنیا جیسی کہ ہے اس سے بھی بدتر ہوگی کہ بہتر۔ امید اور اندیشے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن درخت ایک بار کٹ جائیں تو پھر نہیں پنپتے۔ پرندے اپنی بستی چھوڑ دیں تو پھر واپس نہیں آتے۔ آدمی اپنے آپ کو بھول گیا۔ پرندے آج بھی اپنا منصب پہچانتے ہیں۔

اور دلّی میں تو تین تین چار چار سو برس پرانے درخت تھے۔ اب بھی ہیں۔ جو گئے سو گئے۔ مگر جو باقی بچے ہیں انھیں تو بچایا جائے۔ رج کا کتنا علاقہ کرخنداروں اور نو دولتیوں نے صاف کر دیا۔ دلّی کارپوریشن بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں۔ چند دن ہوئے اخبار میں ننھی سی خبر یہ چھپی کہ بس ساٹھ پینسٹھ پیڑوں کا نقصان اب فلائی اوورز کے سبب ہوگا۔ اب سے پہلے تو خیر سیکڑوں درخت شہید ہوئے اور ہزاروں پرندے بے گھر۔ اب بھی قیاس یہی کہتا ہے کہ کارپوریشن کی نظر صرف ساٹھ پینسٹھ درختوں پر نہیں۔ ترقی کی اس زد میں کم سے کم ہزار ڈیڑھ ہزار پیڑ ابھی اور آئیں گے۔

ایک حدیث شریف ہے کہ کسی شہر کی آبادی حد سے تجاوز کر جائے تو نئے شہر بسانے چاہئیں۔ موسولینی کو علامہ اقبال نے یہ بات بتائی تھی تو سن کر اچھل پڑا تھا۔ ان لفظوں میں حکمت کی جو روشنی ہے روز بروز زمانہ اس کی طرف سے آنکھیں پھیرتا جاتا ہے۔

آدمی کو ہوش کیوں نہیں آتا؟ کیا اس لیے کہ پیڑ کٹتے جائیں پھر بھی خاموش رہتے ہیں؟ کسی سے کچھ نہیں کہتے، چپ چاپ یہ عذاب سہتے ہیں؟

مگر خاموشی بھی تو احتجاج کا ایک طور ہے۔ کٹتے ہوئے پیڑوں کی چپ بھی ہم سے کچھ کہتی ہے۔ پیڑ خاموشی سے کٹتے جائیں اور پرندوں کی آواز روز بروز تعمیر و ترقی کے شور شرابے میں گم ہوتی جائے۔ یہ قہر بھی بہت بڑا ہے۔ پرندوں کے چہچہوں سے خالی شہر چھتنار درختوں کے سائے سے محروم راستوں کا خیال آتا ہے تو جی کانپ اٹھتا ہے۔

مجید امجد کی ایک نظم ہے، توسیع شہر دیکھیے تو دھیان کو کہاں لے جاتی ہے۔ ''بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار۔ جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہریدار۔ گھنے سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار۔ بیس ہزار میں بک گئے۔ سارے ہرے بھرے اشجار—

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار
آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف مری اک سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

یہ ضرب تو اولادِ آدم پیڑوں کے ساتھ اپنے آپ پر بھی لگاتی جاتی ہے۔ اپنے بگاڑ سے بے خبر اور اپنے بناؤ کے نشے میں گم۔ یہ نشہ کتنا مہنگا ہے اس کا جواب ان بادلوں سے پوچھا جا سکتا ہے جو اس شہر پر برسے بغیر آگے چلے جاتے ہیں۔

سنا ہے پنڈت جواہر لال نہرو کی ہدایت تھی کہ کناٹ پلیس کے علاقے میں فلک بوس عمارتیں نہ کھڑی کی جائیں۔ شہر کے آسمان کا حلیہ بگڑ جائے گا۔ مگر گہری باتیں آسانی سے بھلا دماغ میں کب اترتی ہیں۔ اب دھڑا دھڑ فلک بوس عمارتیں بنتی جاتی ہیں۔ اس طرح آسمان کا حلیہ تو بگڑے گا ہی زمین بھی بدصورت ہوتی جائے گی۔

اور پرندے انہی زمینوں میں بسیرا کرتے ہیں جو بدصورت نہ ہوں۔ بدصورتی سے سمجھوتے کی روش بس آدم زادوں میں عام ہے۔ آدمی کا کیا مرتبہ ہے اور کیا مقام ہے؟

فلسطین فلسطین

یہ امتحان کا وقت ہے، اور یہ وقت ہے اس عہد کی تجدید کا کہ امتحان کی اس گھڑی میں ہم فلسطینی مجاہدوں کے ساتھ ہیں۔ ان کا درد ہمارا درد ہے۔ ان کے حوصلے ہمارے حوصلے ہیں۔ اور ان کے وہ خواب، جو کب سے لہو کا خراج وصول کر رہے ہیں، وہی خواب آنسوؤں کی صورت ہماری آنکھوں میں بھی پھیلے ہوتے ہیں۔

اجتماعی آزادی اور انسانی حقوق کا جو شعلہ فلسطینی عوام کے سینوں میں روشن ہے اس کی حرارت ہم اپنی رگ و پے میں بھی محسوس کر رہے ہیں۔ اور بے زمینی کا وہ قہر، جو مغربی سامراج کی سازش کے نتیجے میں ایک پوری قوم کا تصور بن گیا، آج اپنی زمین پر آباد ہوتے ہوئے بھی ہم اس قہر کی ظلمت سے دوچار ہیں۔

انسانی تاریخ میں اب سے آگے ایسے کتنے لمحے آئے جب لفظوں نے اپنی حرمت کھوئی ہے۔ لفظ عمل کا بدل نہیں ہوتے۔ امتحان کی اس گھڑی میں بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ خوابوں کا، اور آرزومندیوں کا، دوستیوں کا اور دلداریوں کا، ارادوں کا اور مقاصد کا وقت گزر چکا۔ تاوقتیکہ یہ خواب اور یہ آرزومندی، یہ دوستی اور یہ دلداری، یہ ادارے اور یہ مقاصد، ایک مربوط اور منظم، ایک ٹھوس اور مستحکم جدوجہد کی شکل اختیار نہیں کرتے۔ سوچنا اور سوچتے رہنا برحق، مگر دنیا صرف سوچنے اور سوچتے رہنے سے نہیں بدلتی۔ دنیا صرف تجویزوں اور تلقینوں اور ہدایتوں اور ترغیبوں سے بھی نہیں بدلتی۔ کبھی کبھی قوموں کی تاریخ میں ایسے موڑ بھی آئے ہیں جب گلابوں کی پرورش آتش فشاں کے دہانوں پر کرنی ہوتی ہے، اور جب زیتون کی شاخ سبز کو، اپنے دفاع اور اپنی بقا کے لیے، تشدد اور مسلح کوششوں کی غذا درکار ہوتی ہے۔

امتحان کی وہ گھڑی آ چکی ہے کہ زیتون کی وہ شاخ سبز امریکی سامراج اور سرزمین عرب

پر اس سامراج کے صیہونی چوکیداروں کی جارحیت نے ایک بے زمین قوم کے ہاتھوں چھین لی ہے۔

جن ہاتھوں سے یہ شاخ چھینی گئی وہ ہاتھ صرف یاسر عرفات کے ہاتھ نہیں، صرف فلسطینیوں کے ہاتھ نہیں، صرف غیور عربوں کی ایک جماعت (جی ہاں بس! ایک جماعت کہ باقی عرب غیرت وحمیت کے بیجے بھی بھلا بیٹھے ہیں) کے ہاتھ نہیں، صرف مسلمانوں کے ہاتھ نہیں — یہ ہاتھ ان انسانوں کے ہیں جن کا سینہ حرارت سے معمور ہے، جن کا ماتھا آزادی اور عزت نفس کی روشنی سے منور ہے اور جو آج ساری دنیا کی ترقی پسندانہ قوتوں اور سرگرمیوں کی علامت بن گئے ہیں۔ یہ ہاتھ ویتنام کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھ رہے ہیں۔ امتحان کی اس گھڑی میں ان ہاتھوں نے رائفلیں سنبھال رکھی ہیں، لیکن آج بھی انھیں زیتون کی اس ٹہنی کی طلب ہے جو توسیع پسند صیہونیوں اور امریکی سامراج کی ملی بھگت کے نتیجے میں ان کے ہاتھوں سے گرادی گئی۔

۱۳ نومبر ۱۹۷۴ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے یاسر عرفات نے کہا تھا:

فلسطین کا مسئلہ محض پناہ گزینوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ کا سوال، صرف عرب ریاستوں اور صیہونیوں کے مابین سرحدی اختلافات کا سوال نہیں ہے۔ فلسطینی انقلابات نے اپنا نشانہ یہودیوں کو نہیں بلکہ نسل پرست صیہونیوں اور ان کے عزائم کو بنا رکھا ہے۔ اس جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی، مسلمان برابر کی سطح پر زندگی گزار سکیں۔ فلسطینی تنظیم آزادی عام انسانوں اور حکومتوں سے اصرار کرتی ہے کہ وہ ان تمام صیہونی منصوبوں کے خلاف ثابت قدم رہیں جن کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا بھر کے یہودی، اپنے اپنے ملکوں سے ہجرت کر کے سرزمین فلسطین پر غاصبانہ قبضہ کر لیں......

اور اسرائیل کا اختتام یاسر عرفات نے ان الفاظ پر کیا تھا کہ ''یہاں میں ایک مجاہد آزادی کی بندوق اور زیتون کی ایک شاخ لے کر آیا ہوں۔ یہ شاخ میرے ہاتھوں سے مت گراؤ۔''

انسانی بھائی چارے، امن اور مساوات کی یہ اپیل رائیگاں گئی، کیونکہ اس اپیل کا رخ ان کانوں کی طرف تھا جو صرف اپنے نسل پرستانہ عزائم اور توسیع پسندانہ مقاصد کی آواز سننے کے عادی ہیں، جنہیں نہ تو عالمی رائے عامہ کا پاس ہے، نہ دوسروں کے حقوق کا لحاظ، اور جن کی سماعت پر

بے ضمیری اور خود غرضی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

مگر، انھیں ڈر ہے انصاف اور آزادی کے ان جیالوں کا جن کی زمین دو نیم کر دی گئی، جن کے دل تقسیم کر دیے گئے۔ پھر بھی نہ صرف یہ کہ وہ زندہ ہیں، صیہونی منصوبوں کی موت کے نقیب بھی بنے ہوئے ہیں، جنھیں سرمایہ دارانہ سیاست کی نفرت انگیز سازشوں کا سامنا ہے اور جن کے طویل، صبر آزما اور مصائب سے بھرے ہوئے راستے میں، جا بجا، اپنوں کی مصلحت اور منافقت اور عافیت زندگی اور بزدلی کے پتھر پڑے ہوئے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ فلسطینیوں کے تمام دفاعی مورچے تباہ کر دیے جائیں، اس لیے کہ ہجرت شعار کرنے والوں کے لیے کوئی بھی زمین، چاہے وہ کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو، اپنی زمین کا بدل نہیں ہوتی۔ مگر، وہ مورچے جو روح کی سرزمین پر قائم کیے گئے، اور جن کا اسلحہ ان کے اپنے حوصلے ہیں اور اپنا یقین ہے اور اپنا خواب ہے اور اپنی امیدیں ہیں، وہ مورچے ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ امریکی تجربہ گاہوں اور اس کے صیہونی ہوا خواہوں نے ابھی وہ نسخہ دریافت نہیں کیا، جس کی مدد سے انسانی روح کے مورچوں کو فتح کیا جا سکے۔

ایسا نہیں کہ صیہونیوں نے روح کے مورچوں پر وار نہ کیے ہوں۔ انھوں نے آٹھ برس پہلے فلسطینی مجاہد اور ادیب غصان کو اسی لیے شہید کیا تھا کہ غصان کے ہاتھ میں رائفل تو نہیں تھی مگر ایک قلم تھا اور اس نے رسائل اور اخبارات کے صفحوں کو اپنا محاذ بنا رکھا تھا۔ اس کی روح کے مورچے سے اٹھنے والی صدا اپنے دشمنوں کے لیے کمانڈوز کے ایک پورے کالم سے کم خطرناک نہیں تھی!

امتحان کی اس گھڑی میں جب بیروت کے اطراف بم پھٹ رہے ہیں اور آسمان ایک کالے، زہریلے، بدبودار دھوئیں کی لپیٹ میں ہے، اور فلسطینی بچوں اور ماؤں اور بوڑھوں کے لیے زمین تنگ ہوئی جاتی ہے، اس کے مجاہد اپنی روح کے محاذ پر جمے ہوئے ہیں۔ ٹینکوں اور توپوں اور طیاروں کی گھڑگھڑاہٹ میں بھی وہ اپنی روح کا نغمہ سن رہے ہیں اور ہم سے کچھ کہہ رہے ہیں۔

امتحان کی اس گھڑی میں اقوام متحدہ سے ایک بار پھر اپیلیں کی جا رہی ہیں، اور ایک بار پھر امریکی ویٹو کے کاندھے پر سوار صیہونی جارحیت، عالمی رائے عامہ کا مذاق اڑا رہی ہے۔

ایسی صورت میں کہ مغربی ایشیا کے بہت سے ملک آگ اور خون کے اس ڈرامے میں صرف خاموش تماشائیوں کی مثال بیٹھے ہیں، شاید، مہذب دنیا کے ان تمام افراد کے لیے جو انسانی حقوق کا احترام کرتے ہیں، یہ وقت اعلان کا وقت ہے، عمل کے اعلان کا۔ یاسر عرفات کی وہ تقریر بھی اب گئے دنوں کی دستاویز ہے اور اس وقت وہ خود بھی محاذ پر ہیں۔

ایک اور ویت نام

مسجدوں میں دعائیں مانگی گئیں، مظاہرے ہوئے، صیہونی جارحیت پر چاروں طرف لعن طعن کی گئی۔ عرب ممالک نے فلسطینیوں کی حمایت اور ان سے ہمدردی کا اعلان کیا۔ اور تو اور، سوویت یونین نے تادمِ تحریر ایک نہ دو، تین بار اسرائیل اور اس کے واسطے سے امریکہ کو دھمکی دی۔ پہلی دھمکی سخت تھی، دوسری کچھ کم سخت اور تیسری دھمکی کے بارے میں تو خود امریکہ والوں نے یہ کہا کہ "بہت نرم ہے!"

بائیں بازو کے ایک اسرائیلی سیاست داں نے، جو اپنی حکومت کے عزائم اور اقدامات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، کہا "جہاں تک زبانی جمع خرچ اور خطابت کا تعلق ہے، تمام عرب متحد نظر آتے ہیں، لیکن دراصل یہ اتحاد محض ایک مفروضہ ہے!"

تل ابیب کی سڑکوں پر، اسرائیلی جارحیت کے خلاف احتجاج کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ اسرائیل کے سرپرست اور سرمایہ دارانہ سیاست کے خواجہ سگ پرست صدر ریگن کے اپنے ملک میں زبردست ہنگامہ ہوا۔

اقوام متحدہ کی قراردادوں میں بار بار کہا گیا! مانو نہ مانو جان جہاں اختیار ہے! مگر اسرائیل نے مان کر نہ دیا۔

اُدھر عرب ریاستیں گفت و شنید میں مصروف۔ گفتار کے یہ غازی پہلے ہی اپنے سوا ساری دنیا کو بے زبان تصور کر بیٹھتے تھے۔ سچ ہے، کسی لفظ میں اتنی طاقت نہیں کہ خدا کے ان برگزیدہ بندوں کے افکار و اعمال کا احاطہ کر سکے۔

ہمارے ایک دوست ۱۹۷۹ء کے ماہ دسمبر میں فرانس گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے آئے تو شاہ فہد (سابق شہزادہ فہد) کی کہانیاں ساتھ لائے، ایک اطالوی اخبار میں چھپی ہوئی عربی

شہزادے کی تصویر بھی جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی! چوں بہ مغرب می روند آں کار دیگر می کنند!
چند روز پہلے ایک قومی روزنامے میں اسی سابق شہزادے اور موجودہ شاہ کی ایک فلمی تصویر چھپی ہے جو بتاتی ہے کہ اس مردِ مجاہد نے اپنے رب کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کیا اور ان کا حق بھی، کہ اسے خوبصورت ہوٹلوں اور عیاشی کے اڈوں، قمار خانوں، خوشبوؤں اور خوش روؤں سے بلا کی دلچسپی ہے—

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مغرب کو جانے دیجیے! حیدرآباد اور بمبئی کے اخبارات مومنین عرب کے کارناموں کی تفصیلات سے بھرے ملتے ہیں۔ ایسی باتیں سن کر کچھ لوگ کہتے ہیں "یہ فرقہ پرستوں کا پروپیگنڈا ہے۔" متمول عربوں نے افراد ہی کو نہیں جماعتوں کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے اور ان کی خیرات نے بہت سے ذہن اور ضمیر زنگ آلود کر دیے ہیں۔

یہ احوال اس قوم کا ہے جس کی ایک جماعت پچھلی کئی دہائیوں سے صیہونی جارحیت اور امریکی سیاست کی زد پر ہے۔ جس کے وسائل محدود ہیں، راستے مسدود، مگر پسپائیوں کے باوجود جس نے اب تک ہار نہیں مانی ہے اور اپنا مقصد پانے یا اس کی خاطر جان گنوانے کی ٹھانی ہے۔

کہتے ہیں کہ بارہ بارہ برس کے فلسطینی بچوں نے رائفلیں اٹھا رکھی ہیں۔ فلسطینی مائیں اپنے جواں سال بیٹوں کو محاذ پر بھیجتے وقت بس یہ سوچتی ہیں کہ یا تو شہید ہوں گے یا فاتحوں کی صورت واپس آئیں گے۔

یہ ایک اور ویت نام ہے جس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

بیسویں صدی میں انسانیت کے ضمیر کا سب سے روشن نام ویت نام رہا ہے۔ آج اس نام کا پرچم فلسطینیوں کے ہاتھ میں ہے۔ آج فلسطین سچائی کا ایک ایسا آئینہ بن چکا ہے جس میں ہم انسانی ضمیر کا چہرہ بھی دیکھتے ہیں اور۔۔۔ اور کچھ انسانوں کی بے ضمیری کا بھی۔

بے ضمیری کے اس چہرے کا ایک نام امریکہ ہے۔

ایک نام اسرائیل۔

ایک نام وہ فرقہ پرست افراد اور انجمنیں جنھوں نے آج اندھیرے اور اجالے کی اس سب

سے بڑی جنگ میں بھی صرف یہ یاد رکھا کہ یاسر عرفات ایک مسلمان کا نام ہے۔

بے ضمیری کے اس چہرے کا ایک اور نام۔۔۔وہ نام نہاد اہل ایمان اور مسلمان ریاستیں ہیں جنہیں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ فلسطینی انقلاب کامیاب ہوا تو ان کی اپنی عافیت گاہیں مسمار ہو جائیں گی۔ان کے اقتدار کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں کہ جمہوری اقدار کا ایک جھونکا بھی برداشت نہ کر سکیں گی۔

اور فلسطین اپنی کہانی لکھنے میں مصروف ہے. ایک نئے ویت نام کی کہانی۔ یہ کہانی کیا سناتی ہے۔

اندھیرے خیموں میں
بیڑیوں میں
جہنم کے سائے میں
انھوں نے میرے لوگوں کو قیدی بنا رکھا ہے
اور ان کا حکم ہے — کہ وہ چپ رہیں
انھوں نے میرے لوگوں کو دھمکیاں دی ہیں
فوجی کوڑے کی، یقینی موت کی اور بھوک کی
اگر حرفِ شکایت زباں پر آیا
وہ چلے گئے
مگر میرے لوگوں سے کہتے گئے
بیٹھے رہو چین سے اس جہنم میں!
یہ یتیم بچے!
انھیں دیکھ رہے ہو؟
ان بچوں نے اور بے چارگی نے
ایک دوسرے کو اپنا ساتھی بنا رکھا ہے برسوں سے
یہ دعا کرتے کرتے
تھک گئے

ان کی آواز کسی تک نہ پہنچی

ننھے بچو!

کون ہو تم؟

کس نے تمھیں یہ اذیتیں دی ہیں؟

انھوں نے کہا:

ہم تو شگفتہ پھول ہیں، جہنم کے!

انھی خیموں کے درمیان

سورج ایک دائمی راستہ نکالے گا

ان لکھو کھا انسانوں کے لیے

جنہیں وہ انسان نہیں سمجھتے

سورج اترے گا

ایک زریں قافلے کی صورت

اور پیار کے شہد سے

ہم جہنم کے شعلوں کی پیاس بجھائیں گے

رشید حسین: جہنم کے پھول

ترجمہ: شمیم حنفی

کرکٹ، کپل دیو اور پروفیسر دیوراج

عجیب اتفاق ہے کہ اس سال عابد صاحب کی برسی کے روز بنگلور میں ہندوستان اور انگلینڈ کا کرکٹ میچ برپا تھا اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کی طرف سے غالب اکیڈمی میں اسی روز ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل لیکچر کی تقریب تھی۔ عابد صاحب کو کھیلوں میں سب سے زیادہ شغف کرکٹ سے رہا۔ بیماری کے آخری زمانے میں بھی بستر پر لیٹے لیٹے کمنٹری سنتے رہتے تھے۔ جن دنوں وہ 'نئی روشنی' نکال رہے تھے، انھوں نے ہندوستان اور ایم سی سی کے درمیان ایک میچ پر معرکے کا انشائیہ بھی لکھا تھا۔ اس کا ایک جملہ یاد آتا ہے: ''ہندوستانی کھلاڑیوں نے انگریزوں کو وکٹوں کے دوران اتنا دوڑایا، اتنا دوڑایا کہ وہ تھکن سے بے حال ہو گئے۔'' یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس میچ میں ہماری ٹیم کا کیا حال ہوا تھا۔

اس بار عابد حسین میموریل لیکچر کے لیے فلسفے کے مشہور عالم پروفیسر دیوراج مدعو کیے گئے تھے۔ جلسے کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی اور اس بات سے بہت بے مزہ ہوئے کہ کہاں کپل دیو کا چھکا اور کہاں فلسفے کے ایک استاد کی دھیمی دھیمی باتیں۔ طیب جی کمنٹری کا لطف چھوڑ کر جلسے میں آئے تھے اور بہت پچھتائے تھے کہ فلسفہ تو خیر کتابوں میں بھرا پڑا ہے مگر کمنٹری دہرائی نہ جائے گی۔ جلسے کے اختتام پر نثار احمد فاروقی نے شکریے کی تقریب میں طیب جی سے معذرت کی کہ اپنی دلچسپی چھوڑ کے وہ ایک غیر دلچسپ تقریب میں آنکلے تھے۔ پھر فاروقی صاحب نے غالب کا ایک مصرعہ پڑھا:

جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں!

ہم اس قصے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ صاحبانِ نظر کم لکھے کو بہت جانیں۔ بس چلتے چلاتے ایک بات اور بتا دیں طیب جی نے اس پر بھی افسوس کیا کہ جلسے کی صدارت کے باوجود وہ صدر

کے حقوق کا استعمال اس منصب کے شایانِ شان نہ کر سکے۔ خاکسار کا مشورہ ہے کہ آگے اس نوع کے ہر جلسے میں منتظمین کو صدر کے سامنے گھنٹی ضرور رکھ دینی چاہیے —— بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے!

پروفیسر دیوراج کے لیکچر کا موضوع تھا: ہندوستان کی مذہبی اور فلسفیانہ فکر میں انسانیت دوستی کے عناصر۔ انھوں نے وید، اپنشد، گیتا، بھکتی اور اٹھارہویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ رونما ہونے والی اصلاحی تحریکوں کے حوالے سے اس سوال پر بحث کی۔ پھر بیسویں صدی میں اروبندو، ٹیگور، اقبال اور گاندھی جی کے افکار اور ان کی ترکیب کے اجزا پر نظر ڈالی۔ ہر فکری روایت کی ایک بنیادی وحدت ہوتی ہے یا ایک مرکزی نقطہ جس کے گرد اس روایت کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ اس طرح ہم جس حقیقت کو تہذیب و فکر کے ارتقا کا نام دیتے ہیں اس کا سفر دراصل سیدھی لکیر کے مطابق نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے دنیا بدلتی جاتی ہے اس دائرے کے حدود میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ زندہ روایتوں کے سفر کا یہی طور ہے اور چونکہ اس کی نوعیت سائنسی فکر یا نظریات کے منطقی اور تدریجی ارتقا کی نوعیت سے مختلف ہوتی ہے اس لیے باطنی تجربوں کی روایت یا تہذیب کا سفر کبھی کبھی پیچیدہ، مبہم اور ناقابل فہم بھی محسوس ہوتا ہے اور کسی قوم یا معاشرے کی داخلی تنظیم، ناک کی سیدھ میں دیکھنے کے عادی سماجی مفکروں کو بعض اوقات اسی لیے ایک معمہ بھی نظر آتی ہے۔ پروفیسر دیوراج نے انسانیت دوستی کے عناصر کا تجزیہ بھی خارج کی دنیا میں دکھائی دینے والے تمدنی آداب و آثار کی سطح سے ہٹ کر کیا تھا۔

بہت عرصہ ہوا عابد صاحب نے کانٹ کی کتاب "تنقید عقل محض" کا ترجمہ کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ترجمہ بھی دراصل ایک نوع کی دریافت تھی۔ عابد صاحب نے ہندوستانی تہذیب سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی فکر کی یہی رومرتعش نظر آتی ہے جس پر پروفیسر دیوراج نے اپنے لیکچر میں زور دیا۔ تمدن کے برعکس تہذیب کا بنیادی عمل انسانی وجود کے گمنام علاقوں کی زمین پر جاری رہتا ہے۔ چنانچہ اس کا حساب کتاب بھی ہم عقل محض کی گرفت سے آزاد ہو کر ہی کر سکتے ہیں۔

عابد صاحب کی ۸۷ ویں سالگرہ کے موقع پر نذرِ عابد کے عنوان سے اردو اور انگریزی میں ممتاز دانشوروں کے دو مجموعے انھیں نذر کیے گئے تھے۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر سینتی

کمار چٹرجی نے کی تھی۔ عابد صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں انسانیت دوستی اور تہذیب کے مسئلے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بھکتی اور تصوف کی مماثلتوں کا تذکرہ بھی کیا تھا اور کہا تھا:

''ان دونوں کا مرکزی نقطہ محبت کا وسیع اور ہمہ گیر تصور تھا۔ محبت خالق کی اور مخلوق کی، واجب کی اور ممکن کی، خدا کی اور انسان کی۔ اس تصور کی بنا پر ہندوستان میں ایک نئے مسلک انسانیت یا ہیومنزم کی تعمیر ہوئی، جو مغرب کی یونانی ہیومنزم سے اس امر میں مشابہ تھی کہ اس نے انسان کی ذات کو تخلیق کا مقصد اور کائنات کا مرکز قرار دیا تھا۔ اور اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس نے مقامِ عقل کو نہیں بلکہ مقامِ عشق کو زندگی کی منزلِ مقصود اور جلائے ذہن کو نہیں بلکہ صفائے باطن اور دردِ دل کو قدرِ اعلیٰ قرار دیا تھا۔ ہیومنزم کا یہ مخصوص رنگ ہمیں عہدِ وسطیٰ کے عارفوں اور شاعروں کے یہاں رچا ہوا نظر آتا ہے۔''

اسی تقریر میں عابد صاحب نے یہ بات بھی کہی تھی کہ ''تہذیب میرے نزدیک زندگی کی اعلیٰ مذہبی اور اخلاقی، علمی، جمالی اور سماجی قدروں کے شعور اور ان کے ذہنی اور عملی اظہار کا نام ہے۔'' عبرت یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ ہمارے زمانے میں بعضے نیک اندیش دانشور اور سماجی مصلح بھی تہذیب کے اندرونی عمل سے یکسر بے نیاز ہو کر اس کے مادّی عطیات کو ہی اس کا کارنامہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔

جبھی تو ''مہذب'' اقوام کے معاشرے میں آج تہذیب بے حرمت نظر آتی ہے۔ سارتر نے ہیومنزم کے تصور کو ایک نئی جہت دی تھی اور اس مسئلے کو ایک نئے تہذیبی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت کا احساس دلایا تھا۔ اپنے عالمانہ خطبے میں پروفیسر دیوراج نے بھی ہندوستان کی تہذیبی اور فکری روایت کے واسطے سے ہی اس مسئلے پر توجہ دلائی۔ مگر کیا کیا جائے کہ صدرِ جلسہ نے گھنٹی بجائی تو نہیں البتہ یہ ضرور بتا دیا کہ جہاں اس نوعیت کی باتیں ہو رہی ہوں وہاں گھنٹی بج سکتی ہے۔ پھر کرکٹ، کپل دیو اور کمنٹری کا مسئلہ بھی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں کے ساتھ انصاف کرنا سیکھ لیں۔ جس کی یاد میں یہ تقریب آراستہ ہوئی اسے بھی تو کمنٹری سننے کا بہت شوق تھا، مگر۔۔۔!

اقوام متحدہ سے ایک فلسطینی اپیل

نظم: انتونیئے جباما
ترجمہ: شمیم حنفی

آج ہم تمھارے پاس آئے ہیں
اپنی ہتھیلیوں پر فاختائیں لیے
اور اپنا وطن، فلسطین لیے
جس کی نیند ٹوٹ چکی ہے
ہم منتظر رہے، بیس برسوں تک
اور ہمیں کیا ملا — لفظ، لفظ، لفظ
ہمارے زخم ہرے ہیں
ہڈیاں ریزہ ریزہ
ہم تمھارے لیے لائے ہیں
عراق کے گلاب
دمشق کے پھول
بلبل کے نغمے — ننھی چڑیوں کی دعائیں
اور وہ تمام راتیں محبت بھری
کتنے برس ہم نے گزار دیے
بکھرے بکھرے ٹوٹے ٹوٹے
ہم جری لوگ ہیں

تمام محبتوں کے مستحق
اب یہ آخری کوشش ہے، مفاہمت کی
ہمیں مجبور نہ کرو
کہ زیتون کی یہ ٹہنی ہمارے ہاتھ سے گر جائے
ہم سب منت کرتے ہیں، ایک نئی نظر کی
بھول جاؤ کہ ہم نے اتنے برس گزار دیے
ریت کے ٹیلوں پر، پہاڑیوں پر
کیا ہوا اگر ہم عزیز رکھتے ہیں صحراؤں کو
اور قدر کرتے ہیں، بید کے درختوں کی
کیا ہوا اگر میری بہن جنت کے تاروں کا چہرہ صاف کرتی ہے
میں کیوں دیکھ رہا ہوں، اپنی دادی کو
کھلی آنکھوں سے گھورتے
اور آسمانوں میں
اپنی ماں کا بے کفن لاشہ!
ہم نے پیغمبروں کو دیکھا ہے
ویرانوں میں بھٹکتے ہوئے
جھلمل کرتے تارے
ہمارے دیس کی پاک پگڈنڈیوں پر چلتے ہیں
ہمارے مظلوم لوگ
ایک نغمہ ہیں، محبت اور دوستی کا
اور دنیا کے تمام دیسوں اور لوگوں کی طرف
وہ پیار کا ہاتھ بڑھاتے ہیں
یہ ہاتھ قلم نہ کرو
گئے دنوں میں

ایک ٹوٹے اداس دل کے ساتھ

ہم نے منتیں کیں دنیا کے تمام دیسوں سے

مگر ہمیں لوٹا دیا گیا

ان کھلے دروازوں سے

تمھارے ضمیر کو حرکت نہ ہوئی

اور جلاوطنی کی یہ اعصاب شکن زندگی

جس کا جوا ہمارے کاندھوں پر ہے

اک دیس، پھر دوسرا دیس، پھر تیسرا دیس

ان سب کا سواگت ہوا کھلے بازوؤں سے

بس ایک ہمیں تھے جنہیں جھڑکیاں ملیں

ہمارے جوانوں معصوم بچوں اور عورتوں کی منتیں

تم سنتے رہے، چپ بیٹھے رہے

اور پھر

آغاز ہوا ہماری جدو جہد کا

شہیدوں کا اور جنگ کا

مقتولوں کا اور گھایلوں کا

منتیں کم ہوتی گئیں

اور ہم نے اپنے آنسو پی لیے

بندوق کی گولیوں کی گونج

لفظوں سے تیز تر ہوتی گئی

ہمارے لوگوں پر

انصاف کا دروازہ بند نہ کرو

ہمارے زخموں کو مصلوب نہ کرو

ہمیں نفرت ہے

اس سے کہ ہمارے ساتھ وہ سلوک کیا جائے
جو روا ہے
بھیڑیوں اور شکار کے پرندوں کی خاطر
یا یہ کہ ہمیں ہر روز ذبح کر دیا جائے
بھیڑوں کی طرح
ہم بس اتنا چاہتے ہیں
کہ یہ دہشت بند ہو
اور ہماری مقدس مٹی پر
امن کا دریا رواں ہو
ہم انصاف چاہتے ہیں اور امن اور سوچ کا ایک نیا زاویہ
تمہاری وہ تمام پرانی دھمکیاں
مردم کشی کی اور ہاتھوں کو قلم کرنے کی
تمھیں کچھ بھی تو نہ دے سکیں
سوائے بندوقوں کی آواز
اور جنگی نقاروں کی صدا کے —

منٹو۔ مقدمے۔ مین را

منٹو کے ایک بھانجے تھے۔ حامد جلال۔ کچھ دن ہوئے حامد جلال کا انتقال ہوگیا۔ اردو والوں نے حامد جلال کی موت کا کوئی نوٹس نہیں لیا مگر منٹو کی موت پر حامد جلال نے جو یادگار مضمون باندھا تھا، اس کا شمار ہمیشہ اردو کے بہترین تعزیت ناموں میں ہوگا۔ نقوش کے شخصیات نمبر میں بھی حامد جلال نے منٹو ماموں کے عنوان سے جو خاکہ اردو کے سب سے تیکھے اور طرح دار افسانہ نگار کا لکھا تھا، آج تک بے مثال ہے۔ منٹو کی چند کہانیوں کے انگریزی ترجمے بھی حامد جلال نے کیے تھے۔ یہ کتاب ''دی بلیک ملک'' کے نام سے چھپی۔

منٹو کے بارے میں حامد جلال نے اپنے مضامین میں بہت سی نجی اور دلچسپ باتیں بتائی تھیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ''گندی کہانیاں'' لکھنے والا یہ انسان اپنی ذاتی زندگی میں بلا کا صفائی پسند تھا۔ لباس ہمیشہ اجلا اور بے داغ، رہن سہن ہمیشہ صاف ستھرا، شوق رئیسانہ اور مزاج کئی معاملوں میں اشرافی۔

عجیب بات ہے کہ اپنی بدنام زمانہ گندی کہانیوں میں بھی منٹو نے گرے پڑے، معمولی لوگوں کی روح کے اجلے پن کو آئینہ دکھایا ہے۔ اپنی ہر تحریر کا آغاز منٹو ۷۸۶ کے اعداد سے کرتا تھا۔ گویا کہ اس کی نیت بھی ہمیشہ بخیر رہی۔ مگر اب اسے کیا کیا جائے کہ اس پر فحاشی کے، ایک نہ دو چھے مقدمے چلے۔ کچھ برٹش انڈیا میں، کچھ ۱۹۴۷ء کے بعد مملکت خداداد پاکستان میں۔ یہ کہانیاں ہیں ٹھنڈا گوشت، کھول دو، کالی شلوار، دھواں، بو، اوپر نیچے اور درمیان۔ بعضے مقدموں کی روداد خود منٹو نے بڑے مزے لے لے کر بیان کی ہے۔ اور اس بہانے بھی کئی ایسے چہروں سے نقاب اٹھایا ہے جو انسانی روح کے اجلے پن کو کبھی دیکھ نہ سکے اور عمر بھر ظواہر پر لاحول پڑھتے رہے۔

اردو ہی نہیں، شاید ہندوستان کے کسی ادیب پر، جس نے اتنی کم عمر پائی ہو، گنتی کے چند برسوں میں اتنے مقدمے نہیں چلے جتنے منٹو پر۔ ظاہر ہے کہ یہ نہ تو خالی خولی اسٹنٹ بازی کا نتیجہ تھا، نہ شہرت کمانے کا نسخہ۔ ثقہ لوگ اسٹنٹ بازی کا نوٹس نہیں لیتے۔ اور جہاں تک شہرت کا سوال ہے، منٹو کے معاملے میں شہرت اور رسوائی کی حدیں اس کے جیتے جی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئیں تھیں۔ سرکہ جبیں حضرات لوگوں کی نظر سے بچ بچا کر منٹو کی کتابیں خریدتے اور پڑھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ منٹو کی کتابیں کھیپ کی کھیپ چھپتی رہیں اور بکتی رہیں۔ اس کے قارئین میں مولوی، منصف، طالب علم، دانشور، لڑکے، لڑکیاں، بوڑھے، جوان، امیر، غریب سبھی شامل تھے۔ مقدموں میں منٹو کے خلاف گواہیاں دینے والوں میں بعضے جید علما بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے منٹو کا نام اجنبی نہیں تھا اور انھوں نے صرف گواہی دینے کے شوق میں منٹو کی کہانیاں محض ضرورتاً نہیں پڑھی تھیں۔

اب رہی تعصبات کی بات، تو ہمارے زمانۂ طالب علمی میں یونیورسٹی کے ایک لائبریرین نے نیاز فتح پوری تک کی کتابیں خریدنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہتے تھے: ''میں نے نیاز کا لکھا ہوا ہر لفظ پڑھا ہے۔ اس کا نہایت غلط اثر نوجوانوں کے ذہن اور اخلاق پر پڑتا ہے۔'' ان بزرگ کی صورت حال کے پیش نظر ہم نے چپ چاپ اس بات پر یقین کر لیا۔

ادب میں فحاشی کا مسئلہ اتنا آسان نہیں کہ بدھو، نتھو، خیرو کی سمجھ میں آجائے۔ منٹو کی یہ کہانیاں اور ان پر مقدمات کی روداد سے قطع نظر، خود منٹو کی دفاعی تحریریں اور بیانات یہی کچھ بتاتے ہیں۔ یہ سارا قصہ طولانی بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس قصے کی تفصیلات منٹو کے مجموعوں سے لے کر بعض تعزیراتی اور قانونی رسائل تک جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

بلراج مین را، کہ منٹو کے مداحوں میں ہیں، انھوں نے یہ تمام تفصیلات جہاں تہاں سے تلاش کر کے ایک کتاب میں یکجا کر دی ہیں۔ منٹو سے ان کے شغف کا یہ حال ہے کہ برسہا برس پہلے پاکستان گئے تو سب سے پہلے منٹو کے مدفن پر حاضری دی۔ منٹو کی فحش کہانیاں اور مقدمات کی روداد شعور پبلی کیشنز کی طرف سے دستاویز کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

اس سے پہلے مین را نے شعور کا ایک پورا شمارہ منٹو کی صرف ایک کہانی ہتک کے لیے

وقف کیا تھا۔ قانون کی گرفت میں آنے والی منٹو کی چھے کہانیوں پر ہندوستان کے نامور مصور رام چندرن نے جو اسچنگز بنائی تھیں ان کا ایک فولیو بھی 'دی منٹو تھیمز' کے نام سے پچھلے برس شعور پبلی کیشنز نے نکالا تھا۔ اردو میں تا حال یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش کہی جا سکتی ہے۔

دستاویز ایک کتاب ہی نہیں ترتیب و تدوین اور طباعت کا ایک نیا معیار بھی ہے، اور یہ معیار قائم کس نے کیا، غریب اردو نے۔ روایت ہے کہ سر راس مسعود نے اپنے کسی مغربی دوست کو جب دیوانِ غالب کا ایک نسخہ دکھاتے ہوئے کہا کہ "یہ ہماری زبان کے سب سے بڑے شاعر کا مجموعہ ہے" تو وہ بزرگ فرنگی سخت سراسیمہ اور حیران ہوا۔ حیرانی اور تاسف کے چکر سے نکلا تو یوں گویا ہوا کہ "اے عزیز! ہم تو اتنا گھٹیا کاغذ ٹائلٹ پیپر کے طور پر بھی استعمال نہیں کرتے۔ تم نے اپنے سب سے بڑے شاعر کو خوب عزت دی!"

ابھی چند روز پہلے 'ٹائمز آف انڈیا میں' انگریزی کی ایک معروف ادیبہ اور خاتون جرنلسٹ کا لکھا ہوا ایک جائزہ دستاویز سے متعلق شائع ہوا ہے۔ مغربی بزرگ دیوان غالب کا غریب صورت نسخہ دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ یہ خاتون ایک غریب زبان کے فحش نگار کی ایسی صاف ستھری کتاب دیکھ کر حیران ہوئیں۔ سمتیں الگ الگ سہی، مگر دونوں کے تجربے سچے ہیں۔

پاکستان میں نوری نستعلیق ٹائپ ایجاد ہو گیا۔ اخباروں کی طباعت کمپیوٹر عہد میں داخل ہو چکی۔ ہمارے دیش میں خوش نویسی اور خطاطی کی روایت قدیمی بھی ہے، شاندار بھی۔ مگر اچھی، خوبصورت، سجل کتابیں چھاپنے کی توفیق ابھی عام نہیں ہوئی۔ پھر منٹو کا معاملہ تو یہ رہا کہ اس کی کتاب جیسی بھی چھپی ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ جب ہلدی پھٹکری کے بغیر کام چل جاتا ہے تو کون اسرافِ بیجا کا بار اٹھائے اور کتاب کی نوک پلک سنوارنے میں اپنا وقت گنوائے۔

دستاویز کا امتیاز یہی نہیں کہ منٹو کی کچھ بدنام کہانیاں اور ان کی تفصیلات اس خوبصورتی کے ساتھ چھاپی گئی ہیں یا یہ کہ کچھ کڑوے، بدہیئت حقائق کو ایسی دلآویز ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب منٹو کی بصیرت کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے اجتماعی شعور کی ایک دستاویز بھی ہے۔ زندگی کی بعض اضطراب آسا، ہولناک اور اشتعال انگیز سچائیوں کی طرف ہمارے اپنے رویے کیا رہے ہیں، سچ کے روپ بہروپ کتنے مختلف اور بے ڈھب ہو سکتے ہیں اور ادب، سچائی کی اس امانت کا تحفظ کرتا ہے تو کیسے کیسے خطروں، خرابیوں اور رسوائیوں سے گزرتا ہے، منٹو کی یہ

کتاب انہی سوالوں کا جواب فراہم کرتی ہے۔

مغرب میں یہ رسم خاصی پرانی ہو چکی کہ ادیب، شاعر، مصور، مغنی، رقاص اور موسیقار انسانی نشاط و الم کے ایک مرکز پر یکجا ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے تجربوں میں حصہ بٹاتے تھے۔ ہمارے یہاں شاعر مصوروں سے بے خبر۔ مصور ادب سے لاتعلق اور ناشر تو اپنا کام بس یہ جانتا ہے کہ کتاب چھاپ کر بیچ دی جائے۔ اس صورت حال میں دستاویز کو دیکھ کر خوشی بھی ہوئی، حیرانی بھی۔

منٹو اور اس کے مقدمات میں مین را نے ایک مصور کو بھی یوں شریک کر لیا کہ رام چندرن سے منٹو کی شامل کتاب کہانیوں پر ڈرائنگز بنوائیں۔ کتاب میں منٹو کی کہانیوں سے پہلے یہ ڈرائنگز منٹو کے تخلیقی تجربے کی ایک نئی جہت اور تعبیر پیش کرتی ہیں — حسن کی ایک ہولناک ہیئت یا تشدد آمیز حسن کا ایک مرقعہ۔

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

جس رات ہندوستان نے ورلڈ کپ جیتا ہم لوگ جاگ رہے تھے۔ جاگ رہے تھے اور مغرور آنکھوں سے ٹیلی ویژن اسکرین پر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس رات ہمارے گھر کے علاوہ راشٹرپتی بھون کے ایک کمرے میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ صدر جمہوریہ بھی جاگ رہے تھے۔ اگلے روز اخبارات سے معلوم ہوا کہ صدر جمہوریہ، جو ان اوقات میں بالعموم سوتے رہنے کے عادی ہیں، رات کے ساڑھے بارہ بجے تک جاگتے رہے اور ٹیلی ویژن اسکرین پر نظریں جمائے رہے۔ ظاہر ہے کہ قومی اہمیت رکھنے والا کوئی واقعہ، مثلاً ورلڈ کپ فائنل میچ ہو رہا ہو تو قومی ذمے داری کا تقاضہ ہے کہ صدر جمہوریہ کو جاگتے رہنا چاہیے، چاہے رات کے بارہ ہی کیوں نہ بج رہے ہوں۔ اس پائے کے کسی اور واقعے کی نظیر نہیں ملتی ورنہ قومی روزنامے ہمیں یہ اطلاع ضرور دیتے کہ صدر جمہوریہ تک جو رات کو جلد سونے اور صبح جلد بیدار ہونے کے عادی ہیں، ورلڈ کپ فائنل والی رات کے علاوہ بھی کسی رات کو ساڑھے بارہ بجے تک جاگتے رہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ رات جلد سونے اور صبح جلد بیدار ہونے سے جسمانی اور دماغی صحت بحال رہتی ہے۔ صدر جمہوریہ کی صحت قابل رشک ہے۔

ویسے تو دلّی کے بعض علاقوں میں آدھی رات کے بعد بھی دن کی جیسی چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ چور اچکے، رکشے والے، خوانچے والے، چائے پان سگریٹ والے، تماش بین، سنیما کے شوقین اور امتحان سر پر ہو تو طالب علم بھی رات دیر گئے تک جاگتے ہیں۔ انسانوں میں شاعر اور دانشور نیز پرندوں میں بھی ایک آدھ قسم ایسی پائی جاتی ہے جس کا خیال ہے کہ رات صرف سونے کے لیے نہیں ہوتی، شعر کہنے، سوچنے اور فکر کرنے کے لیے بھی ہوتی ہے۔ حیوانات میں اُلو فلسفی کہلاتا ہے۔ اہل مغرب اسے "عقل مند پرندے" کا نام دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں

ہر سوچنے والی مخلوق، وہ آدم زادوں میں ہو یا چرند و پرند میں، الو کہلاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے بات جہاں کی تہاں رہتی ہے۔ الو کو عقل مند پرندہ کہا جائے یا سوچنے کا جوکھم اٹھانے والی مخلوق کو الو کہا جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں خدمت خلق کے جذبے سے سرشار بعض اہل اقتدار نے سوچنے کے عمل کو الو کا وصف جانا۔ چنانچہ سوچنے والوں کو مجرم گردانا۔ یقین نہ آئے تو جنرل ضیاء الحق سے پوچھ لیجیے اور اس پر بھی یقین نہ آئے تو خود اپنی تاریخ کا وہ دور یاد کیجیے جب انیس مہینوں تک چاروں طرف الو بولتے رہے، اور الو کی آواز سنائی دے رہی ہو تو نیند ذرا مشکل ہی سے آتی ہے۔ کروڑوں ایک ساتھ جاگے تھے۔ جنہیں نیند پیاری تھی جان چھڑا کے بھاگے تھے۔

جس رات ہندوستانی ٹیم نے انگریزوں کو صحیح معنوں میں گھر تک پہنچایا اور جس رات ہمارے کھلاڑیوں نے ویسٹ انڈیز پر فتح کا ڈنکا بجایا، شہر دلی کی آدھی آبادی جاگ رہی تھی۔ گرچہ ان میں کسی نے اخبار والوں کو یہ بات نہیں بتائی لیکن اس سے زیادہ معتبر ذرائع سے یہ بات ہمارے علم میں آئی۔ مثلاً اگلی صبح دودھ دیر سے آیا اور گوالے نے بتایا کہ (صدر جمہوریہ اور اس حقیر وفقیر کے علاوہ) اس نے بھی رات کے بارہ بجا دیے اور اپنی بستی کی چوپال میں دوسرے گھرانوں کے ساتھ اس بے مثال کارنامے کا نظارہ کرتا رہا۔

جی ہاں، اس کارنامے کو بے مثال ہی کہنا چاہیے نہیں تو اس پر ہر خاص و عام کو اتنی حیرت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ گویا کہ ورلڈ کپ کی جیت نہ ہوئی بانجھ عورت کے گھر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔ بہت سے لوگوں نے کہا "یقین نہیں آتا کہ ہماری ٹیم نے ایسا معجزہ کر دکھایا ہے۔" اخبار نویس حقیقت کی چھان بین کے عادی ہوتے ہیں اس لیے کم وبیش ہر اخبار نویس نے ہماری ٹیم کے کپتان سے اس واقعے کی تصدیق چاہی۔ کپتان کپل دیو نے ہر اخبار نویس کے شک کو دور کرنے کے لیے ورلڈ کپ کی زیارت کرائی اور بار بار کپ کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ بے یقینی کی فضا اس کے باوجود قائم رہی چنانچہ اخباروں سے معلوم ہوا کہ ہوائی اڈے پر ٹیم کا خیر مقدم کرنے والی بھیڑ میں ایسے متشکک بھی تھے جو ورلڈ کپ کو لپک لپک کر چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ اس معاملے میں محض آنکھ کا کہا کافی نہیں ہوتا۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اور جو لوگ فلم سازی کے فن پر ہماری طرح عبور رکھتے ہیں یہ جانتے ہیں کہ پردۂ سیمیں پر

جنگ کے مناظر میں جو تلواریں دکھائی دیتی ہیں، اصلی نہیں ہوتیں۔ ویلن کے ہاتھ میں سچ مچ کی تلوار یا اسلحہ دے دیا جائے تو قصہ کچھ کا کچھ ہو سکتا ہے۔ فلم کا ہیرو سچ مچ کا ہیرو نہیں ہوتا۔ اس امر کی تصدیق امیتابھ بچن سے بھی کی جا سکتی ہے۔ امیتابھ بچن کے علاوہ اس امر کی تصدیق کا ایک آسان ذریعہ شری راجیو گاندھی بھی ہیں جنھوں نے امیتابھ بچن کے حادثے کی خبر سنتے ہی بدیس کا دورہ مختصر کر دیا تھا۔ ہر قومی شخصیت کے ساتھ یہ مصیبت رہتی ہے کہ ایک ذمے داری تمام ہونے سے پہلے ہی اچانک دوسری ذمے داری کا مسئلہ سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ترجیحات کا تعین کرے اور یہ دیکھے کہ ہر وقت قوم کے لیے کس مسئلے کی اہمیت زیادہ ہے۔ آسام کے المیے پر اسی طرح انتخابات کے مسئلے نے فوقیت حاصل کر لی تھی۔ نتائج بتاتے ہیں کہ یہ مسئلہ زیادہ اہم تھا۔

ایک معاصر روز نامے کے ہفتہ وار ایڈیشن میں ورلڈ کپ کی جیت پر ایک بزرگ کالم نگار نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ملک بھر میں اس واقعے پر جو جشن برپا ہوا، وہ معقولیت کی حدوں سے آگے نکل گیا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی فتح یا چاند پر انسان کے پہلے قدم، اور تو اور لنکا کو جیتنے کے بعد اجودھیا میں رام چندر جی کی واپسی کا جشن بھی ورلڈ کپ کی جیت کے جشن کے آگے پھیکا پڑ گیا۔ اس بزرگ کالم نگار کی قوم پرستی پر کچھ لوگ شک کا اظہار کر رہے ہیں۔ قومی یا بین الاقوامی حیثیت رکھنے والے ہر واقعے کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ ورلڈ کپ بہر حال ورلڈ کپ ہے کوئی معمولی کپ نہیں ہے۔ مگر سوچنے کی عادت مرض بن جائے تو کبھی کبھی قوم پرستی کا جذبہ قابل اعتراض شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو ہم ہندوستانی اور پاکستانی ان معاملات میں ساری دنیا سے الگ مزاج رکھتے ہیں۔ ایک بار ہماری ٹیم ہار کر آئی تھی تو مشتعل ہجوم نے ٹیم کے کپتان اور اس کے متعلقین کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ تو کہیے کہ ہمارا انتظامیہ بہت چوکس ہے اور فسادات سے قطع نظر، ایسے موقعوں پر حد درجہ مستعدی کا ثبوت دیتا ہے ورنہ کچھ عجب نہیں کہ کپتان کے گھر کو بھیڑ آگ لگا دیتی۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم بھی ایک بار فتح یاب ہو کر وطن پہنچی تو فوجی حکومت نے انعام کے طور پر ٹیم کے ہر کھلاڑی کو مفت زمینیں دیں۔ یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ ان زمینوں پر کتنے کھلاڑیوں نے مکان بنوائے اور کتنوں نے اپنے پلاٹ بیچ دیے۔ اسی طرح پچھلی بار پاکستانی ٹیم ہار کر گھر لوٹی تو

سنا ہے کہ حکومت نے سب سے جواب طلب کیا اور کھلاڑیوں میں جو سرکاری ملازم تھے ان کی نوکری خطرے میں پڑ گئی۔ حفظ ما تقدم کے طور پر کھلاڑی کو چاہیے کہ ذاتی کاروبار پھیلائے۔ کہتے ہیں کہ کپتان کپل دیو نے چنڈی گڑھ میں ہوٹل کھول لیا ہے اور کرکٹ کی دنیا میں Curry King کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

عوام خوش، حکمراں بھی مزے میں

کچھ دن ہوئے، صبح کا اخبار اٹھایا تو جلی حروف میں ایک خبر پر نگاہ ٹھہر گئی۔ خبر یہ تھی کہ جاپانیوں نے کوئی ایسا ٹھنڈا مشروب (کولڈ ڈرنک) ایجاد کیا ہے جسے پینے کے بعد گھنٹوں پیاس نہیں لگتی۔ دو گھونٹ لیے اور چلچلاتی دھوپ میں ٹھاٹ سے باہر نکل گئے۔ راستے میں کہیں پانی نہیں ملتا تو نہ ملے۔ پسینہ بہہ رہا ہو تو بہتا رہے۔ جب تک معدے میں نئی سائنس کا ایجاد کردہ کولڈ ڈرنک موجود ہے، نہ تو حلق میں کانٹے چبھیں گے، نہ راہ چلتے چلتے آنکھیں کسی نل، کنویں، آب فروش کی تلاش میں بھٹکیں گی۔ ایک ننھی سی ایجاد آدمی کو کتنی فکروں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ معدے میں جاپانی کولڈ ڈرنک ہے تو دل بھی مستغنی، دماغ بھی مستغنی۔ ہمارے علامہ اقبال نے بہت دنوں پہلے جاپانیوں کی حکمت پر رشک کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ ایشیائیوں کو اہل جاپان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔ اس پیغام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمارے دوست مجتبیٰ حسین نے جاپان چلو کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ ویسے تو مجتبیٰ حسین مزاح نگار ہیں لیکن گمان غالب ہے کہ ان کے اس مشورے میں مزاح کو دخل نہیں۔ نئی نسل کے نقادوں کا کہنا ہے کہ ہمارے دور میں مزاح اور سنجیدگی کا فرق مٹ گیا ہے۔ اختر الایمان کا خیال ہے کہ نسل تو گھوڑوں کی ہوتی ہے، آدمیوں کی نہیں۔ لیکن نیا ادیب نئی نسل کا ادیب بھی کہلاتا ہے۔

ہم نے یہ خبر پڑھی تو نہ پوچھیے خوشی سے کیا حال ہوا۔ گھر والوں، پڑوسیوں، دوستوں، یہاں تک کہ اکا دکا اجنبیوں تک کو یہ خبر سنا ڈالی۔ علم لوگوں میں جتنا بانٹا جائے، اس میں اسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اپنے علم میں اضافے کے طلب گار بھی ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس پائے کا کولڈ ڈرنک جاپانی ایجاد کرلیں اور ہم ہندوستانیوں سے اتنا بھی نہ ہو سکے کہ اس خبر کو دوسروں تک پہنچادیں۔ یہ تو کھلی ہوئی علم دشمنی ہوئی۔ واضح رہے کہ ہم ہندوستانی

علم دشمن نہیں ہیں۔ اسی لیے ہمارے تعلیمی ادارے طلبا اور اساتذہ کی کوششوں سے اکثر بند رہتے ہیں۔ جے پرکاش نرائن نے تو کم سے کم پانچ سال کے لیے یونیورسٹیاں بند کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہم نے مول بھاؤ کر کے اس سے کم وقت میں کام چلا لیا۔ البتہ پاکستان اور ایران کے طلبا، اساتذہ اور دانشوروں نے جے پی کے نادر مشورے پر عمل شروع کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علم دوستی کے معاملے میں ہمارے پڑوسی ہم سے آگے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو طول کلامی کی عادت کے سبب ایک جملے میں سما نہ سکا۔ یوں بھی جملہ معترضہ کبھی ایک جملے کا پابند نہیں ہوتا۔ بقول شاعر — بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب۔ ہمارے پیشہ ور مقرر، سیاسی لیڈر اور بیشتر ادیب اس رمز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور کم گوئی یا مختصر نویسی سے دامن بچاتے ہیں۔

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ جاپانیوں کے پیاس مارنے والے کولڈ ڈرنک کی ایجاد کا پتہ لگتے ہی ہمیں ان پر رشک آیا، اپنے حال پر افسوس ہوا۔ یہ ایجاد اگر اتفاق سے ہمارے ملک میں ہوگئی ہوتی تو کم سے کم دہلی شہر میں کارپوریشن سے شہریوں کو ایک شکایت کا موقع نہ ملتا۔ اب کے روزے سخت تھے اور پینے کا پانی کم یاب۔ اگر اس کولڈ ڈرنک کا نسخہ ہاتھ آجائے تو ایک تیر سے دو شکار کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو پینے کے پانی کی قلت کا مسئلہ حل ہو جائے گا، دوسرے بھلے برے وقتوں کے لیے کولڈ ڈرنک کی بوتلیں کام آئیں گی۔ ہمارے ملک میں سوڈا واٹر کی بوتلیں لڑائی جھگڑے کے موقعوں پر آلات حرب وضرب کا کام بھی دیتی ہے۔ اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے مواقع ہمارے روز مرہ میں شامل ہیں۔ پہلے ضرورت ایجاد کی ماں کہی جاتی تھی۔ اب اسے ایجاد کی بیٹی کہا جا سکتا ہے۔

یہ سائنس کا دور ہے۔ وہ دن دور نہیں جب اسی طرح جاپانی کوئی ٹیبلٹ بھی ایجاد کر لیں گے۔ دو گولیاں نہار منھ اس کولڈ ڈرنک کے ایک گھونٹ کے ساتھ حلق سے اتاریں اور دن بھر کی بھوک پیاس سے فارغ ہو گئے۔ اس سے ملک کے غذائی مسئلے کو حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ انقلاب فرانس سے پہلے بھوکے عوام کا شور وغل سن کر فرانس کی ملکہ میری انتوائینت نے مشورہ دیا تھا کہ ''روٹی نہیں ملتی تو کیک کھاؤ۔'' ہم یہ سن لیں گے کہ روٹی نہیں ملتی تو بھوک مارنے والی دو گولیاں لیجیے، اس کے ساتھ پیاس بھگانے والا مشروب لیجیے اور عیش کیجیے۔

سیاستداں ویسے بھی عیش کرتے ہیں کہ عملی سیاست کا شمار اب فنون لطیفہ میں ہونے لگا ہے۔ یہ ٹیبلیٹ ایجاد ہوگئی تو عوام بھی عیش کریں گے۔ عوام کا عیش حکمرانوں کے عیش کی ضمانت ہوتا ہے۔ یہ بات ہمیں ایک دوست نے بتائی جو حج کے بہانے سعودی عرب گئے تھے اور دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی دولت سے بھی مالا مال واپس آئے تھے۔ انہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسٹم والے چونکہ خود عیش و آرام کے عادی ہیں اس لیے دوسروں کے عیش و آرام میں بھی مخل نہیں ہوتے۔ عرب شیوخ کی عیش کوشی کا راز یہ ہے کہ وہاں عوام کی گزر بسر چین سے ہوتی ہے۔ حکومتیں خوفزدہ اس وقت ہوتی ہیں جب عوام بے چین ہوں۔ جاپانیوں کے نو ایجاد کولڈ ڈرنک کی طرح ہمیں ایک ایسی ہی جادوئی ٹیبلیٹ کی کتنی سخت ضرورت ہے، اس کا کچھ قیاس اشیاء اور اجناس کی قیمتوں میں روز بروز اضافے سے کیا جا سکتا ہے۔

جاپانی سائنسدانوں کو چاہیے کہ ایجادات کا یہ سلسلہ ذرا اور آگے بڑھائیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس طرح سائنس ہماری جبلتوں پر حملہ کر رہی ہے تو سنی ان سنی کر دیں۔ یہ سب پرانے وقتوں کی گھسی پٹی باتیں ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا—

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

اور ہم چونکہ مہذب ہو چکے ہیں اس لیے ایسی باتوں کی پروا ہمیں نہ کرنی چاہیے۔ ہمارے ہوٹلوں میں یہ اہتمام بھی کیا جاتا ہے کہ آدمی شکم سیر ہو کر وہاں سے نکلے تو کسی اسپتال ہی کا رخ کرے۔ اور یہ حقیقت بھی اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی کہ بہت سے لوگ مرنے ہی کے لیے اسپتال جاتے ہیں۔ چونکہ ہماری آبادی بے تحاشہ بڑھ رہی ہے اس لیے اسپتال پر اسپتال کھولے جا رہے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا بہت ضروری ہے، خواہ اس کے لیے ہمیں اور زیادہ اسپتال کیوں نہ تعمیر کروانے پڑیں۔

سائنس اگر اسی طرح ترقی کرتی رہی تو خدا نظر بد سے بچائے، وہ دن بھی دور نہیں جب ہماری تمام جبلی، جسمانی، ذہنی اور جذباتی ضرورتیں نت نئی ایجادات کی مدد سے فنا کر دی جائیں گی۔ ضرورتوں کا فنا ہونا اور ضرورتوں کا پورا ہونا دراصل ایک ہی بات ہے۔ اس معاملے میں ہمیں فقہی رویہ نہ اپنانا چاہیے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو کہاوت ہے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، اس

میں بڑی سچائی ہے۔ ہمارا مسئلہ پانی نہیں پیاس ہے، اناج نہیں بھوک ہے، اشیاء اور وسائل حیات کی کمی نہیں اس کمی کا احساس ہے۔ پیاس اور بھوک کا غیر جذباتی تجزیہ کیجیے تو آپ بھی اسی نتیجے تک پہنچیں گے کہ ان کی اصل حیثیت بھی ایک احساس کی ہے۔ جب جاپانی کولڈ ڈرنک پیاس کے احساس کو ختم کرسکتا ہے تو دوسرے تمام احساسات سے بھی ہم اسی طرح چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ یہ بات ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا دور سائنس کا دور ہے، نت نئی ایجادات کا دور ہے، علم و حکمت کی روشنی کا دور ہے۔ ہمیں اپنے سائنسدانوں سے بجا طور پر یہ امید کرنی چاہیے کہ رفتہ رفتہ وہ ہمارے تمام مسائل کا حل ڈھونڈ نکالیں گے، اسی طرح جیسے جاپانی کولڈ ڈرنک نے پیاس کا حل ڈھونڈ نکالا۔ اور ذرا اس سنہرے مستقبل کا تصور کیجیے جب بھوک پیاس بجھانے کے لیے ہمیں بس ایک ایسے اسٹور کی ضرورت ہوگی جہاں چاروں طرف خالی بوتلیں ہوں، اور ڈبے ع

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!

واجب القتل، واجب القتل

ایک رات دلی ٹیلی وژن پر ایک فلم دکھائی گئی۔ موضوع تھا جہیز کی لعنت اور اس لعنت کا شکار ہونے والی دلہنیں۔ بالعموم یہ دلہنیں جل کر مر جاتی ہیں یا جلا دی جاتی ہیں۔ یہ فلم ایک خاتون نے بنائی ہے جن کا نام میرا ہے۔ میرا بائی کے بعد ہمارے ملک کی تاریخ میں یہ دوسری میرا ہیں جن کا نام فلم بینوں تک پہنچا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میرا بائی کی زندگی پر ایک ہندی فلم بن چکی ہے۔ ہمارے زمانے کی میرا نے یہ فلم اپنی یا کسی کی زندگی پر بنانے کی بجائے نوجوان دلہنوں کی موت کو فلمایا ہے۔ فلم میرا میں میرا بائی کا رول ہیما مالنی نے کیا تھا اور سنا ہے غضب کا رول ادا کیا تھا۔ جہیز کے مسئلے پر اپنی فلم میں میرا نے جن اداکاروں سے کام لیا ہے ان کا رول بھی غضب کا ہے۔ خاص طور پر اسپتال کے بیڈ پر پھنسی پھنسی آواز میں باتیں کرنے والی نوجوان لڑکی کا رول۔ اس فلم میں بتایا گیا ہے کہ اس لڑکی کے سسرال والوں نے مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے حساب سے تو ختم ہی کر دیا تھا لیکن اگر یہ لڑکی ختم ہوگئی ہوتی تو فلم ادھوری رہ جاتی۔ اس لڑکی کے بال اور کھال بری طرح جل چکے ہیں۔ پورے جسم پر آبلے ہیں۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگنا چاہیے تھا، نہیں لگا۔ شرم آنی چاہیے تھی، نہیں آئی۔ عبرت پکڑنی چاہیے تھی، نہیں پکڑی۔ بس فلم دیکھتے رہے۔ بقول شاعر ؏

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

وغیرہ وغیرہ۔ ہندی فلموں میں مار دھاڑ، قتل، آتش زنی کے واقعات برابر دیکھتے رہنے سے فائدہ یہ ہوا کہ اس فلم میں بھی تماشائی کی دلچسپی شروع سے اخیر تک قائم رہتی ہے۔ فلم کے غیر دلچسپ حصے وہ ہیں جہاں لمبے لمبے بیانات یا مکالمے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر، جل کر مرنے والی ایک دلہن کے والدین یہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں

ٹیلی ویژن دیا تھا (کیا عجب کہ لڑکی کے سسرال والوں نے اسی ٹیلی وژن پر یہ فلم دیکھی ہو) ریفریجریٹر دیا تھا اور نقدی بھی دی تھی۔ اس انٹرویو کے بعد ہی ادھیڑ عمر کی ایک خاتون کا بیان ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں ایسے والدین سے کوئی ہمدردی نہیں ہونی چاہیے جو جہیز کی رسم کو زندہ رکھتے ہیں، پھر اپنی بیٹی کی موت کا ماتم کرتے ہیں، لیکن ''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔'' دیکھیے غالب نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔ اس فلم میں بھی موت کے مناظر نہ ہوتے تو دنیا کے مہذب ملکوں نے فلم کو اتنے انعامات نہ دیے ہوتے۔ موت کے مناظر نے فلم میں جان ڈال دی ہے۔ فلم ٹیلی وژن اسکرین پر جتنی دیر چلتی رہی ہم آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھتے رہے۔ اس فلم کے مناظر سب کے سب سچے تھے۔ اس فلم میں جو لاشیں دکھائی گئی ہیں وہ فلم کو ملنے والے انعامات اور اعزازات کا لطف نہ اٹھا سکیں گی۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ فلم کے اداکاروں کو اس فلم میں کام کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ اسٹوڈیو کے اخراجات صفر کے برابر ہوئے ہوں گے کیونکہ اس فلم میں جو واقعات دکھائے گئے ان کے لیے کوئی سیٹ تیار نہیں کیا گیا۔ ہر صبح کا اخبار یہ بتاتا ہے کہ جہیز کی ہوس کے نام پر ہمارے ملک میں اوسطاً ہر روز دو نوجوان لڑکیاں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر آگے بھی باآسانی فلمیں بنائی جا سکتی ہیں۔ ہمیں اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

ہر روز صبح اخبار آتا ہے تو نگاہیں سب سے پہلے اسی قسم کی خبروں پر ٹھہرتی ہیں۔ جل کر مرنے والی دلہنیں، حادثوں میں مرنے والے، لڑائی دنگوں میں مرنے والے، قتل، غارت گری، چوری، ڈکیتی، خون خرابہ۔ ان خبروں کے بغیر اخبار کا صفحہ سونا سونا دکھائی دیتا ہے اور اخبار بینوں کی دلچسپی قائم نہیں رہتی۔ ایک فرانسیسی ادیب اور مفکر کا قول تھا کہ آگے آنے والے زمانوں میں جب ہمارے دور کو یاد کیا جائے گا تو کہا جائے گا کہ اس دور کے لوگ اخبار بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ایک اور شوق جس کا ذکر اس ادیب نے ہمارے دور کے حوالے سے کیا ہے وہ آج کے انسان کی جنسی اور جبلی زندگی سے متعلق ہے۔ اس شوق کا ہمارے موضوع سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں اس لیے پھر ہم اصل مبحث کی طرف آتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے زمانے میں اخبار بینی کا مشغلہ بہت مقبول ہے۔ اس مشغلے کو ترقی دینے میں قتل، غارت گری، آتش زنی کے واقعات نے غیر معمولی خدمت انجام دی ہے۔ ہمیں خدا کا شکر ادا

کرتے رہنا چاہیے۔

پرانے وقتوں میں لوگ عام طور پر غیر مہذب ہوتے تھے۔ اخبار نہ چھپتے تھے نہ پڑھے جاتے تھے۔ قتل، لوٹ مار، زنا کاری کا ایک واقعہ ہو جاتا تھا تو مہینوں دہرایا جاتا تھا۔ انسان نے ذہنی اور فکری طور پر اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کے انسان نے سائنس اور حکمت کے میدان میں بے مثال ترقی کی ہے۔ قتل اور غارت گری کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ ان طریقوں میں خلاقی (Originality) کا عنصر بہت نمایاں ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ ہمیں شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی قتل، غارت گری اور موت کی اجتماعی واردات سامنے آتی ہے، سائنس اور حکمت کی طرح شعر و ادب کا کاروبار بھی زوروں پر ہوتا ہے۔ قحط بنگال اور سن سینتالیس کے فسادات کا اثر ہمارے اپنے ادب پر بہت خوشگوار ثابت ہوا تھا۔ اس زمانے میں ترقی پسند ادب اور ادیبوں نے بہت ترقی کی۔ یہ بازار سرد ہوتے ہی ادب پر جمود غالب آ گیا۔ یہ جمود ہمارے ادب کو بہت مہنگا پڑا۔ حیوانات و نباتات جمادات بن گئے۔ مولانا روم کا ارشاد ہے کہ تخلیق کائنات کے سلسلے کی پہلی کڑی اقلیم جماد ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم لوگ آج بھی تہذیب اور انسانیت کی تخلیق کے اسی پہلے موڑ پر ہیں۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ ہماری قوم ترقی پذیر قوم کہلاتی ہے۔

ابھی حال میں علی گڑھ سے سہ ماہی ''انکار'' کا دوسرا شمارہ شائع ہوا۔ اس شمارے مین قرۃ العین حیدر کا ایک عالم آشوب بھی ہے۔ اس کا عنوان ہے ''قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آئی ہے۔'' اب اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھے قرۃ العین حیدر کا ایک اقتباس دیکھیے۔ لکھتی ہیں:

> ''آج کی نسل اس لفظ مرگ سے مسحور ہے۔ ان سب کو مرگ پسند اور Brutalise کس نے کیا؟ آپ نے۔ اور آپ نے۔ اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں۔ راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے۔ واجب القتل ہیں۔ ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے۔ سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ تقدیر اپنی عمر قضا پوچھ رہی۔ قتل کر دیے گئے۔ ان نوجوانوں کی مرگ طرح طرح کے بھیس میں آ رہی ہے۔ بندوقچیوں کی باڑھ، شہری فسادی کا

چھرا، پولس کا این کاؤنٹر اور خانہ ساز پستول (مجھ کو تو خانہ ساز دیے) اور
کیسری وردیوں میں ملبوس پریڈ کرتے ہوئے نوجوان ۔''

گویا کہ اب پھر قتل وغارت گری کا سنہرا دور آیا ہے ۔ایران، پاکستان، افغانستان، فلسطین اور اب دیکھیے، سری لنکا۔ بیچ میں سمندر کی بس ذرا سی پٹی ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی اس صف میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں ۔مثال کے طور پر آسام ۔لیکن ہم ہندوستانی امپورٹیڈ چیزیں بہت پسند کرتے ہیں ۔اسی لیے ہمارے اخباروں میں بھی کلر ٹیلی ویژن اور وی سی آر کی طرح ایسی خبریں دوسرے ملکوں کے حوالے سے زیادہ آتی ہیں ۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ایک سبب ہماری روایتی کسر نفسی بھی ہے ۔صاحب! ہم کیسا اور ہماری بساط کیا۔ مگر کسر نفسی سے کام لینے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم سچ مچ اس معاملے میں دوسروں سے کم تر ہیں ۔انکسار بہت بڑی دولت ہے ۔اپنے منہ میاں مٹھو بننا بہت بری بات ہے ۔

ایران میں بہائیوں پر ستم توڑے جاتے ہیں ۔ پاکستان میں حریت فکر پر ۔افغانستان میں، فلسطین میں، آسام میں، سری لنکا میں ۔ ہر جگہ انسانی خون بہت سستا ہے ۔ جیسے جیسے اشیاء کا نرخ بڑھتا جاتا ہے، آدمی کی قیمت کم ہوتی جاتی ہے ۔گراں بازاری کے اس دور میں جب ہر چیز مہنگی ہے، چلیے کچھ تو ایسا ہے جسے سستا کہہ سکیں ۔اس میدان میں بھی گرانی کا چلن ہوتا تو اخبار والوں کو خبریں نہ ملتیں ۔صبح صبح، ناشتے کی میز پر اخبار کتنا ویران نظر آتا ۔جس روز اخبار میں ایسی خبریں نہ ہوں، کچھ مزا نہیں آتا ۔کسی بھی فلم میں غیر دلچسپ مناظر زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیے جاسکتے ۔

واجب القتل، واجب القتل، واجب القتل ۔ جدھر دیکھیے اس جادوئی کلمے کی گونج ہے —
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو ۔علامہ اقبال نے اس سوال کا جو جواب دیا تھا، قرائن بتاتے ہیں کہ آخر کو غلط نکلا ۔قصہ آدم کو .... نے رنگین کیا ہے ۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ آدمی اشرف المخلوقات ہے ۔اور ہمارے دور میں تو واقعی آدمی نے بہت ترقی کی ہے اور بہت مہذب ہو گیا ہے —

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو

پبلک کے اصرار پر

ایک صاحب کو الیکشن لڑنے کا بہت شوق تھا۔ میونسپل بورڈ سے لے کر پارلیمنٹ تک درجنوں الیکشن لڑ ڈالے۔ آدمی وضع دار تھے۔ پہلی کوشش میں ناکام رہے تو آخری کوشش تک یہ وضع نبھائی۔ جیت کو منھ نہ لگایا۔ ہم نے ایک روز از راہ ہمدردی کہا، ہر الیکشن میں آپ ہزاروں روپے لٹاتے ہیں۔ مانا کہ یہ روپیہ بلیک کا ہوتا ہے اور اب روپے کی حیثیت اٹھارہ پیسوں کی ہے، لیکن روپیہ بہرحال روپیہ ہوتا ہے۔ کچھ تو خیال کیجیے۔ یہ سن کر وہ پل دو پل خاموش رہے۔ پھر بولے: ''حکیم الامت نے فرمایا تھا، جو مزہ کبوتر پر جھپٹنے میں ہے، کبوتر کے لہو میں بھی نہیں۔''

یہ دلیل دندان شکن تھی۔ ہم پسپا ہو گئے۔ اپنی خفت مٹانے کے لیے ہم نے ہنستے ہوئے کہا، ''صاحب! مانا کہ آپ کبوتر بازی کے فن میں طاق ہیں، لیکن کسی بھول چوک کے نتیجے میں اگر جیت گئے تو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''تو — تو کیا ہوا میں ملک کا سیاسی ماحول درست کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار بس پارلیمنٹ میں پہنچ بھر جاؤں۔ ایک مچھلی پورے تالاب کو گندا کر سکتی ہے!''

یہ دوسری دلیل تھی، مزید دندان شکن۔ وہ صاحب فاتحانہ تبسم کے ساتھ بڑے سمجھ ناک انداز میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے پھر بولے — ''آخر پبلک کا اصرار بھی تو کوئی چیز ہے!''

اب ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یوں ان بزرگ کے معاملے میں پبلک کے اصرار کی گواہی ہم بھی دے سکتے ہیں۔ ایک بار انھوں نے جب میونسپل بورڈ کی ممبری کا الیکشن لڑنا چاہا تو دوست احباب منع کرتے رہے، نجومیوں اور دست شناسوں نے اس ارادے سے باز رہنے کا مشورہ دیا، والدین ان کی صورت دیکھنے کے روادار نہ رہے، بیوی نے قطع تعلق کی دھمکی دی لیکن بقول شخصے:

جب سے پی ہے پی رہا ہے آج تک
شیخ بھی ہے آدمی کردار کا

پبلک کے اصرار پر الیکشن میں کود پڑے اور شان سے لڑے۔ مال غنیمت کے طور پر ایک ووٹ ہاتھ آیا۔ یہ ان کا اپنا ووٹ تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اس عمل کو اخلاقی تائید حاصل تھی۔ اس تائید کا سہرا انہی کے سر رہا۔ جس شخص نے ان کا نام تجویز کیا تھا وہ ووٹ دینے کے لیے گیا ہی نہیں۔ بیوی روز روز کی الیکشن بازی سے تنگ آ کر ان کے مخالف امیدوار کو ووٹ دے آئیں۔

اگلے الیکشن میں انھوں نے جب ایک بار پھر پبلک کے اصرار کا قصہ چھیڑا تو ہم نے کہا۔ ''ذرا پبلک کی تعریف بھی کر دیجیے۔'' فوراً سمجھ گئے کہ ہم اس پبلک کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو انہی کی ذات والا صفات تھی۔ سنجیدگی سے بولے۔ ''اپنے منھ سے اپنی تعریف کیا کروں؟ شاعر مشرق کا قول ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق۔ ہمیں ہنسی آگئی۔ چڑ کر کہنے لگے۔ ''جناب! آپ ان اسرار کو کیا سمجھ سکتے ہیں؟ کبھی کبھی پبلک آفاق کی طرح مومن کی ذات میں گم بھی ہو جاتی ہے۔ رہی یہ شکست، تو میرے ووٹر بر بنائے بے تکلفی مجھ سے اکثر مذاق کر بیٹھتے ہیں۔'' اب ہم کیا کہتے، ہماری سمجھ میں علامہ کے بہت سے اشعار اس وقت آتے ہیں جب ان کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر ان کی پے بہ پے دنداں شکنی کے نتیجے میں ہم پوپلے ہو چکے تھے۔ بس چپ ہو رہے۔

کچھ ایسا ہی حال ہمارا اس روز ہوا جب اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ بہار کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ نے پریس بل واپس لے لیا۔ اس موقعے پر بیان دیتے ہوئے انھوں نے بھی وہی پبلک کے اصرار کی بات کہی۔ اس سے پہلے پبلک کے اصرار ہی پر انھوں نے یہ بل پیش کیا تھا۔ مگر یہ بات اس وقت کی ہے جب وہ خود پبلک تھے۔ یاد رکھیے کہ ہمارا ملک ایک ری پبلک ہے۔ ری پبلک میں پبلک جو چاہے کر دکھائے۔ پبلک کو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہوتی ہے، جیسے سوویت ری پبلک میں۔ اسی طرح نئی اسلامی ری پبلک بھی ہیں۔ ایسے تمام ممالک پبلک کو یہ آزادی دیتے ہیں کہ حکومت سے وفاداری کا برملا اظہار کرے۔ حکومت کے ہر قول و فعل کی جی جان سے تائید کرے۔ اختلاف رائے کی صورت میں پبلک کو چپ رہنے کی آزادی ہے۔ پبلک کے حقوق کا احترام اسی طرح کرنا چاہیے۔ اس سے پبلک اور ری پبلک دونوں محفوظ رہتے ہیں۔

ادھر وہ خبر بھی آہی گئی جس کے سلسلے میں مہینوں سے اب آئی تب آئی لگا ہوا تھا— کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے۔ خبر یہ ہے کہ ڈاکٹر جگن ناتھ نے پبلک کے اصرار پر وزارت اعلیٰ کا بار اپنے ناتواں کندھوں سے جھٹک دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس بار پبلک سے مراد پارٹی ہائی کمان ہے۔ پبلک کے اصرار پر آئے تھے، پبلک کے اصرار پر گئے۔ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں۔ خدا اوروں کو بھی جگن ناتھ بنائے۔

جنرل ضیاء الحق بھی پبلک کے اصرار سے مجبور ہیں۔ اللہ والے آدمی ہیں۔ اقتدار سے انھیں مطلق دلچسپی نہیں۔ ڈنکے کی چوٹ پر کہہ چکے تھے کہ نوے دن کے اندر اندر اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپ دیں گے اور اللہ اللہ کریں گے۔ مگر، مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایک تو وہ خود پبلک ہیں، دوسرے وقت کا تصور برسوں پہلے تبدیل ہو چکا ہے۔ علامہ اقبال نے فرمادیا تھا کہ وقت کو پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں ناپنا چاہیے۔ پبلک اصرار پر اصرار کیے جاتی ہے تو جنرل ضیاء الحق کریں بھی کیا؟ یوں سارے اختیارات سے وہ پہلے ہی دست کش ہو چکے ہیں۔ اس نیک بندے کو تو یہ اختیار بھی حاصل نہیں کہ ایک ذرا سا الیکشن جیت لے۔

دور کیوں جائیے، خود ہمارے اپنے راجیو گاندھی صاحب اول درجے کے پائلٹ تھے۔ آسمانوں میں اڑتے پھرتے تھے۔ پبلک کے اصرار نے انھیں زمین پر لا گرایا۔ اب پبلک ہے کہ مسلسل ان سے اصرار کیے جارہی ہے۔ زبردستی انھیں پارٹی کا جنرل سکریٹری بناڈالا۔ پبلک کبھی کبھی سچ مچ بڑی زیادتیاں کرتی ہے، لیکن پبلک کے جذبات کا احترام ہر سیاست داں کرتا ہے۔ پبلک کا اصرار بہر حال پبلک کا اصرار ہے۔

ہم آئے دن پبلک کے اصرار کا تماشہ عام زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر—

(۱) ہر سیاستداں پبلک کے اصرار پر سیاست میں داخل ہوتا ہے۔ پھر خود پبلک بن جاتا ہے اور اس میدان میں ڈٹا رہتا ہے۔

(۲) ہر سیاست داں پبلک کے اصرار پر سیاست سے ریٹائر ہوتا ہے۔

(۳) ہر شاعر مشاعرے میں پبلک کے اصرار پر کلام سناتا ہے۔ پبلک کا اصرار ہی بعضوں کو اسٹیج سے ہٹاتا ہے۔

(۴) بہت سے شاعر اور ادیب پبلک ہی کے اصرار پر اپنی کتاب چھپوانے کی مصیبت مول لیتے ہیں۔ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو نام و نمود کی ہوس کبھی نہیں ہوتی۔

(۵) بہت سے مقرروں کو تقریر کا شوق نہیں ہوتا۔ پبلک کے اصرار پر گھنٹوں بولنا پڑتا ہے۔ پبلک ہی کے اصرار پر اسے چپ بھی ہونا پڑتا ہے۔

(۶) مارشل لا، ایمرجنسی یا مفید مطلب قوانین کے نفاذ کا سبب ہمیشہ پبلک کا اصرار ہوتا ہے۔

(۷) مارشل لا، ایمرجنسی اور مفید مطلب قوانین کے خاتمے کا سبب بھی ہمیشہ پبلک کا اصرار ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ پبلک کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔

(پس نوشت: یہ کالم بھی پبلک کے اصرار پر لکھا جاتا ہے۔ راقم الحروف اپنی عدیم الفرصتی کے سبب اس خدمت سے گریزاں تھا۔ پبلک کے اصرار نے مجبور کر دیا۔ آپ چاہیں تو پبلک سے مل کر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہ پبلک سات روزہ ہجوم کے دفتر میں موجود رہتی ہے۔ ملنے کے اوقات صبح پانچ بجے سے اگلی صبح پانچ بجے تک)۔

تھوڑی چالاکی، تھوڑی دنیاداری اور بہت سی بے غیرتی

بات آزادی کے چند برسوں بعد کی ہے۔ کسی ستم ظریف نے ایک سوال نامہ ترتیب دیا۔ اس سوالنامے کا تخاطب صوبائی اسمبلیوں کے اراکین لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں عوام کے نمائندوں، سیاسی کارکنوں اور ان عجوبہ روزگار انسانوں سے تھا جو لیڈر کہلاتے ہیں۔ سوالنامہ ترتیب دینے والے کو یہ خیال نہ آیا کہ جن لوگوں سے اس عزیز نے جواب طلبی کی ہے۔ ان میں ایسے باکمال افراد بھی شامل ہیں جنھوں نے لکھنے پڑھنے کی عادت کو کبھی منھ نہ لگایا۔ بعضوں کی تعلیمی لیاقت الف سے لٹھ کے آگے نہ گئی۔ ان دنوں ٹیپ ریکارڈر کی وبا عام نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سوال نامہ ٹیپ کر دیا جاتا۔ وہ لوگ حرف شناسی کے قہر سے محفوظ تھے۔ کیسٹ پر سوالنامے سنتے۔ کیسٹ ہی پر اپنا جواب ریکارڈ کرواتے اور سوالنامہ ترتیب دینے والے کو بھیج دیتے۔ اگر کسی جواب پر لعن طعن ہوتی تو بچاؤ کی ایک صورت بھی تھی۔ صاف کہا جاسکتا ہے کہ آواز میری نہیں ہے۔ یا یہ کہ عوامی جلسوں میں میری تقریروں کو ٹیپ کر کے۔ الگ الگ تقریروں سے الگ الگ لفظ چن کر جملے بنا دیے گئے ہیں۔ سائنسی ایجادات نے اس قسم کے ہزاروں سہولتیں پیدا کر دی ہیں۔ ہر ترقی یافتہ قوم، قبیلہ، شخص ایسی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

خیر، تو ہوا یہ کہ چھپا ہوا سوالنامہ تقسیم کر دیا گیا۔ کچھ نے اس کا جواب خود لکھا، کچھ نے دوسرے سے لکھوایا۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ تمام معروف لیڈر اپنی تقریریں اکثر دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو گائے بھینسوں کی افزائش نسل اور قدیم ہندوستان میں سائنس کی برکتوں کے موضوع پر تقریروں کا معیار ایک جیسا نہیں ہوسکتا تھا۔ سیاسی لیڈر کلچر سے لے کر ایگریکلچر تک، ہر مسئلے پر بے تکان بول سکتا ہے۔

اس سوالنامے میں ایک سوال تھا — ''آپ کا پیشہ کیا ہے؟'' ایک اور سوال تھا — ''آپ

نے اپنے دیس سے باہر کن دیسوں کا سفر کیا؟'' ان دو سوالوں کے جواب میں صوبائی اسمبلی کے ایک رکن نے لکھا تھا — ''میرا پیشہ پالیٹکس ہے! اور اپنے دیس بھر میں سفر کے علاوہ میں نے بہت سے بدیسی سفر کیے ہیں۔ رائے بریلی، ڈومریا گنج، مئوناتھ بھنجن، مگھر اور بہرائچ بھی جا چکا ہوں۔''

یہ جواب اردو کے ایک روزنامے میں شائع بھی ہوئے۔ جواب ہی ایسے تھے کہ انھیں خبر کا درجہ دیا گیا۔ جس روز ہم نے یہ اخبار دیکھا، ہمارے اس گمان کی تصدیق ہوئی کہ اب سیاست نے ہمارے ملک میں سچ مچ ایک پیشے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

انسانی تاریخ کا سب سے پرانا پیشہ جسم فروشی ہے۔ نئے پیشے اور بھی ہیں لیکن ان میں جو شہرت، مقبولیت، عزت، سیاست کے پیشے کو نصیب ہوئی ہے اس کا جواب نہیں۔ سیاست کے پیشے اور جسم فروشی میں ایک بات مشترک ہے۔ یہ دونوں کاروبار بغیر کچھ خرچ کیے، بغیر کوئی سرمایہ لگائے شروع کیے جا سکتے ہیں۔ آپ مدرس، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، اسمگلر بننا چاہیں تو پہلے کچھ تربیت حاصل کرنی ہوگی۔ اپنی گرہ سے کچھ مال خرچ کرنا ہوگا، کچھ سہارے تلاش کرنے پڑیں گے۔ لیکن سیاسی کارکن پیدائشی سیاست باز ہوتا ہے۔ اس پیشے کے پہلے مرحلے پر وہ جلسوں میں دری بچھاتا ہے۔ آخری مرحلے پر دوسروں سے دری بچھواتا ہے اور بقول اکبر قوم کے غم میں حکام کے ساتھ ڈنر کھاتا ہے۔ اس کامیابی تک پہنچنے کے لیے بس تھوڑی سی ذہانت، تھوڑی سی چالاکی، تھوڑی سی دنیاداری اور بہت سی بے عزتی درکار ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں خدا کے فضل سے بے مول مل جاتی ہے۔ وہ لوگ جو فانی کی طرح خم ٹھونک کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ — ''موت ملے تو مفت نہ لوں، ہستی کی کیا ہستی ہے''۔ ان کی شخصیت میں یکجا صفات کا کوئی تعلق آپ اپنی شخصیت سے نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جو بیوقوف نہیں ہوتے ایسوں کو بیوقوف کہتے ہیں۔

سیاست کے پیشے میں کتنی برکت ہے، اس کا اندازہ ایک انگریزی ہفتہ وار میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ سے ہوا۔ رپورٹ میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ یہاں سے دور، پورب میں جہاں سدھارتھ کو گیان حاصل ہوا تھا، اسی دیار کے آس پاس کسی کسان کے گھر ایک گیانی بیٹے نے جنم لیا۔ کسان کے پاس دس پانچ بیگھہ زمین تھی۔ ہم نے ایک فلم میں دیکھا کہ بلراج ساہنی کے پاس دو بیگھہ زمین تھی۔ حالات نے پلٹا کھایا تو یہ زمین

بھی ہاتھ سے نکل گئی۔ لیکن فلم کی باتیں جھوٹی باتیں ہوتی ہیں۔ پورب دیس کے اس کسان کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اس کا بیٹا تھوڑی سی ذہانت، تھوڑی سی چالاکی، تھوڑی سی دنیاداری اور بہت سی بے غیرتی سے مالامال پیدا ہوا تھا۔ سیاست ایسا چھپر ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ پھٹتا ضرور ہے اور پھٹتا ہے تو اوپر سے دھن دولت کی بارش ضرور ہوتی ہے۔ کسان کے بیٹے نے بھی وہ دن دیکھ ہی لیا کہ چھپر پھاڑ کر دُھن برسا۔ تھوڑی سی زمین ہوتے ہوتے ایک لمبی چوڑی ریاست میں تبدیل ہوئی۔ تین برس کے اندر اندر اس گیانی بیٹے نے بیس کروڑ کی دولت جائیداد اکٹھی کر لی۔ اس گیانی بیٹے کا مزید گیانی بیٹا اپنے باپ سے بھی دس ہاتھ آگے ہے۔ سبزی بھاجی کی طرح دشمنوں کے سر اڑا دیتا ہے۔ بڑے بڑے سرکاری عہدے دار اس کے نام سے کانپتے ہیں۔ اپنی من مانی کرتا ہے۔ بس اس دن سے ڈرتا ہے جب اس دیس میں سیاست کا پیشہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔

ایسا کبھی ہوگا یا نہیں، ہم کسی نجومی سے پوچھ کر بتائیں گے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ اپنی زمین اس پیشے کی فصل اگانے کے لیے بہت مناسب ہے۔ جس کسی نے اس کاروبار میں ہاتھ ڈالا نہالوں نہال ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ:

الف: ہر سیاستداں کی صحت قابل رشک ہوتی ہے۔

ب: ہر سیاستداں کے چہرے پر آسودگی دکھائی دیتی ہے۔

ج: ہر سیاستداں دو چار برس کے اندر اندر جائیدادیں کھڑی کرتا ہے۔

د: ہر سیاستداں کے گھر پر صبح سویرے بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔

و: ہر سیاستداں خوش خور ہوتا ہے۔

ز: ہر سیاستداں عوام کو بے وقوف سمجھتا ہے۔

حاصل کلام:۔

اس کہانی سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ سیاست کا پیشہ ہمارے یہاں دوسرے تمام پیشوں سے اونچا ہے۔ ہم اس کہانی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

دانشوروں کا سرکس

چند روز پہلے دلی دوردرشن پر نوجوانوں کا ایک پروگرام پیش کیا گیا۔ پانچ چھ لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ایک مرد بزرگ سے نوجوان سوال کرتے تھے۔مرد بزرگ جواب دیتا تھا۔نوجوان اپنی کوئی دلیل پیش کرتے تھے۔مرد بزرگ اس دلیل کے سامنے اپنی دلیل کھڑی کر دیتا تھا۔مسئلہ یہ تھا کہ نوجوان نسل تعلیمی اداروں میں،معاشرے میں،روزگار کی تلاش میں جن دقتوں سے دو چار ہے،ان کا تدارک کیسے ہو؟تعلیمی اداروں میں جو تعلیم دی جاتی ہے،جس طرح دی جاتی ہے،وہ اس کے دل و دماغ کو روشن نہیں کرتی۔استاد یا تو ترقی کے پھیر میں پڑا رہتا ہے یا پھیری لگانے میں۔

پڑھنا پڑھانا شوق فضول ٹھہرا۔جس نے اس شوق کو منھ لگایا احمق کہلایا۔دانشمند وہ ہے جو پڑھنے پڑھانے میں وقت برباد کرنے کے بجائے اصحاب اقتدار کے آستانوں پر حاضری دے۔اشتہار بازی کی صنعت سے فائدہ اٹھائے۔جن مناصب پر خود نہ بیٹھ سکے وہاں اپنے مہرے بٹھائے۔ضرورت مند نوجوانوں کو جو رعایت دے،اس کے دام لگائے وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح دانشور کے رول پر بھی باتیں ہوئیں۔دانشور ہمارے معاشرے کا نہایت معزز جانور ہوتا ہے۔اسے تلاش ہوتی ہے ایسے درجات کی جہاں وہ مزید معزز نظر آئے۔ایسے وسائل کی جو اسے فکر معاش سے بے نیاز کر سکیں،ایسے احوال کی جہاں وہ آرام سے بیٹھ کر زمانے بھر کے دکھوں کا تجزیہ کر سکے،ایسے سامعین کی جو اس کے ارشاداتِ عالیہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔چنانچہ اول درجے کا دانشور وہ ہے جو اول درجے میں یا ہوائی جہاز سے سفر کر سکے۔جو بہت سی کمیٹیوں کا رکن،صدر یا طلب گار ہو،جو سادے پانی کے علاوہ سب کچھ پینا پسند کرتا ہو مثلاً کافی،پائپ،چار مینار سگریٹ،شراب،جو سامعین کی تلاش میں جلسوں،کافی ہاؤسوں،اداروں کے چکر لگاتا پھرے وغیرہ

وغیرہ۔

جہاں تک ملازمتوں کی حصولیابی اور بے روزگاری کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں نوجوان طرح طرح کے تجربات سے دوچار ہوتے ہیں۔ خالی جگہوں کے اشتہارات بعد میں دیے جاتے ہیں، ان کی خانہ پری پہلے کر دی جاتی ہے تاکہ کسی نوجوان کا مسئلہ تو حل ہو اور بے روزگاروں کی تعداد میں کچھ تو کمی آئے۔ اس معاملے میں ہمارے ملک کا نظام بہت چوکس ہے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدیدار، سیاسی رہنما، وزرا، سفرا، چھوٹی بڑی ہر قسم کی ملازمت کے لیے سفارش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جہاں سفارش سے کام نہ چل سکے، کہا جاتا ہے کہ دعوت تواضع، نذر نیاز سے کام چل جاتا ہے۔ یہ صورت حال بہت امید افزا ہے۔ اس طرح حاجت مندوں اور حاجت رواؤں کے مابین تعلقات مضبوط ہوتے ہیں۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے دوسروں کی خدمت کے جذبے کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آیئے اس وغیرہ وغیرہ پر۔ ابھی حال میں ایک نوجوان کا قصہ اخباروں میں چھپا تھا۔ ملازمت کے لیے اس نے انٹرویو دیا۔ اس کے جوابات سے لوگ خوش ہوئے لیکن اس کا انتخاب نہ ہو سکا۔ سبب یہ بتایا گیا کہ نوجوان اپنے قیافے اور نام و نسل سے سبزی خور نظر نہیں آتا۔ ایک افواہ یہ سنی گئی کہ کسی اچھی جگہ پر انٹرویو کے لیے آئے ہوئے ایک نوجوان سے کہا گیا ''مبلغ پچاس ہزار کا بندوبست کر لو۔ ملازمت مل جائے گی، پھر لاکھوں میں کھیلو گے۔'' ذات پات، رنگ و نسل، مذہب و ملت، صوبے اور علاقے کی بنیاد پر جب ملازمتیں دی جائیں گی تو نوجوان اپنی شناخت کے بحران (Crisis of Identity) سے محفوظ رہیں گے۔ اپنی حقیقت سے آگاہ ہوں گے۔ خود آگاہی پر کم و بیش ہر مذہب زور دیتا ہے۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے خود آگاہی نہایت ضروری ہے۔

یہ مشینی عہد ہے۔ مشینی عہد کی پہچان یہ ہے آدمی بھی مشین بن گیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اب اچھی مشینیں بننے لگی ہیں۔ اب تعلیمی اداروں میں استاد اور طالب علم دونوں کا رویہ مشینی ہوتا ہے۔ قومی ترقی کے لیے یہ رویہ بہت کارآمد ہوتا ہے۔ مشین کی خوبی یہ ہے کہ ہر طرح کی جذباتی، نفسیاتی، ذہنی الجھنوں سے آزاد ہوتی ہے۔ کام کاج کے معاملے میں آدمی سے زیادہ مستعد ہوتی ہے۔ اگر بے کار ہو جائے تو کسی کباڑی کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے، اس کی جگہ نئی مشین آجاتی ہے۔

مشین اور مشین مین کا باہمی تعلق بھی مشینی انداز کا ہوتا ہے۔ نہ تو کبھی آپس میں کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، نہ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے کی امید۔ ہر دو چار برس کے بعد پرانی مشین میں کچھ نئے کل پرزوں کا اضافہ کر کے اسے پہلے سے بہتر، پہلے سے زیادہ کارگر بنا دیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آدم زادوں کے ساتھ یہ سلوک ممکن نہیں۔ آدمی مشین کے مقابلے میں بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ زندگی سادگی سے پیچیدگی کی طرف سفر کرتی ہے۔ چنانچہ آج کا انسان تو اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ آدمی کو مشین بنا دیا جائے۔ استاد مشینی انداز سے پڑھائے۔ طالب علم مشینی انداز سے پڑھے۔ اس میں دونوں کا فائدہ ہے۔ کوئی ایسا کام، جو فائدے سے خالی ہو، سمجھ دار لوگ نہیں کرتے۔

ایک زمانہ تھا جب آدمی کی پہچان اس بات سے کی جاتی تھی کہ وہ کتنے خسارے میں ہے۔ نقصان اٹھانے کی کتنی طاقت، توفیق اور صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت میں بہتوں کا یقین تھا کہ انسان خسارے میں ہے۔ وہ نفع کے نقصان اور نقصان کے نفع سے آگاہ تھا۔ ہمارے عہد کے دانشوروں کا خیال ہے کہ ہر طرح کی قدامت پسندی سے ہمیں نجات حاصل کرنی چاہیے۔ جان بوجھ کر نقصان اٹھانے کی روش اب متروک ہوئی۔ مثال کے طور پر پیشہ ور مولوی کی طرح اب پیشہ ور انقلابی دانشور بھی— "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی" کے اصول پر عمل کرتا ہے۔ اقتدار پرستی، مصلحت کوشی، منافقت اور سمجھوتے بازی اپنی جگہ، دینداری اور انقلاب پسندی اپنی جگہ۔ ہوا کا رخ دیکھ کر چلنا شیوۂ دانشمنداں ہے۔ اور چوں کہ ہر دانشور دانشمند ہوتا ہے اس لیے ہمیشہ وہی رخ اپناتا ہے جو اس کے سفر کو آسان بنائے۔ بصورت دیگر اسے باقر مہدی بننا پڑتا ہے۔ ہوا سے لڑنا پڑتا ہے۔ ہمارے دانشور طبعاً صلح پسند ہیں، لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں۔ مسرور رہتے ہیں۔ تہذیب مسرت کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔

دانشور کا یہ حال دیکھ کر بھولے بھالے لوگ اسے سرکس کا جانور سمجھنے لگے ہیں۔ اس کی خوش فعلیوں کو دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ سرکس کا جانور کیسا ہی کمال کیوں نہ کر دکھائے، اس پر حیرت نہیں ہوتی۔ سب جانتے ہیں کہ جانور تربیت یافتہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا دانشور بھی تربیت یافتہ ہے۔ تربیت یافتہ جانور اور تربیت یافتہ دانشور نظریاتی سطح پر ایک ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ دانشور کو اس حال تک پہنچانے میں بنیادی خدمت ہمارے سیاسی نظام اور

اقتصادی نظام نے انجام دی ہے۔ کچھ لوگ پلٹ کر جواب دیتے ہیں کہ ہمارا سیاسی نظام اور اقتصادی نظام دانشمندی کے جس معیار تک پہنچا ہوا نظر آتا ہے اس معیار کو حاصل کرنے میں ہمارے دانشوروں نے بہت سرگرم حصہ لیا ہے۔ من تو شدم تو من شدی والا معاملہ ہے۔ اسے جذباتی یکجہتی کی طرف ایک قدم سمجھنا چاہیے۔

ایک ادبی سرکس میں جہاں درجن بھر دانشور، ایک صوبائی وزیر اور ہزاروں تماشائی جمع تھے، وہاں عجیب وغریب قصہ پیش آیا۔ وزیر موصوف جلسہ گاہ میں بہت دیر سے پہنچے۔ ظاہر ہے کہ وجہ مصروفیت رہی ہوگی۔ اس جلسے سے پہلے بھی انھیں کئی جلسوں کی صدارت کا بار اٹھانا پڑا ہوگا۔ اور اب اس جلسے کے بعد بھی صدارتوں کا بار اٹھانا ہوگا۔ جو شخص اتنی بار برداری میں مبتلا ہو اسے معاف کر دینا چاہیے تھا لیکن ہوا یہ کہ ایک دانشور جو کم دانشمند تھے خفا ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ یا تو وزیر موصوف معذرت طلب کریں ورنہ تشریف لے جائیں۔ وزیر موصوف نہ جانے پر رضامند ہوئے نہ معذرت طلبی پر۔ کھڑک کر بولے "تم لوگوں کا دماغ چل گیا ہے۔ اپنے آپے میں رہو۔ ایسی بات نہ کہو جو تمہاری خرابی کا باعث ٹھہرے۔"

معاملہ طول کھینچ گیا۔ بار بالآخر وزیر موصوف کی ہوئی۔ سب حیران ہوئے۔ یہ انہونی کیسے ہوگئی۔ ہم بھی حیران ہیں۔

ایک مفکر کا قول ہے — ہمارے عہد کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ اب ہم بڑی سے بڑی، بری سے بری بات پر بھی حیران نہیں ہوتے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی حیرت کو از سر نو زندہ کرنا ہوگا۔ سرکس کے جانور اور معاشرے کے دانشور کی حقیقت صحیح معنوں میں حیرانی کی اسی دولت کے ہاتھ آنے پر سمجھ میں آ سکے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

سلیم احمد کے انتقال پر

سلیم احمد کی زندگی جتنی ہنگامہ خیز تھی، موت اتنی ہی خاموشی سے ہوئی۔ سنا ہے کہ اس رات سوئے تو سوتے ہی رہ گئے۔ اگلی صبح انھیں بے جان پایا گیا۔

عجیب بات ہے کہ عسکری صاحب کی انتہائی سرگرم اور ہنگامہ خیز زندگی کا خاتمہ بھی اسی طرح ہوا تھا۔ گھر سے کالج جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں دل کا دورہ پڑا۔ تھوڑی دیر میں قصہ تمام ہو چکا تھا۔ سلیم احمد کے ذکر میں عسکری صاحب کا خیال یوں آیا کہ ان کی حیثیت سلیم احمد کے لیے ایک بزرگ دوست کی ہی نہیں روشنی کے ایک مستقل سرچشمے کی تھی۔ عسکری صاحب کی شخصیت اس اعتبار سے بہت ممتاز تھی کہ ان کے گرد ہمیشہ بہت ذہین، بہت سچے تخلیقی لوگوں کا حلقہ قائم رہا۔ بعضے معقول افراد بھی اپنی نیک طبعی اور رواداری کے سبب اپنے آس پاس بیوقوفوں کا وجود برداشت کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں عسکری صاحب بہت بے صبرے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر ایسوں ہی سے علاقہ رکھا جن کا وجود ذہانت پر بار نہ ہو۔ سلیم احمد ان کے ذاتی حلقے میں شامل تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سلیم احمد کی ذہنی اور ادبی شخصیت کو بنانے میں عسکری صاحب سے ان کا تعلق ہمیشہ پیش پیش رہا۔ پچھلے چند برسوں میں سلیم احمد کے مزاج اور ذہنی و تہذیبی رویوں میں کچھ ایسے رنگ نمایاں ہو گئے تھے جنہیں عسکری صاحب شاید پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عسکری صاحب جب تک حیات رہے، سلیم احمد سے ان کے تعلق میں کمی نہیں آئی۔ سلیم احمد زندگی بھر ان سے عقیدت و محبت کا دم بھرتے رہے اور اپنی ذات پر عسکری صاحب کے اثرات، عسکری صاحب کی اہمیت اور ان کے فیضان کے ہمیشہ معترف رہے۔

عسکری صاحب کی تو خیر ہستی ہی ہماری ادبی تاریخ کے ایک بے مثال واقعے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سلیم احمد کا اردو شاعری اور تنقید کے میدان میں قدم رکھنا بھی ایک واقعہ بن گیا۔ ان کی

کتاب ''نئی نظم اور پورا آدمی'' کی اشاعت پر جو ہنگامہ برپا ہوا اور اس پر جو بحثیں اور باتیں ہوئیں، اردو کی معدودے چند کتابوں کے نصیب میں یہ توجہ اور مقبولیت آئی ہوگی۔ وہ لوگ بھی، جو سلیم احمد کے نقطہ نظر سے متفق نہیں تھے، اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ یہ کتاب نئی نظم کی تعبیر و تفہیم کا ایک نیا معیار، ایک نئی سمت متعین کرتی ہے۔ بہتوں کی سوچ کے دھارے اس چھوٹی سی کتاب کے مطالعے نے بدل کر رکھ دیے۔ بہت سے مسلمات منہدم ہوئے اور ایک ایسی بوطیقا کی تشکیل ہوئی جس کا مزہ مختلف تھا۔

ذہانت، طباعی، بات سے بات نکالنا سلیم احمد کی شخصیت کے نمایاں ترین اوصاف تھے۔ پھر اس سب پر مستزاد ان کی چونچال، چبھتی ہوئی، دلچسپ نثر، چھوٹے چھوٹے فقروں میں، یوں ہی چلتے چلاتے، سلیم احمد کبھی کبھی اتنا کچھ کہہ جاتے تھے کہ عام لکھنے والا اس کے لیے ایک پورا مضمون باندھنے پر مجبور ہوتا۔ یہ ہنر بھی سلیم احمد نے عسکری صاحب ہی سے سیکھا تھا۔

سلیم احمد کے شعور میں وہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں ملتی جس کے حوالے سے ہم عسکری صاحب کو پہچانتے ہیں۔ عسکری صاحب مغرب سے ہوتے ہوئے اپنی مشرقیت تک پہنچے تھے۔ سلیم احمد کی مشرقیت شروع سے اخیر تک ان کے ساتھ رہی۔ سرسید، حالی، جدید تعلیم اور جدید تہذیبی نشاۃ ثانیہ پر سلیم احمد کی تنقید کا آہنگ ہمیشہ اونچا رہا۔ مگر انھوں نے اپنی مشرقیت کو مولویت کے غلبے سے محفوظ رکھا، سوائے اپنے آخری چند برسوں کے۔ پتہ نہیں یہ کوئی داخلی مجبوری تھی یا کسی بیرونی ضرورت و مصلحت کا جبر۔ لیکن پچھلے دو تین برسوں میں سلیم احمد کے قلم سے کچھ ایسی تحریریں بھی نکلیں جو ان کی آزادہ روی، بیباکی اور مصلحت ناشناسی کا ساتھ نہیں دیتیں۔

اس سے پہلے سلیم احمد کی کتاب ''غالب کون'' اور اس کے بعد ''اقبال ایک شاعر'' دونوں میں فکر اور اسلوب کی وہی کاٹ، طراری اور تیزی ملتی ہے جو سلیم احمد کی پہچان بن گئی تھی۔ یہ دونوں کتابیں ہر حلقے میں بحث کا موضوع بنیں۔ ان کی آخری کتاب غالباً وہ ہے جس کا تعلق عسکری صاحب کی تفہیم و تجزیے سے ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں عسکری صاحب کا ذکر کرتے ہوئے سلیم احمد نے لکھا تھا:

''یوں بظاہر عسکری صاحب ایک ایسے انسان تھے جن کا دوسروں سے تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ عزلت گزینی کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنے چند دوستوں اور شاگردوں کے سوا

ان کا کسی سے تعلق نہ تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ عسکری تعلق کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ عام آدمیوں کی زندگی، اس کے چھوٹے چھوٹے مطالبات کا احساس، انسانوں کا آپس میں رشتہ اور اس کے تقاضوں کا خیال، انسانی کمزوریوں کا احترام۔ یہ سب چیزیں جیسی محمد حسن عسکری میں تھیں، اس کی کوئی دوسری مثال کم از کم میرے سامنے موجود نہیں ہے۔ عسکری تو نام ہی زندگی کے احترام کا تھا، اور وہ بھی جو ہم آپ جیسے عام آدمیوں کے تجربے میں آتی ہے۔ دنیا سے اپنی بظاہر علیحدگی کے باوجود عسکری دنیا سے کبھی الگ نہیں ہوئے، نہ انسانوں سے۔"

سلیم احمد نے بھی انسان کو اس سطح پر قبول کیا تھا جو پورے وجود کی سطح ہے۔ "عورت کی طرح شاعری بھی پورا آدمی مانگتی ہے۔" ان کا یہ جملہ خاصا مشہور ہوا تھا کہ اس سے عشقیہ شاعری کے ایک نئے معیار کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ رویہ بنیادی طور پر جذبات کے احترام کا تقاضہ کرتا ہے اور آدمی کو اس کی کلیت کے ساتھ سمجھنے اور برتنے پر زور دیتا ہے۔ سلیم احمد نے نثر میں جو باتیں کہی تھیں، اپنی شاعری میں انہی کا تتبع کیا۔ ان کے بہت سے اشعار میں جذبات کی شوخی، پھکڑپن کی حد کو پہنچ گئی ہے۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پسندی کے قہر سے شاعری کو بچانے کے لیے اس قسم کی دراز دستی ضروری بھی تھی۔ سلیم احمد کی تنقید کی طرح، سلیم احمد کی شاعری بھی ایک نئے تجربے کی صورت اردو والوں کے حواس پر وارد ہوئی۔

ہمارے زمانے میں ایسوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے جو ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہوں۔ سلیم احمد کا شمار انہی منتخبات میں کرنا چاہیے۔ اس دور کی کون سی ایسی بحث، ایسا ہنگامہ ہے جس میں سلیم احمد شامل نہ ہوئے ہوں۔ ادب سے قطع نظر، فلم، ریڈیو، ٹیلی وژن اور صحافت بھی ان کی سرگرمیوں کے دائرے میں شامل رہی۔ انھوں نے جس دائرے میں بھی قدم رکھا اُن کا امتیاز مسلم رہا۔ پھر شہر کراچی میں تو ان کی ذات ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ خاص طور پر نئے لکھنے والوں کے لیے تو سلیم احمد کا گھر ایک زیارت گاہ بن چکا تھا۔ صبح سے شام اور شام سے صبح تک وہی ادب اور ادیبوں کا جمگھٹ۔ برسوں کی شب بیداریاں آخر کو رنگ لائیں۔ بہت جاگنے والا کبھی سوتا ہے تو اس طرح کہ نیند آسانی سے نہیں ٹوٹتی۔ سلیم احمد بھی سوئے تو پھر جاگنے کا نام نہ لیا۔ ایک انتہائی فعال، انتہائی سرگرم اور سیمابی شخصیت نے سکوت و سکون کی وادی میں قدم رکھا بھی تو کیسے انہونے طریقے سے۔

خود اپنی لو میں تھا محرابِ جاں میں جلتا تھا
وہ مشت خاک تھا لیکن چراغ جیسا تھا
معانی شب تاریک کھل رہے تھے سلیمؔ
جہاں چراغ نہیں تھا وہاں اُجالا تھا

ٹیلی وژن دیکھیے، مہذب بنیے

جب سے اخباروں نے یہ اعلان کیا ہے کہ ریفریجریٹر، ٹیلی وژن، مکسی اور اسی طرح کا دوسرا گھریلو سامان اگلے بجٹ کے ساتھ ہی کم قیمت پر ملنے لگے گا، نہ پوچھیے خوشی سے ہمارا کیا حال ہے۔ یہ ہوئی بات۔ اب ہم ہندوستانی اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مہذب اور ترقی یافتہ قوم کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ریفریجریٹر اور ٹیلی وژن کا بکثرت استعمال کرتی ہیں۔ ہر گھر میں ٹیلی وژن، ہر گھر میں ریفریجریٹر۔ ٹھنڈے ملکوں میں لوگ رہتے ہیں لیکن ریفریجریٹر کے بغیر ان کا کام نہیں چلتا۔ ایک حد تک یہ بات اب ہمارے ملک کے عوام بھی سمجھنے لگے ہیں۔ میں ایک عوام سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ ان کا پیشہ پلمبر کا ہے۔ گھر بغیر پلستر کی آدھی پکی، آدھی کچی دیواروں کا، چھت ٹین کی ہے۔ ایک روز ہمیں اپنے غسل خانے کا نل ٹھیک کروانا تھا۔ ان عوام صاحب کے گھر گئے۔ دیکھا کہ گھر کے آنگن میں ایک اونچا پیڑ ہے۔ اسی پیڑ کی ایک ڈال پر ٹیلی وژن کی چھتری لگی ہوئی ہے۔ ٹیلی وژن برآمدے میں لکڑی کے ایک پرانے بکس پر رکھا ہوا ہے۔ جی خوش ہوگیا۔ سینہ فخر سے تن گیا۔ خیال آیا کہ اب اس ملک کے عوام سچ مچ ترقی یافتہ اور مہذب ہو چکے ہیں۔ شام کو دن بھر کے کام کاج سے فرصت پاتے ہیں تو ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ اس سے ان کی معلومات میں گھر بیٹھے اضافہ ہوتا ہے۔ دل بھی بہلتا ہے، علم بھی بڑھتا ہے۔ پھر ٹیلی وژن پر جو اشتہار پیش کیے جاتے ہیں، ان سے ہمارے عوام کو بازار میں سستے داموں ملنے والی بہت سی چیزوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ قالین کناٹ پلیس کی کس دکان پر دھڑا دھڑ بک رہے ہیں، دروازوں اور کھڑکیوں کے نئے ڈیزائن کے پردے کہاں مل سکتے ہیں۔ کون سا کولڈ ڈرنک ایک ساتھ پینے اور کون سا چاکلیٹ ساتھ ساتھ کھانے سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں جذباتی ہم آہنگی وغیرہ پیدا ہو سکتی ہے۔ ٹیلی وژن ہمیں یہ بھی بتاتا

ہے کہ دلّی شہر میں کہاں ،کون سی نمائش چل رہی ہے۔ ہمارے سیاست داں تقریریں کرنے میں کتنے مصروف ہیں ۔قومی اور بین الاقوامی حالات کی خرابی کے باوجود انھوں نے اپنے آپ کو کتنا سنبھال رکھا ہے ۔کیسے مطمئن ،مسرور اور شکم سیر دکھائی دیتے ہیں ۔یہ سب ٹیلی وژن پر دیکھنے کے بعد ہمارے عوام کا حوصلہ بڑھتا ہے ۔ان کی اخلاقی ،ذہنی ،جذباتی تربیت ہوتی ہے۔

اس قسم کی باتیں کہ سبزی فروشوں کے یہاں ٹماٹر دس روپے کلو ، پیاز چار روپے کلو، آلو چار روپے کلو ملتے ہیں ،ٹیلی وژن پر نہیں بتائی جاتیں ۔عوام کو یہ سب خود بخود معلوم ہو جاتا ہے ۔زندگی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جاننے کے لیے ٹیلی وژن دیکھنے کی ضرورت کسی کو نہیں پڑتی۔ ٹیلی وژن بہرحال ٹیلی وژن ہے ۔بدھو، نتھو، خیرو کی دکان نہیں ہے۔

یہی حال ریفریجریٹر کا ہے ۔آپ کے گھر میں ریفریجریٹر ہے تو سال بھر ٹھنڈا پانی آپ آرام سے پیتے رہیں گے ۔بیشتر گھروں میں ریفریجریٹر سے یہی کام لیا جاتا ہے اور ٹھنڈا پانی پیا جاتا ہے ۔ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ ریفریجریٹر میں ٹھنڈے پانی کی بوتلوں کے علاوہ پھل ،سبزی ، انواع و اقسام کے کھانے بھی رکھے جاسکتے ہیں ۔ٹھیک ہے ۔ یہ بات ممکن تو ہے۔ جناب والا! سائنس بڑے سے بڑا معجزہ دکھا سکتی ہے، پھر یہ تو بہت معمولی بات ہوئی ۔لیکن ہمارے ان دوست کو یہ خبر نہیں کہ پھل اور سبزیاں جب جیب میں پیسے ہوں بازار سے تازہ تازہ منگوائی جاسکتی ہیں ۔اسی طرح بچا ہوا ،رکھا ہوا کھانا بھی صحت کے لیے مضر ہو سکتا ہے ،یوں بھی ناپ تول کر کھانا پکانا ایک اچھی عادت ہے ۔ یہ عادت ڈالنے کا پورا پورا انتظام ہمارے ملک میں یوں کیا گیا ہے کہ اشیاء اور اجناس کے دام روز بڑھ جاتے ہیں ۔اس سے کفایت شعاری کے میلان کو بھی ترقی ہوتی ہے ۔جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو مہنگائی بھتے کی ایک نئی قسط کا اعلان کر دیا جاتا ہے ۔پھر بوٹ کلب پر مظاہرے ہوتے ہیں ۔ان مظاہروں سے شہر کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے ۔مثل مشہور ہے کہ ایک نیکی سے دوسری نیکی کا راستہ نکلتا ہے۔

ریفریجریٹر اور ٹیلی وژن کو عام کرنے کے لیے ہمارے تجارت پیشہ طبقے نے بھی طرح طرح کی سہولتیں فراہم کی ہیں ۔ یہ چیزیں آسان قسطوں پر مل جاتی ہیں ۔جو چیز قسط پر مل سکے اس کی کھپت زیادہ ہوتی ہے ۔ٹماٹر ، آلو ، پیاز ، چاول ، آٹا ، گھی ، تیل قسط پر نہیں ملتے ۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہمیں نفس کشی کی تربیت دے رہی ہے ۔صوفیاء کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

بعضے اس لقمے کو حلق سے نہیں اتارتے تھے جو لذیذ محسوس ہو۔ روکھی سوکھی کھانا اور خدا کا شکرادا کرنا ہمارے اللہ والے بزرگوں کا شیوہ رہا ہے۔ اسی لیے ہمارے وزیر اعظم بھی سادھو سنتوں اور مذہبی پیشواؤں کے آستانوں پر پابندی سے حاضری دیتی ہیں۔ عوام اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہمارے عوام کو بھی چاہیے کہ جہاں تک ہو سکے ٹیلی وژن پر اپنے رہنماؤں کی مذہبی سرگرمیوں کو دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ دنیا کے چکر سے آزاد ہوں۔ آخرت کی فکر کریں۔ ہمارا ملک ایک سیکولر ملک ہے۔ وہ تو ہے۔

یوں بھی دیکھا جائے تو ٹیلی وژن ہمیں دنیا کے چکروں سے آزاد کرنے میں بہت مددگار ہوتا ہے۔ زیادہ تر فلمیں دکھائی جاتی ہیں یا ایسے پروگرام جو دل بہلاوے کا سامان ہوں۔ چترہار، چترمالا۔ فلمیں ایسا ہی سامان ہیں۔ یہ سامان جتنا وافر ہوگا، عوام زندگی کے مسئلوں میں الجھنے اور جان کھپانے کے بجائے اتنے ہی خوش اور مطمئن رہیں گے۔ شام کے وقت زیادہ تر گھروں میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ لوگ ٹیلی وژن کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کا ملنا جلنا بھی کم ہو گیا ہے۔ جب لوگ ایک دوسرے سے ملیں گے نہیں تو ایک دوسرے کا دکھڑا بھی نہیں سنیں گے، سازشیں بھی نہیں کریں گے، ملک کے حالات کا نوحہ بھی نہیں پڑھیں گے، اجتماعی مسائل پر گفتگو بھی نہ ہوگی۔ غرض کہ وہ تمام باتیں جو ذہنی سکون کو برباد کر سکتی ہیں، ان سے دور رہیں گے۔ آرام سے گھر بیٹھے ٹیلی وژن پر ریکھا یا امیتابھ بچن کا ناچ دیکھیں گے، اس سے عوام کے جمالیاتی ذوق کی تربیت بھی ہوگی۔ جمالیاتی ذوق کی تربیت بہت ضروری ہے۔ اس تربیت سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام گلیڈولا کے پھولوں سے زیادہ دلچسپی گوبھی کے پھول میں لینے لگے ہیں۔ گوبھی کے پھولوں میں دلچسپی لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خریدا جائے۔ خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ جیب میں پیسوں کی کمی نہ ہو۔ اس کمی کو دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کی معیشت پر مزید بوجھ ڈالا جائے۔ بوجھ ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ مظاہرے کیے جائیں۔ مظاہرے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ یکجا ہو کر اجتماعی مسئلوں پر بات چیت کریں۔ اور اگر یہ سب کریں گے تو ٹیلی وژن کے پروگرام کم دیکھیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تہذیب اور ترقی کے دور سے نکل کر ایک بار پھر دورِ جاہلیت میں چلے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ ہماری حکومت جو عوام کی خادم ہے، یہ نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ ہمارے

عوام بھی افکارِ زمانہ سے آزاد ہوں۔ آزادی ملی ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ ۴۷ء
سے لے کر آج تک عوام برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ حکومت ٹیلی وژن کے دام کم کرے گی تو اور
زیادہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔

امید ہے کہ اس طرح ہمارے مسئلے اور حکومت کے مسئلے ایک ساتھ حل ہو جائیں گے۔

عالم خوندمیری کی یاد میں

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ موت اور زندگی کے درمیان میں ایک پل کا پردہ ہے۔ عالم صاحب کے انتقال کو دو ہفتے گزر گئے۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے خبر ملی۔ بے خبری سے خبر تک کا فاصلہ چند لمحوں کا تھا۔ انھیں لمحوں میں ایک بھری پڑی زندگی اچانک موت کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

عالم صاحب سے تعارف بارہ تیرہ برس پہلے علی گڑھ کے اسٹاف کلب میں ہوا تھا۔ وحید اختر ان سے ملاقات کے لیے گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ دبلے پتلے، متین، سوچتا ہوا لہجہ، سوچتی ہوئی شخصیت، مگر آنکھوں میں ایسی چمک جو کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ یہی حال عالم صاحب کی شخصیت کا تھا۔ بظاہر گم سم لیکن بہت دھار دار۔ ان کے ہر انداز میں ایک فطری دھیما پن تھا اور بڑی رچی ہوئی شائستگی، ادب، فلسفہ، سیاست، مذہب، تاریخ، جس موضوع پر بھی باتیں کر رہے ہوں، یہ محسوس ہوتا تھا کہ زیر بحث مسئلہ برسوں ان کے غور و فکر کا مرکز رہا ہے۔

علی گڑھ، سری نگر، دلّی۔۔۔ سال میں ایک دو بار کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ سرور صاحب نے اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر میں انھیں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر بلا لیا تھا۔ اس دوران میں ملاقاتیں طویل اور تفصیلی بھی رہیں۔ عالم صاحب یا تو پڑھتے رہتے تھے، یا پھر باتیں کرتے تھے۔ دونوں بہانے تھے ایک سنجیدہ ذہنی مصروفیت کے۔ عالم صاحب کو میں نے کبھی خالی الذہن نہیں دیکھا۔

عثمانیہ یونیورسٹی ہی نہیں، عروس البلاد حیدر آباد میں عالم صاحب کی شخصیت کئی حیثیتوں سے ممتاز تھی۔ پہلے لوگ اس شہر کو مخدوم کے حوالے سے یاد کرتے تھے۔ اب یہ جگہ عالم صاحب نے سنبھال لی تھی۔ بظاہر وہ خواص میں سے تھے۔ لیکن عام زندگی اور عام انسانوں سے ان کے تعلق میں کبھی کمی نہیں آئی۔ ادبی نشستوں میں، چھوٹا موٹا ادیب بھی انھیں کھینچ تان کر لے جاتا تھا

اور ان سے تقریر کرواتا تھا۔ عالم صاحب دقیق فلسفیانہ موضوع پر بول رہے ہوں یا کسی نئے لکھنے والے کی کتاب پر، ایک سی سنجیدگی نظر آتی۔ انگریزی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے حلقے بھی کئی تھے۔ اب یونیورسٹیوں میں ایسے اشخاص اکادکا ہی ملتے ہیں جو علوم کے مختلف شعبوں اور زندگی کے مختلف مسئلوں پر ایک جیسے اعتماد کے ساتھ ایک سی سطح کی باتیں کہہ سکیں۔ عالم صاحب بھی فلسفے کے استاد تھے۔ مگر شاعروں، ادیبوں، مصوروں، مورخوں، سیاست دانوں، سیاسی کارکنوں، کھلاڑیوں، طالب علموں، رئیسوں اور عامیوں میں باتیں کرتے تو اس انداز سے گویا ابلاغ ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ دوسروں کی ہر بات سمجھ سکتے ہیں اور اپنی ہر بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ صرف پڑھا لکھا ہونا اس بات کی ضمانت نہیں ہوتا کہ آدمی سمجھ دار بھی ہے۔ پڑھنے کے ساتھ سوچنے اور سوچنے کے ساتھ سمجھنے کی شرط بھی لازم آتی ہے۔ نہیں تو علم و حکمت سب فضول۔ عالم صاحب دانشور تو تھے ہی، ان میں بلا کی سوجھ بوجھ بھی تھی جو کتابوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی سچائیوں سے بھی غذا حاصل کرتی ہے۔

ایمرجنسی کے زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بیک جنبش قلم ستائیس اٹھائیس اساتذہ کے خلاف معطلی کا فرمان جاری کر دیا۔ ان اساتذہ میں عالم صاحب بھی تھے۔ اس وقت اپیل اور عرضداشت کے تمام دروازے بند تھے۔ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں میں بہتوں نے دریوزہ گری شعار کر لی تھی اور ضمیر کے مطالبات سے یکسر آزاد ہو گئے تھے۔ عالم صاحب نے عافیت کوشی اور مصلحت شناسی کے بجائے آزمائشوں سے بھرا راستہ اختیار کیا۔ پریشان اور بلکان ہوئے، لیکن نہ پچھتائے، نہ گھبرائے۔ رنجیدہ ہوئے تو اپنے رفیقوں کے رویے پر جو گوشۂ عافیت میں مگن تھے اور اس فریب میں مبتلا کہ ہر طرف خیریت ہے۔

عالم صاحب چاہتے تو مفاہمت بھی کر سکتے تھے اور اس مفاہمت کی قیمت بھی وصول کر سکتے تھے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ کبھی کبھی زمانے کو بنانے کے لیے زمانے کے خلاف بھی چلنا ہوتا ہے۔ پھر محض سوچتے رہنے سے دنیا نہیں بدلتی۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ ہمیشہ سے زیادہ سرگرم ہو گئے۔ تقریریں، تحریریں، قراردادیں، مباحثے، مذاکرے، مظاہرے۔ ایسی ہر سرگرمی کو عالم صاحب کی شمولیت نے ایک نیا اعتبار بخشا۔ آخری جیت بھی انہی کی ہوئی۔

اپنے نظریات اور نقطہ نظر کے معاملے میں عالم صاحب خاصے سخت تھے۔ مگر یہ سختی ان کی نرم

آثاری پر غالب نہ آسکی۔ رواداری اور کشادہ قلبی بھی ان میں بہت تھی۔ اپنے مخالفین کی طرف سے بھی ان کا دل ہمیشہ صاف رہا۔ اختلافات کے باوجود ان کی ذاتی دوستیاں اپنے مخالفین سے بھی برقرار رہیں۔ کیا دوست، کیا دشمن، کسی کے بارے میں کوئی ناشائستہ اور نا ملائم کلمہ ان کی زبان پر نہیں آیا۔ اپنی تمام تر متانت کے ساتھ ان کی حس مزاج بھی تیز تھی۔ چٹکیاں بھی لیتے تھے اور فقرے بھی انھیں خوب سوجھتے تھے، مگر ایسی کی سننے والا بھی لطف اٹھائے اور محفل کا رنگ بھی بحال رہے۔

بہت گہری، ہمہ جہت، شاداب اور شگفتہ شخصیت تھی۔ ہر مجمع میں منفرد، ہر بزم میں ممتاز دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور سے علمی مذاکروں اور مباحثوں میں تو ان کی شرکت سے ایک جان سی پڑ جاتی تھی۔ انھیں دیکھ کر پرانے وقتوں کے علما یاد آتے تھے۔ ہر مسئلہ پر قادر، ہر فن میں طاق۔ گفتگو کی سطح ایسی کہ سننے والا بھی ذہنی تساہل پسندی کا شکار نہ ہونے پائے اور اپنے آپ کو ہمہ وقت مستعد رکھے۔ غالباً خلیفہ عبدالحکیم کے شاگردوں میں تھے۔ اپنی تاریخ و تہذیب اور روایت پر عالم صاحب کی نظر بہت گہری تھی۔ مگر ان کی شخصیت اپنے حال سے ہمیشہ ہم آہنگ رہی، اپنے زمانے اور اس زمانے کے تمام مناسبات سے پوری طرح باخبر۔

گرد و پیش کی ہر حقیقت سے سروکار رکھنے والا لاپروا ہوا تو بس اپنی طرف سے۔ طبیعت میں ایک خلقی لا ابالی پن بھی تھا۔ بے احتیاط بھی تھے۔ جاگنے سونے، کھانے پینے کے اوقات و اطوار میں ایک طرح کی ابتری۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وقت سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ اپنے ذہن اور حواس کو منظم رکھنے کی ایک مستقل جدوجہد اپنی صحت کے سلسلے میں ایک مستقل بے نیازی کا بہانہ بن گئی۔ عالم صاحب سر سے پیر تک دماغ ہی دماغ تھے۔ لیکن وجود کا قصہ اس سے آگے بھی چلتا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کے بیش بہا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ اسی لیے اب کہ وہ نہیں ہیں خسارے کا احساس بہت شدید ہے۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں!

لوگ اس طرح اچانک کیوں چلے جاتے ہیں؟

قصہ ترقی پسند بندر کا

بندر سے آدمی کا رشتہ پرانا ہے۔ جہاں آدمی ہوں گے وہاں بندر بھی ہوں گے۔ جن شہروں کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے، بندر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ صنعتی تمدن کے قہر کا احساس آدمی کو ہو نہ ہو، بندروں کو ضرور ہوتا ہے۔ اسی لیے بندر جدید وضع کے شہروں پر پرانی بستیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے انسان کا رشتہ فطرت سے ٹوٹ گیا ہے۔ بندر ابھی فطری زندگی اور فطرت کے حسن سے بیزار نہیں ہوئے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ بندر ابھی بھی باغوں اور بنوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ اونچے اونچے پیڑوں پر چھلانگیں لگاتے پھرتے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آج کا آدم زاد کل کا بندر تھا۔ ڈارون نامی ایک بزرگ جنہیں پادری حضرات مسخرا اور غپیں ہانکنے میں ماہر سمجھتے تھے، انھوں نے ارتقا کا ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق بندر ترقی کرتے کرتے آدمی بن گئے۔ درختوں پر اچھلنے کودنے کے بجائے جب بیٹھ کر حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرنے لگے تو بندروں کی دُمیں جھڑ گئیں۔ چنانچہ آدمی کو ایسا بندر سمجھنا چاہیے جو دُم سے محروم ہے۔ بلونت گارگی نے انگریزی میں ایک سوانحی ناول لکھا ہے۔ اس ناول میں بھی بندروں کا ذکر آیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اب سے کئی برس پہلے، چنڈی گڑھ میں کانفرنس سائنس دانوں کی ہو چاہے یکہ بانوں کی، افتتاح کے لیے ایک وزیر ہمیشہ مطلوب ہوتا تھا۔ اس کانفرنس میں بھی ایک وزیر اعلیٰ مہمانِ خصوصی تھے۔ ہر وزیر کا ذہن اور زبان دنیا کے ہر موضوع پر رواں ہوتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر رواں ہو گئے۔ دھواں دھار تقریر کی۔ سائنس دانوں کے چھکے چھڑا دیے۔ انھوں نے فرمایا، ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ بندر ہمارے مورثِ اعلیٰ تھے۔ انسان بندر کی اولاد ہے۔ آپ ہوں گے، میں نہیں ہوں۔'' اس بیان کے پیچھے وزیر اعلیٰ نے ایک دلیل بھی پیش کی۔ فرمایا ''اگر بندر ترقی کرتے کرتے آدمی بن گیا تو پھر آج کل بندر کیوں دکھائی دیتے ہیں۔

پھر طوطے کیوں ہیں؟ بلیاں کیوں ہیں؟ چمگادڑیں کیوں ہیں؟'' یہ دلیل اتنی دندان شکن تھی کہ کسی سائنس داں سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ سب چپکے بیٹھے رہے۔ منھ میں دانت نہ ہوں تو بولنے میں سچ مچ دشواری ہوتی ہے۔

اور اس واقعے سے نہ ہم انکار کر سکتے ہیں نہ آپ کہ بندر آج بھی ہمارے درمیان ہیں۔ اوکھلے میں جمنا کے کنارے برگد کا ایک پرانا پیڑ ہے۔ اس پیڑ پر کئی درجن بندر بسے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے انتظار حسین کا سفر نامہ ہندوستان بعنوان بندر کی دُم پڑھ رکھا ہے تو آپ کو وہ واقعہ بھی یاد ہوگا جس کا تعلق بندر سے ہے۔ ہوا یوں کہ ایک صبح ہم سیر کے لیے نکلے تو برگد کے اس پیڑ تک جا پہنچے۔ راستے میں انتظار حسین نے گیندے کا ایک پھول کسی کیاری سے توڑ کر اپنی چٹکی میں دبا رکھا تھا۔ ایک بندر نے ہمیں دیکھا تو پیڑ سے اُتر کر ٹھیک ہمارے سامنے آبیٹھا۔ اس کی نظر انتظار حسین پر تھی۔ اس لطف خاص نے انھیں مسرور کیا۔ مجھ سے بولے ''دیکھیے صاحب! ان سے ہماری شناسائی پرانی ہے۔'' یہ سننا تھا کہ پرانے تعلقات کو بہانہ بنا کر اس بندر نے ان کی چٹکی سے گیندے کا پھول اچکا اور لپک کر پیڑ پر بیٹھ گیا۔

خوش ونت سنگھ کا بیان ہے کہ دلی شہر میں پرانے قلعے کے اس اور تغلق آباد میں بھی بہت بندر رہتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بندر تاریخ اور ماضی کی روایات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ خفا ہیں تو اپنے حال سے۔ مستقبل کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتے سوائے اس کے کہ ایک کارٹونسٹ نے قیاس دوڑا کر ممکنہ تیسری عالمی جنگ کے عہد کی دنیا کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک کارٹون بنایا تھا۔ اس میں یہ دکھایا تھا کہ ایک بنجر پہاڑ کے غار کے سامنے ایک بندر بیٹھا ہوا ہے۔ قریب ہی ایک بندریا بھی ہے۔ بندر بندریا سے کہہ رہا ہے ''کیوں نہ ہم ایک بار پھر نئے سرے سے شروعات کریں!'' ایٹمی جنگ اگر انسانوں کا صفایا کر دے تو جو بچ رہے گا، وہی شروعات کرے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندر صنعتی تمدن سے بیزار ہے، آدم بیزار نہیں ہے اور چاہتا ہے کہ ترقی کر کے آدمی بن جائے۔

چنانچہ اب ایک ایسے ہی ترقی پسند بندر کا حال سنیے۔ دو برس پہلے اخباروں میں آچکا ہے کہ یہ بندر شہر دلی کے نہرو پلیس نامی بازار اور دفاتر کے اطراف میں گھومتا پھرتا تھا۔ یقیناً ملک کی ترقی اور صنعتی تمدن کا شیدائی رہا ہوگا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ لنچ ٹائم میں کھڑکی یا روشندان سے کسی

دفتر میں آتا، ٹفن کیریر اٹھاتا اور نکل جاتا۔ ایک روز تو اسے فون کا ریسیور اٹھاتے دیکھا گیا۔ نہرو پلیس کے علاوہ یہ بندر گریٹر کیلاش اور ڈیفنس کالونی میں بھی اسی نوع کے مہذب مشاغل میں مصروف دیکھا گیا۔ وہ اپنا بندرپن چھوڑ کر آدمیوں جیسی حرکتیں کرنے لگا تھا۔ وہ بھی عام آدمیوں جیسی نہیں بلکہ مہذب آدمیوں جیسی حرکتیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بندر ایک سے نہیں ہوتے۔ ان میں بھی درجات اور طبقات قائم ہو چکے ہیں۔ اب یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ان میں بھی طبقاتی کشمکش نہ شروع ہو جائے۔ یہ کشمکش امن و انتظام کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے دانش مند حکمراں آدمیوں کا اپنی حد سے آگے بڑھنا پسند نہیں کرتے، نہ یہ پسند کرتے ہیں کہ بندر اپنے بندرپن سے محروم ہو جائیں۔

ہمیں آج بندروں کا خیال برابر اس لیے آتا رہا کہ ابھی دو تین ہفتے پہلے ہمارے قومی روزناموں میں پھر ایک بندر خبروں کا موضوع بنا تھا۔ اس بندر نے چالیس آدمیوں کو کاٹ کھایا۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ حیرت کی بات تو یہ ہوتی کہ چالیس آدمی ایک بندر کو یا ایک آدمی چالیس بندروں کو کاٹ کھاتا۔ مگر اس بندر کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ جنوبی دلی کی وہ کالونی جہاں اس بندر نے ہڑبونگ مچا رکھی تھی اس کالونی کے باشندے اس بندر کو راہ راست پر لانے میں ناکام رہے تو ایک جلوس بنا کر انھوں نے مظاہرہ کرنے کی ٹھانی۔ ایک میمورنڈم تیار کیا۔ پولس کی مدد حاصل کی۔ نتیجہ وہی صفر۔ آدمی کی طرح بندر بھی اگر ڈھیٹ ہو جائے تو اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بندر بھی انتظامیہ کے لیے ایک دردسر بن گیا۔

ہمارے ایک پڑوسی جو اخبار پابندی سے پڑھتے ہیں، یہ خبر دیکھتے ہی ہمارے پاس آئے بولے: "دیکھی صاحب آپ نے اس بندر کی حرکت؟ چالیس آدمیوں کو کاٹ کھایا۔ ملک کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

ہم نے کسی بندر کے حوالے سے ملک کے حال پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ان کی بات سن کر خاموش رہے۔ اس بندر کی خبر دوبارہ اخبار میں نہیں چھپی۔ جرائم، قتل، لوٹ مار، دہشت پسندی اور تشدد کی خبریں پڑھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ بندر اب چین سے کسی پیڑ کی ڈال پر بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔ سوچ رہا ہوگا کہ آدمی سچ مچ بندر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دل ہی دل میں یہ طے کر چکا ہوگا کہ اسے مزید ترقی کی ہوس دل سے نکال دینی چاہیے۔

اردو کس کی زبان ہے

کوئی دو برس پہلے، ایک شام گاندھی سمارک ندھی، نئی دلی والوں نے اردو اور ہندی کے کچھ ادیبوں کو مدعو کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں زبانوں کے ادیب ایک دوسرے سے قریب آئیں، مل جل کر ایک ایسا منصوبہ تیار کریں جو جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں کارآمد ثابت ہو۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اردو اور ہندی تہذیبی، ذہنی، تاریخی، لسانی سطح پر ایک دوسرے سے جتنی قریب ہیں، ان میں اتنا ہی جذباتی فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس روز بھی ہندی کے معروف اور بزرگ ادیب شری جتندر کمار نے مائک سنبھالا تو ایک ایسی بات کہی جو ہمارے گلے سے اتر نہ سکی۔ فرمایا "بھائیو! ہمیں اردو سے ہمدردی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اردو ترقی کرے۔" وغیرہ وغیرہ۔ وہ بزرگ بول چکے تو ہم نے سوچا کہ اپنے دل کی بات بھی کہہ دیں۔ سو، ہم نے عرض کیا کہ "ہمدردی، معذوروں، کمزوروں اور بیماروں سے کی جاتی ہے۔ زبان سے تو محبت کرنی چاہیے۔ اگر آپ کسی زبان سے محبت نہیں کرتے تو اس کی عزت بھی نہیں کریں گے۔" وغیرہ وغیرہ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے وغیرہ وغیرہ کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ شاید اسی لیے وہاں سے اٹھے تو دل پر ایک بوجھ لے کر۔ اس مجلس میں گوپی ناتھ امن بھی موجود تھے۔ لکھنوی تہذیب اور شائستگی کا مکمل نمونہ۔ ان کا دم اس ماحول میں بہت غنیمت معلوم ہوا۔

جن دنوں مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم تھے، اردو گھر، نئی دلی کی ایک تقریب میں انھوں نے اردو والوں کو خوب لتاڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو، جیسی کہ اس تقریب میں بولی گئی، ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ دل جلانے والی بہت باتیں اس بزرگ نے کہیں۔ اتفاق سے وہاں کئی پاکستانی مہمان بھی موجود تھے۔ گئے تو یہ واقعہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مرارجی نے جس تقریر کا مذاق اڑایا تھا وہ آنند نرائن ملا نے کی تھی۔ اردو تہذیب کی ایک اور روشن مثال۔

ہم ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جب بھی ہندی کی خبریں سنتے ہیں، یہی تاثر لے کر اٹھتے ہیں کہ یہ زبان کسی اور دیس کی ہے۔ مرارجی گجراتی ہیں، ان کی سمجھ میں اردو کیا، ہندی بھی نہ آئے تو حیرانی کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح ہندی والے اگر اردو کی علمی اور ادبی زبان کے کچھ حصے نہ سمجھ سکیں تو بھی حیرانی کی بات نہیں ہے۔ انگریزی بولنے والا ہر شخص چاسر اور شیکسپیئر کو سمجھنے کا دعویدار نہیں ہوتا۔ مگر روز مرہ بول چال، ریڈیو، ٹیلی وژن، فلم، اخبار کی زبان تو ہر خاص و عام کے لیے ہوتی ہے۔ اگر یہ زبان بالا بالا سروں کے اوپر سے گزر جائے تو اس کی حیثیت بھی دیوبانی سنسکرت سے مختلف نہیں ہوگی۔ یہ اور بات کہ آکاش وانی سے سنسکرت میں بھی خبریں نشر کی جاتی ہیں، ان نوادر روزگار کے لیے جنھوں نے سنسکرت کو اپنی مادری زبان لکھوایا ہے۔

ابھی چند روز پہلے ہمارے پاس ایک سرکاری محکمے کا سرکلر آیا۔ ہمیں اس کی خانہ پری کرنی تھی۔ بہت زور لگایا، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ یہ دعویٰ ہمیں کبھی نہیں رہا کہ "ہم بھی سر میں دماغ رکھتے ہیں۔" اس لیے خود کو معذور سمجھ کر سرکلر ایک دوست کے پاس لے کر گئے جو ہندی کے عالم ہیں۔ انھوں نے سرکلر کے ایک ایک لفظ کو اس طرح گھور کر دیکھا جیسے ستیہ جیت رے کی فلم میں شطرنج کے کھلاڑی بساط کے مہروں کو دیکھتے ہیں۔ مگر کچھ بھی پلّے نہیں پڑا۔ شرما کر بولے "صاحب Technical بھاشا ہے۔ اسی محکمے کے کسی آدمی سے پوچھیے۔"

جن دنوں نہرو جی ہندوستان کے وزیر اعظم تھے، انھوں نے صاف صاف اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کی ہندی ان کی سوجھ بوجھ سے آگے کی چیز ہے۔ ہمیں یہ سوچ کر ترس آیا کہ ملک کا وزیر اعظم اور قومی زبان کے سلسلے میں اس درجہ بے بس۔ سمپورنا نند جی بھی زندہ تھے اور راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن بھی۔ نہرو جی کی ایک نہ چلی۔

ہماری موجودہ وزیر اعظم کی لسانی رویے بھی آج کے سیاسی مزاج کا ہی ایک حصہ ہیں۔ جہاں یہ دکھائی دیا کہ سامعین میں اردو والے یا مسلمان زیادہ ہیں وہ صاف ستھری بول چال کی زبان، شین قاف کے ساتھ بولتی ہیں۔ باقی اور موقعوں پر۔۔۔ اب کیا کہا جائے، سوائے اس کے کہ — بامسلماں اللہ اللہ بابرہمن رام رام۔

سرکاری دفاتر، ریڈیو، ٹیلی وژن کی ہندی روز بروز مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے اگر کوئی خوش آیند نتیجہ برآمد ہوتا ہے تو بس یہ کہ ہمارے عوام مشکل پسند ہوتے جا رہے ہیں

جسے دماغی ترقی کی دلیل سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارے دوستوں میں سرویشور دیال سکسینہ بھی تھے۔ رگھو ویر سہائے بھی ہیں۔ دونوں ہندی کے نہایت ممتاز ادیب۔ ان کی نظم و نثر بھی ہم سمجھ لیتے ہیں، بات چیت بھی، حد تو یہ ہے کہ تقریر بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی سے ان کا رابطہ ایک فطری، غیر مصنوعی، جاندار (اور ایماندار) سطح رکھتا ہے۔ جس طرح سوچتے ہیں اسی طرح بولتے ہیں۔

مگر عام ہندی والے کا حال یہ ہے کہ بات چیت تو آپ سے سیدھی سادی زبان میں کرے گا مگر مضمون لکھے گا یا بھاشن دے گا یا شعر کہے گا تو ایک ایسی زبان میں جو نہ اس کی ہے نہ ہماری۔ سمترا نندن پنت، مہا دیوی ورما، میتھلی شرن گپت سے فراق صاحب اسی لیے عمر بھر ناراض رہے۔

فراق صاحب کی خفگی کا بدلہ مہا دیوی ورما اب اردو والوں سے لے رہی ہیں اور اول فول بک رہی ہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کے لیے جہل کا بہت سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ چودھری چرن سنگھ بھی اپنے جوشِ علم میں ایک بار اسی طرح کی باتیں کہہ گئے تھے۔ گہری اور سچی جہالت آدمی کو خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال رکھتی ہے۔

ہندی والوں میں بشمول اردو اور انگریزی شاید ہر زبان کے سلسلے میں کچھ عجب تصورات عام ہو رہے ہیں۔ انکسار، رواداری، کشادہ قلبی کا رویہ تو خیر بڑے ریاض کا حاصل ہوتا ہے، ایک بے ضرر لاتعلقی بھی ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر اس سب کے برعکس ان میں ایک نہایت خطرناک قسم کی جارحیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ وشو ہندی سمیلن میں کیا کیا وعدے کیے گئے۔ کیا مشرق، کیا مغرب، گویا کہ سب ہندی کے زیر نگیں ہیں۔ کہیں یہ حکومت اردو کی لاٹھی سے کی جاتی ہے، کہیں مقامی بولیوں کے سہارے۔ ایسے موقعوں پر بھی ہندی، وہ بھی ہندی۔ انشا کی رانی کیتکی کی کہانی بھی ہندی، میرا بائی، سورداس، کبیر داس کے بھجن بھی ہندی۔ اس تماشے سے سمیلن میں شریک ہونے والے غیر ملکی مندوبین تو بیزار ہوئے ہی، سمجھ دار (اور دیانت دار) ہندی والوں نے بھی اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔

بعضے اردو والوں نے بھی اردو کو تختۂ مشق ستم بنایا۔ اس بہانے کچھ کما کھایا۔ یہ دانا اور دنیا دار اصحاب و خواتین وہ ہیں جو اردو کا رسم الخط بدلنے پر مصر ہیں۔ گویا کہ رسم الخط نہ ہوا، ریڈی میڈ

لباس ہو گیا۔ ایک قمیض اتاری، دوسری پہن لی۔ ایسوں سے ہم آپ کیا مجھیں گے، بس خدا سمجھے!

زاغ و زغن کے اس شور بے ہنگام میں جی تنگ آتا ہے اور کہتا ہے کہ کرشن چندر کی ایک بات بھی یاد آجائے تو کچھ قباحت نہیں۔ اس مرحوم نے فرمایا تھا "چلیے صاحب! (بقول مہادیوی ورما، بھگوتی چرن ورما، امرت لال ناگر وغیرہ وغیرہ) یہ مانے لیتے ہیں کہ اردو صرف ایک اقلیت کی زبان ہے تو کیا ملک کی سب سے بڑی اقلیت جو زبان بولتی اور سمجھتی، اور لکھتی ہے، اسے زندہ رہنے کا حق نہیں؟"

یہ سوال اتنا مشکل نہیں کہ اس کا جواب گول مال دیا جائے۔

یہ کس کا خواب تماشہ ہے؟

آج سے کوئی چالیس برس پہلے، طالب علمی کے دنوں میں ایک کتاب پڑھی تھی ۔ Atom in the Family کتاب کی مصنفہ تھیں لارا فرمی مشہور فزیسسٹ اینریکو فرمی کی بیوی ۔ اینریکو فرمی نے ایٹم بم کی تخلیق میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ لیکن انسانی آبادی پر پہلے ایٹمی تجربے کے ساتھ ہی تخلیق کا سارا لاوا سرد پڑ گیا۔ اس ہولناک دن کا پیچھا کرنے والی پہلی رات پورے فرمی خاندان کے لیے بہت سوگوار تھی ۔ اس رات شاید کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ سب کے سب سناٹے میں تھے اور (ایک دوسرے سے بچنے کے لیے) خاموش تھے ۔

ذلت کے ایک گہرے احساس، موت کے زہر میں بجھے ہوئے اندیشوں کا تجربہ، بہت سے لوگوں نے مئی ۱۹۹۸ء کی اس رات کو بھی کیا جب سرحد کے دونوں طرف اپنی اجتماعی طاقت کے اظہار کی مجنونانہ دوڑ شروع ہوگئی ۔ ہمارے حکمرانوں نے اس اندیشے کا زور کم کرنے کے لیے قوم کو ایک اجتماعی جشن کے راستے پر لگا دیا۔ سرحد کے دونوں طرف یہ نعرے گونجے کہ اب کوئی بھی ہمیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ کرے ورنہ ۔۔۔ ورنہ کیا؟ ہمارے مرحوم شاعر ساحر لدھیانوی نے، اجتماعی موت کا سندیسہ لانے والی کسی ایک امکانی جنگ کے سیاق میں انسانی معاشرے میں امن اور بقا کے نام پر ایک اداس نغمہ ترتیب دیا تھا اور کہا تھا —

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

لیکن یہ فکر تو صرف عام انسانوں کے لیے ہے ۔ رہا حکومتوں کے سربراہوں کا معاملہ تو

انھیں صرف اپنی حکومت کو بچائے رکھنے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ مقہور اور ''معمولی چیزوں (اور لوگوں) کے خدا'' کی راہ دیکھنے والی، ہماری ہم عصر مصنفہ اروندھتی رائے نے کہا۔ ''یہاں ہندوستان اور پاکستان میں ہم لوگ اپنی سیاست اور خارجہ پالیسی کی باریکیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہم دنیا کو اس بات کا یقین دلانے میں مصروف ہیں کہ اپنے دشمن کو ختم کر دینے کی طاقت حاصل کر لینے کے بعد ہم ایک دوسرے کے عذاب سے اب بچے رہیں گے۔۔۔''

ایٹم بم کی دریافت کے بعد (شاید بہت افسردگی اور تشویش کے لہجے میں) ہماری صدی کے سب سے بڑے سائنس داں آئن اسٹائن کی زبان سے ایک جملہ نکلا تھا۔ یہ کہ ''ہم نے بالآخر اپنے آپ کو مکمل طور پر تباہ کر سکنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی ہے!''

کہتے ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی اپنے آپ میں غیر جانبدار ہوتے ہیں۔ ان کی لگام بہرحال انسانوں کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے، تیزی سے بدلتی اور پھیلتی ہوئی انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ہمیں جو مدد ملی، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے (کچھ) سائنداں ایک بے مہار خود اعتمادی اور ایک نازش بے جا میں مبتلا ہو گئے۔ یہ غرور ٹوٹا اس وقت جب زمانے کی آنکھ نے ایک عالم گیر جنگ کی دہشتوں سے خود کو دو چار پایا۔ مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور ہمارے (کچھ) سائنس داں انسانی اقدار کی اولیت اور برگزیدگی کے تصور سے آزاد ہو چکے تھے۔ اقتدار کی سیاست کے سفلہ مقاصد نے ہماری فکر اور ہمارے علم اور اخلاقی تصورات کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی تھی۔

ہمارے ہندوستانی میزائل پروگرام کے بانی مبانی ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے یوم ہیروشیما کے موقع پر (جی ہاں عین اسی روز) نوجوان اور بوڑھے صحافیوں، دانشوروں، فن کاروں، معلموں اور سماجی کارکنوں کی طرف سے ہونے والے مظاہروں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ نام نہاد دانش ور تو ذرا ذرا سی باتیں بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اور وہ باتیں کیا ہیں؟

یہ کہ۔۔۔

(۱) امریکہ اور سابق سوویت یونین کے پاس تو ایسے دس ہزار مہلک اسلحے ہیں۔

(۲) ہمارے نام نہاد دانش وروں کو واشنگٹن اور ماسکو جا کر یہ مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

(۳) ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ پرائی قومیں ہمیں یہ بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکلام یہ بات اکثر کہتے رہے ہیں کہ قوت ہی قوت کا احترام کرتی ہے (حوالہ روزنامہ ٹائمس آف انڈیا۔۱۸ اگست ۱۹۹۸ء) بجا اور درست۔ مگر طاقت کسے کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب کیا واقعی ہمارے دانشوروں مفکروں اور سماجی کارکنوں اور صحافیوں اور اخلاقی معلموں کے پاس نہیں ہے؟ کیا سیاسی اقتدار کے بازی گروں اور اسلحہ سازوں نے اب اس طرح کے سوالوں پر سوچ بچار کا اختیار بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے؟

اطلاعاً عرض ہے کہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام شاعر بھی ہیں اور بطور یاد دہانی، یہاں اتنا اور عرض کر دینے میں مضائقہ نہیں کہ ہمارے وزیر اعظم جناب اٹل بہاری باجپئی نے کبھی ہیروشیما کے درد کی دستک بھی نہیں سنی تھی (مئی ۱۹۹۸ء کی کسی رات کو نہیں!) اور شعر کہے تھے!

اروندھتی رائے نے اس موقع پر لفظوں سے ایک تصویر بنائی ہے: باجپئی صاحب نواز شریف صاحب اور ڈاکٹر عبدالکلام کی توقعات کے برعکس اگر نیوکلیائی جنگ ہو ہی گئی تو منظر یہ کیا ہوگا؟ یہ کہ ہماری زمین ہماری دشمن بن جائے گی۔ عناصر (آب و آتش خاک و باد) ہمارے دشمن بن جائیں گے۔ ہمارے شہر اور جنگل اور کھیت اور گاؤں جلنے لگیں گے۔ پانی زہر اور ہوا آگ بن جائے گی۔ سورج دھوئیں کے غلاف میں چھپ جائے گا۔ پھر ایک بیکراں رات آئے گی اور نیوکلیائی موسم سرما کا آغاز ہوگا" زمین پر صرف کاکروچ پیدا ہوتے رہیں گے۔"

یہ پیش گوئی قرۃ العین حیدر نے اپنی ایک برسوں پرانی کہانی (فوٹو گرافر) میں بھی کی تھی "کارزار حیات میں گھمسان کا رن پڑا پڑا ہے۔ اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔ زندگی انسانوں کو کھا گئی۔ صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔"

لیکن صاحب، یہ خواب خیال کی باتیں ہیں۔ حقیقت بس یہی ہے کہ سرحد کے دونوں طرف حکومتوں کا کاروبار چل رہا ہے۔ اسی طرح چلتا رہے گا تاوقتیکہ کسی بے نام ساحر یا ساحرہ کی ایک ذرا سی شرارت اس تماشے کو درہم برہم نہ کر دے! ہمارے ایک جواں مرگ شاعر (کمار پاشی) نے ایک نظم (خواب تماشا) میں اپنے آپ سے پوچھا تھا:

"یہ کس کا خواب تماشا ہے

میں جس میں زندہ شامل ہوں
جو سچ پوچھو تو میرا دکھ تنہائی نہیں
کچھ اور ہی بات ہے جس سے دل گھبرایا ہے۔۔۔۔"
اب اسے کیا کیا جائے کہ وہی ان کہی اور انجانی بات اس تحریر کا عنوان بن گئی ہے۔

افسوس! تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

اس شام کو، سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا کہ اچانک کسی نے اظہر صاحب کے انتقال کی خبر دی۔ جی سن سے ہو گیا۔ ہم پچھلے بارہ برسوں سے انھیں بیمار اور فراش دیکھ رہے تھے۔ ان کی زندگی گھر سے اسپتال تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ کبھی طبیعت ذرا بحال ہوتی، اور گھر والے کسی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے ہوتے تو اظہر صاحب کا اصرار ہوتا کہ انھیں وہیل چیئر پر بٹھا کر ساتھ لے جایا جائے وہ باہر کی دنیا سے اپنا تعلق بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ پلنگ کے سرہانے ایک تپائی پر دوا کی شیشیوں اور ڈبوں کے ساتھ چھوٹا ریڈیو بھی رکھا ہوتا۔ اظہر صاحب دنیا جہان کی خبریں سنتے اور پریشان ہوتے رہتے تھے۔ دنیا اب ایسی تو نہیں کہ زیادہ دیر تک اس سے خوش اور مطمئن رہا جائے۔

پھر اظہر صاحب تو ہمیشہ کے حساس اور جذباتی واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے ٹھنڈا مزاج پایا تھا اور عام حالات میں اپنے آپ کو بے قابو نہیں ہونے دیتے تھے۔ اپنی ذات کی حد تک ان کی قوت برداشت حیرت انگیز تھی۔ لیکن معاملہ اصولوں کا ہو تو اظہر صاحب اڑ جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے ضمیر کا اور اپنے ضابطۂ حیات کا سودا کبھی نہیں کیا۔ مذہبی اور نظریاتی کٹھ ملائیت، تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی، جہالت اور ناانصافی کا ذرا سا مظاہرہ بھی انھیں مشتعل اور بے چین کر دیتا تھا۔ اظہر صاحب کی آواز تو شدید غصے میں بھی اونچی نہیں ہوتی تھی، نہ ہی کوئی ناملائم لفظ ان کی زبان پر آتا تھا، لیکن کسی بھی طرح کی سمجھوتے بازی سے انھیں طبعی نفرت تھی۔ اپنے موقف پر وہ ڈٹ جاتے تھے اور ان کے نحیف و نزار وجود میں ناقابل شکست قسم کی سختی سی پیدا ہو جاتی تھی۔

آج سے لگ بھگ چالیس برس پہلے کے الہ آباد کی حیثیت روشن خیالی اور رواداری کے ایک سرگرم مرکز کی تھی۔ اظہر صاحب یونیورسٹی میں ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے، جوان العمر، خوش

شکل، خوش لباس مگر اپنے آپ میں کچھ کھوئے ہوئے سے۔ سردیوں میں سوٹ کے ساتھ ٹائی ضرور باندھتے تھے جو بالعموم سوئٹر سے باہر جھولتی رہتی۔ ان دنوں بیشتر اساتذہ محنت کے عادی ہوتے تھے، سو اظہر صاحب بھی۔ درس کے دوران بلیک بورڈ، چاک اور ڈسٹر کا خوب استعمال کرتے۔ لیکن ڈسٹر کی جگہ ان کے کوٹ کی آستین سفید ہو جاتی۔ اظہر صاحب اس طرف سے یکسر بے پروا اپنا لیکچر ختم کرتے، اپنی پرانی سائیکل اٹھاتے اور یونیورسٹی روڈ کی سمت چل پڑتے جہاں چوراہے پر چچا حکیم اللہ کی کتابوں کی دکان تھی۔ اس دکان پر دنیا بھر کا ترقی پسند ادب دستیاب تھا۔ پیپلس پبلشنگ ہاؤس، ماسکو پبلشرز، چائنیز لٹریچر، کتابیں، رسالے، اخبارات، بہت سستے داموں، یہاں تک کہ ادھار بھی مل جاتے تھے۔ پھر بیٹھنے، باتیں کرنے اور چائے پینے کی آزادی تھی۔ اظہر صاحب ہم سب کی چائے کا بل ادا کرتے۔ کسی طالب علم کو کچھ پیسوں کی ضرورت ہوتی اور اظہر صاحب کو پتہ چل جاتا تو اس کی مشکل بھی حل کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں تاریخ کا شعبہ یونیورسٹی کے معروف شعبوں میں تھا۔ رشبروک ولیمز، ڈاکٹر تارا چند، سر شفاعت احمد خان، ڈاکٹر بینی پرساد، ڈاکٹر رام پرساد ترپاٹھی کی یادوں اور تذکروں سے شعبہ تاریخ کے در و دیوار جگمگاتے تھے۔ ان دنوں شعبہ تاریخ کے سربراہ ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ تھے اور شاہ جہاں بادشاہ پر اپنی معروف کتاب کے واسطے سے علمی حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے دوسرے کئی شعبوں میں بھی نامی گرامی اساتذہ موجود تھے۔ انگریزی میں پروفیسر ستیش چندر دیب، پروفیسر پی ای دستور اور فراق صاحب، سنسکرت اور ہندی کے شعبوں میں ڈاکٹر دھیریندر ورما اور ڈاکٹر رام کمار ورما، اردو میں ڈاکٹر اعجاز حسین، قانون کے شعبے میں پروفیسر کے کے بھٹاچاریہ اور پروفیسر سپرو، سائنس فیکلٹی میں طبعیات کے پروفیسر بنرجی اور پھر شیلا دھر انسٹی ٹیوٹ کے یادگار زمانہ استاد پروفیسر نیل رتن دھر۔ دو چار دانے الگ سے پہچانے جاتے تھے۔ اپنی علمی حیثیت سے زیادہ کسی اور بہانے سے معروف آر ایس ایس کے ڈاکٹر راجندر سنگھ اور جن سنگھ کے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی بھی پڑھانے والوں میں تھے، مدن لال کھورانہ پڑھنے والوں میں۔ لیکن یونیورسٹی کا ماحول اس وقت تک علاحدگی پسندی اور احیاء پرستی کے رجحانات سے آلودہ نہیں ہوا تھا۔ ان پناہ گاہوں کے مکیں عام نظروں سے بچتے پھرتے تھے۔ سیاسی کلچر میں آج کی سی ڈھٹائی اور دراز دستی تقریباً مفقود تھی۔ یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا زور تھا اور اظہر

صاحب اس وسیع حلقے کے ہمدردوں اور ذہنی رفیقوں میں گنے جاتے تھے اپنی روشن فکری اور کشادہ جبینی کا اعتبار اظہر صاحب نے زندگی بھر قائم رکھا۔

اظہر صاحب نے اپنے خاص مضمون یعنی تاریخ سے متعلق انگریزی میں تین کتابیں لکھیں۔ انھیں حکمرانوں کی سیاسی زندگی سے زیادہ دلچسپی ان کے سماجی کوائف اور سروکاروں سے تھی۔ چنانچہ ماضی کے قصوں میں بھی انھیں مختلف ادوار کی عوامی اور اجتماعی زندگی کے مظاہر زیادہ پرکشش دکھائی دیے۔ تاریخ کے علاوہ ادب کا بھی بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ کبھی کبھار کچھ لکھتے بھی تھے، زیادہ تر شخصی نوعیت کے مضامین اور خاکے۔ اظہر صاحب کی اردو تحریروں میں ان کے مزاج کی خلقی شگفتگی اور ان کی اختصار پسندی کا اظہار بے ساختہ طریقے سے ہوا ہے مگر صرف چٹکیاں لینے کی حد تک۔ ان کی فطرت میں شائستگی کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی صلابت بھی تھی۔ اس لیے وہ نہ تو کسی بات کو زیادہ طول دیتے تھے نہ ضرورت سے زیادہ کھلتے تھے۔

الہ آباد چھوڑ کر دلی میں آباد ہونے کے بعد بھی الہ آباد سے اظہر صاحب کا تعلق برقرار رہا۔ سال دو سال میں دو چار روز کے لیے ہو بھی آتے تھے۔ ایک بار الہ آباد پہنچتے ہی بیمار پڑ گئے۔ میں اتفاقاً الہ آباد میں تھا، اطلاع ملتے ہی ان کی عیادت کے لیے گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کی لق دق کوٹھی میں قیام تھا، کئی پرانے شاگرد، ساتھی اور دوست موجود تھے۔ اظہر صاحب جلد ہی سنبھل گئے۔ لیکن اندر سے ان کی حالت اچھی نہیں تھی۔ دلی پہنچ کر دوبارہ بیمار پڑے تو ایسے کہ پھر بستر سے اٹھنا محال ہو گیا۔ بالآخر یہ قصہ ختم اس طرح ہوا کہ ۱۶ر دسمبر کی سہ پہر کو انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اظہر صاحب کا آبائی تعلق مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازی پور کے قصبے یوسف پور سے تھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے خاندان سے تھے۔ اپنے بزرگوں کی علمی اور فکری روایت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی شخصیت میں قصباتی شرافت، وضع داری اور ہندی مسلمانوں کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے اوصاف و عناصر بھی سمیٹ لیے تھے۔ اسی لیے تو ان کے اٹھ جانے سے گرد و پیش کی دنیا میں خالی پن کا احساس اچانک بہت بڑھ گیا— اس خرابے میں انھیں اب ڈھونڈنے جاؤں کہاں!

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

کبھی کبھی کوئی ایک لفظ کسی شخص کی پہچان کا مرکزی حوالہ بن جاتا ہے۔ جگر صاحب کے معالے میں یہ لفظ ''محبت'' ہے۔ ان کی شخصیت میں سرشاری اور والہانہ پن کے ساتھ ساتھ ایک حیران کر دینے والی نرمی اور شائستگی تھی۔ لفظ محبت کا فسانہ ان کے نزدیک ''سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ'' تھا۔ انھوں نے انسانوں سے، اعلیٰ قدروں اور روایتوں سے، اپنے اصول اور آدرشوں سے ٹوٹ کر محبت کی۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ جواباً جگر صاحب کو بھی اپنے زمانے سے، اپنے قدر دانوں سے، دوستوں سے ویسی ہی بے تحاشا محبت ملی۔ ان کے مداحوں میں رند اور مولوی، خواص و عوام، اپنے پرائے سب شامل تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب شانِ محبوبی تھی جس کا اعتبار ان لمحوں میں بھی قائم رہا ہے جب جگر صاحب کو بظاہر اپنے حواس پر بھی قابو نہیں رہتا تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر اور لاپروا نظر آتے تھے۔

اس وقت ذہن جگر صاحب کی کچھ روشن کچھ دھندلی پرچھائیوں کی آماجگاہ بن گیا ہے، اس لیے جی چاہتا ہے کہ ان کے مصرعے ''میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے'' پر باتیں کرنے سے پہلے کچھ باتیں جگر صاحب کے بارے میں ہو جائیں۔ اس کہانی میں میری اپنی کہانی بھی شامل ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ چھیالیس، سینتالیس برس پہلے، مئی کی ایک گرم، پسینے میں شرابور شام تھی۔ گونڈے میں جگر صاحب تحصیل کے پاس پرانی وضع کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کے گھر کے پہلو میں ایک پُلیا تھی۔ جگر صاحب سفید براق کرتے پاجامے میں ملبوس خاموش کھڑے آتے جاتے راہ گیروں کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے نصاب میں جگر صاحب کے شعر بھی شامل تھے اور ان کی تصویر بھی ہم نے دیکھی تھی۔ انھیں پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ میرے ساتھ اس وقت رشتے کے ایک بھائی تھے۔ ہماری عمریں چودہ، پندرہ برس کی رہی ہوں گی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔۔۔ 'جگر صاحب ہیں!' جگر صاحب نے شاید سن لیا تھا۔ صاف لہجے میں

بولے ۔۔۔"صاحب زادے ادھر آئیے!" پھر انھوں نے نام پوچھا اور یہ کہ کہاں رہتے ہیں ۔ میرے بعض بزرگوں اور عزیزوں سے وہ واقف تھے ۔ یہ جاننے کے بعد میرا بھی حوصلہ بڑھا اور جگر صاحب کی خدمت میں دو چار مرتبہ حاضری کا موقع جو ملا تو ان کے سامنے ، ان کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کے باوجود ، کبھی جھجک نہیں محسوس ہوئی ۔

اس وقت جگر صاحب توبہ کے دور میں داخل ہو چکے تھے ۔ رات رات بھر رمی کھیلتے تھے ۔ نماز بھی پڑھتے تھے ۔ ان کی محفلوں میں چائے کی پیالیاں مسلسل گردش کرتی رہتی تھیں ۔ جگر صاحب کے قریبی دوستوں اور پرانے واقف کاروں کا بیان ہے کہ ان میں سے کسی نے کبھی بھی جگر صاحب کی زبان سے کوئی نا ملائم لفظ نہیں سنا ۔ اپنا خیال تو سبھی رکھتے ہیں ۔ جگر صاحب کو دوسروں کی عزت اور رکھ رکھاؤ کا خیال ہمیشہ رہتا تھا ۔ بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دینے کی عادت تھی اور بشری کمزوریوں کو نظر انداز کرنے ، لوگوں کو طرح دینے ، تضحیک اور رسوائی سے بچانے کے معاملے میں وہ بہت روادار تھے ۔ شکل وصورت انھوں نے معمولی پائی تھی ، رنگ سیاہی مائل ۔ چہرے بشرے میں بظاہر جاذبیت نہیں تھی ۔ مگر جس نے بھی جگر صاحب کو دیکھا ہے ، ان کی شخصیت کے حسن اور کشش کا منکر نہیں ہو سکتا ۔ شوکت تھانوی نے اپنی کتاب شیش محل میں غلط نہیں لکھا کہ شعر پڑھتے وقت جگر صاحب پر خوبصورتی چاندنی کی طرح برستی تھی اور اس عالم میں انھوں نے خود اپنے لفظوں میں "اس بدصورت اجاڑ شرابی کے بوسے لیے ہیں!" جگر صاحب شعر نہ پڑھ رہے ہوں اور کسی محفل میں بس خاموش بیٹھے ہوئے ہوں ، جب بھی ہمیشہ شائستہ ، شریف النفس اور دلکش دکھائی دیتے تھے ۔

وہ زمانہ ، جب جگر صاحب کی عمر ڈھل رہی تھی اور ان کی طبیعت میں ایک خاموش اضمحلال پیدا ہو چلا تھا ، ترقی پسند تصورات کی مقبولیت کا زمانہ تھا ۔ جگر صاحب مزاجاً ایک روایتی انسان تھے اور ان کی شاعری کا فکری دائرہ بھی بڑی حد تک روایتی اور رسمی تھا ۔ مگر وہ جو ایک سچائی ان کی شخصیت میں تھی ، اس نے ان کی آخری دور کی شاعری میں بھی حقیقت شناسی اور حقیقت آفرینی کا ایک دلآویز رنگ پیدا کر دیا تھا ۔ ان کے لہجے میں ٹھہراؤ ، فکر میں توازن ، اسلوب میں دھیما پن اور ایک سوچتی ہوئی سی غنائیت نمایاں ہو چلی تھی ۔ اس دور میں جگر صاحب نے جو شعر کہے ، گاہے ماہے ان میں اس طرح کی باتیں بھی نکل آتی ہیں :

سلامت تو ترا مے خانہ تیری انجمن ساقی
مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی
فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل
ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

گویا کہ جگر صاحب کی شاعری میں اپنے عہد کے ادراک نے سیدھی سادی، رومانیت کی معصومانہ روش سے آگے، زندہ مسئلوں اور جیتے جاگتے تجربوں کا رنگ شامل کر دیا تھا۔ جگر صاحب کے عاشقانہ اور رومانی تجربوں کی طرح ان کے یہ تجربے بھی پیچیدہ نہیں ہیں۔ پھر بھی، تجربوں کی یہ جہت جگر صاحب کے تصورات میں ایک نئی سطح کی شمولیت کا اعلانیہ ہے۔ جگر صاحب نے اپنی آنکھیں اور اپنا ذہن زندگی کے آخری لمحے تک کھلا رکھا۔ چنانچہ وہ بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ زندگی کے بدلتے ہوئے طور طریقے بھی ہمیشہ دیکھتے رہے۔ روایتی غزل گویوں کے برعکس جگر صاحب کے تعلقات اور ذہنی رشتوں کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ رشید احمد صدیقی سے لے کر سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری تک اس دائرے میں مختلف النوع نظریاتی اور جذباتی وابستگیاں رکھنے والے افراد شامل ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ جگر صاحب کی اپنی ترجیحات، تخلیقی اور جمالیاتی رویے اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں، پھر بھی وہ ایک دوسرے کے لیے بظاہر نامانوس، حتیٰ کہ متضاد حقیقتوں کو ایک دائرے میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب جگر صاحب کی وسیع المشرب انسان دوستی اور ظرف کی کشادگی تھی۔ جگر صاحب میں رواداری، تحمل اور برداشت کی طاقت بہت تھی۔ ان کی تعلیم اور تربیت پرانے خطوط پر ہوئی تھی اور ان کے شعری شعور کی نشو و نما اصغر صاحب کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ چنانچہ مشرقیت کی بنیادیں ان کی شخصیت میں خاصی گہری اور مضبوط تھیں، تاہم انھوں نے زندگی اور ادب میں رونما ہونے والے تغیرات سے کبھی آنکھیں نہیں پھیریں۔ زندگی سے اور اپنے عہد سے جگر صاحب کا رشتہ علمی، اکتسابی اور مصنوعی قسم کا نہیں تھا۔ ان کی فکر محسوس فکر تھی۔ انھیں تاریخ کا رخ موڑ دینے کا دعویٰ نہیں تھا۔ لیکن اجتماعی تجربے اور تاریخ میں سخت اور بے لوچ قسم کی طبیعتوں کو بھی تبدیل کرنے کی جو خودکار

طاقت ہوتی ہے۔ جگر صاحب اس کے رموز سے آگاہ تھے۔ اس لیے تقسیم، فسادات، تہذیبی اداروں کے زوال، قحط اور ابتری و انتشار کے مظاہر سے وہ پریشان رہتے تھے۔ جگر صاحب کے بیشتر معاصرین اور پیش رو فانی، اصغر، یگانہ، حسرت سے لے کر فراق، فیض اور سردار جعفری اور مجروح تک، جگر صاحب سے زیادہ مرتب ذہن رکھتے تھے اور انھیں علمی اکتسابات کے مواقع جگر صاحب کی بہ نسبت کہیں زیادہ ملے تھے۔ جگر صاحب کے مزاج میں شوریدگی تھی، ان کے احساسات میں تیزی تھی، ان کا باطنی اضطراب اور ملال انھیں ایک نکتے پر دیر تک ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ لیکن جگر صاحب نے طبیعت کی اس افتاد کے باوجود خود کو کبھی بکھرنے نہیں دیا۔ کچھ قدروں کے پاس نے انھیں ایک حد سے آگے جانے اور بھٹکنے نہیں دیا۔ داغ جگر کے ساتھ ساتھ ان کے آخری دور کی غزلوں (آتش گل) کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جگر صاحب کی شخصیت منزل و مقام کی قید سے ہمیشہ آزاد رہی اور اپنی حدوں کے باوجود یہ شخصیت ارتقا اور ارتفاع کے مختلف مدارج سے گزرتی رہی۔ روایت پرستی مزاج میں وہ جو ایک سخت گیری پیدا کر دیتی ہے، جگر صاحب کے شعور میں اس کا نام ونشان نہیں ملتا اسی لیے شعر و ادب اور زندگی کے روایتی تصور رکھنے والوں نے اور انقلابی تصور رکھنے والوں نے جگر صاحب کو یکساں طور پر قبول کیا۔

جگر صاحب نے شعر کی بابت اپنے قائم کردہ ضابطوں اور معیاروں کی کبھی تفصیلی وضاحت تو نہیں کی، شاید وہ اس طرح کا میلان بھی نہیں رکھتے تھے، مگر اپنی بات چیت کے دوران، خطوں میں اکا دکا سوانحی اشاروں میں جگر صاحب نے یہ نشان دہی ضرور کی تھی کہ وہ شاعری کو اور شعر کو ایک وہبی اور خلقی سرگرمی کا اظہار سمجھتے ہیں۔ منصوبہ بند قسم کی شاعری سے انھیں مناسبت نہیں تھی۔ وہ جذبے سے پیدا ہونے والی آگہی کے قائل تھے۔ بقول سلیم احمد کھرا جذبہ اور کھری آگہی ایک سطح پر یکجان ہو جاتے ہیں۔ جگر صاحب کے آخری دور کی شاعری پڑھیے تو اسی تاثر تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں اس لیے جگر صاحب کے دو ایک شعروں پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں—

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

سبزہ و گل، موج و دریا، انجم و خورشید و ماہ
اک تعلق سب سے ہے لیکن رقیبانہ مجھے

گویا کہ فطرت کے مختلف مظاہر کی طرح، جگر صاحب کو بھی کسی جستجو نے ہمیشہ سرگرم سفر اور بے قرار رکھا۔

راہی معصوم رضا کہتے ہیں...
اردو تہذیبی تجربے کا ہندی پیکر

راہی معصوم رضا ہم سے رخصت ہوئے تو ایسے کہ اپنے پیچھے ایک کہانی. ایک روایت. مشترکہ تہذیبی اور لسانی فکر کا ایک خواب نامہ بھی چھوڑ گئے. مگر اردو شعر و ادب کے افق پر ان کی حیثیت ایک گم ہوتی ہوئی یاد، ایک اضطراب آسا اور روشن نقطے کی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے ملک ادب کے جن شہزادوں سے اپنی بزم آراستہ کی تھی. راہی اس کے ایک ممتاز فرد تھے۔ چھٹی دہائی کے ابتدائی برسوں تک اردو کی عام محفلوں اور مشاعروں مین ان کا نام بجتا تھا اور ان کی ایک پہچان قائم ہو چکی تھی۔ میرزا یگانہ پر ان کا مونو گراف. طلسم ہوش ربا کے ارضی اور سماجی پس منظر پر ان کا تحقیقی مطالعہ. ان کی طویل نظم ۱۸۵۷ اور ان کی مقبول عام شاعری کے چرچے باقی تھے۔ میں نے انھیں سب سے پہلے ڈاکٹر اعجاز حسین کے گھر پر اس زمانے کی معروف ادبی انجمن تھرسڈے کلب کی ایک نشست میں شعر پڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ کلب جس کے بنیاد گزاروں میں ڈاکٹر نورالحسن بھی شامل تھے، پانچویں اور چھٹی دہائی کے کئی نامور ادیبوں کے تعارف کا ذریعہ بنا۔ اس زمانے میں راہی کے لیے شہر الٰہ آباد کی حیثیت دوسرے گھر کی تھی اور ان کا قیام وہاں اکثر ہفتوں، مہینوں پر پھیل جاتا تھا۔ اس دوران میں وہ تھرسڈے کلب کی محفلوں میں ضرور شریک ہوتے تھے۔ شعر سناتے تھے۔ لوگوں سے الجھتے اور بحثیں کرتے تھے۔ فراق صاحب. بلونت سنگھ، احتشام صاحب. رضیہ سجاد ظہیر اور اعجاز صاحب سے قطع نظر، ہندی ادیبوں میں ڈاکٹر دھریندر ورما، ڈاکٹر رام کمار ورما اور میرے استاد پروفیسر پرکاش چندگپت بھی تھرسڈے کلب کے جلسوں میں آتے رہتے تھے۔ اس دور میں ترقی پسندی کے شور نے ہندی سے زیادہ

اردو کو سیاسی افکار اور تجربوں کے اظہار کی زبان تو بنا دیا تھا مگر اس وقت تک زبانوں کی سیاست اردو پر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ راہی کی بنیادی حیثیت بھی اردو کے ایک ادیب کی تھی اور ہندی حلقے انھیں اسی حوالے سے جانتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ راہی بھی اس وقت تک اپنی اس حیثیت پر قانع تھے اور انھیں ابھی رسم الخط کی بحث اور ہندی کا محاذ کھولنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ یوں بھی الٰہ آباد کے ادبی معاشرے میں زبان کے نام پر لکیریں نہیں کھینچی تھیں اور گرچہ رسم الخط کے سوال پر مہادیوی ورما، امرت لال ناگر اور بھگوتی چرن ورما کے کچھ بیانات پر کبھی کبھار باتیں تو ہوتی تھیں، لیکن ایسے ہندی ادیبوں کی کمی نہیں تھی جو اردو کے شناس نامے میں کسی بھی سطح پر کسی طرح کی تبدیلی کے طلب گار نہیں تھے۔ (یہ کشادہ قلبی ہمارے ہندی ادیبوں کے ایک حلقے میں آج بھی موجود ہے) پھر پتہ نہیں کیا ہوا اچانک یہ مطلع غبار آلود ہو گیا۔ دھرم یگ میں اپنے ایک مضمون کے واسطے سے راہی صاحب نے بھی ایک مناظرے کا دروازہ کھول دیا اور جس تیزی کے ساتھ ان کا نام اردو میں مقبول ہوا تھا، اسی تیزی کے ساتھ وہ اردو سے الگ اظہار اور بیان کے ایک اور راستے پر آگے بڑھتے گئے۔ الٰہ آباد کا نکہت کلب اور عباس حسینی صاحب کا گھر جواب تک راہی کی ادبی سرگرمیوں کے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا، وہاں ان کی آمد کا سلسلہ بتدریج کم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ راہی کے شعور کا منطقہ بھی تبدیل ہونے لگا۔ یہی زمانہ ہندوستان ٹائمز میں فراق صاحب کے سلسلہ مضامین The Mistake of Hindi اور رامانند دوشی کے رسالے کادمبنی میں لسانی اختلافات پر ان کے معروف کالم رنگ و بو کی اشاعت کا بھی ہے۔ راہی کے علاوہ رام لعل، عصمت چغتائی، مجروح سلطان پوری، سردار جعفری اور کرشن چندر کی کئی متنازعہ تحریریں بھی اسی دور میں سامنے آئیں۔

اردو اور ہندی کے رشتوں کی تاریخ میں یہ ایک افسوسناک مرحلہ تھا اور ہے، مگر اردو ادیب کی حیثیت سے راہی کی تخلیقی زندگی کے پس منظر میں اس مرحلے کا تذکرہ شاید ناگزیر ہے۔ کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ راہی صاحب کے رویے میں مرکز گریزی کی کیفیت رفتہ رفتہ شدید تر ہوتی گئی اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ وہ اردو سے تقریباً دست کش ہو گئے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں ذرا ٹھہر کر اور اردو ہندی تنازعے کی سطح سے اوپر اٹھ کر راہی کے مجموعی رول پر ایک نظر ڈالی جائے۔

بے شک راہی صاحب ہندی کے ایک ممتاز ناول نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور سینما یا ٹیلی ویژن کے حوالے سے تہذیب اور ثقافت کے سوالوں پر انھوں نے اپنے اردو یا ہندی ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ سوچ بچار کیا تھا، بالعموم ہندی میں۔ لیکن ان کا پہلا پیار شاعری تھی اور شاعر وہ اردو کے ہی تھے۔ البتہ ان کی شاعری اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی زندگی کا سب سے نمایاں عنصر یہ حقیقت ہے کہ راہی نے اپنی روایت کے تعین اور اس روایت کی تلاش کا واسطہ اپنی تاریخ کے ساتھ ساتھ اپنے جغرافیے کو بھی بنایا۔ ان کا اصرار ہمیشہ اس بات پر رہا کہ تخلیقی شعور کا اصل سرچشمہ اس کے ارضی اور طبیعی حوالے ہوتے ہیں ایک نظم وصیت کا، جو ۱۹۶۲ء میں انہی کی زبان سے سنی تھی۔ اختتامیہ یہ ہے کہ:

شاید وطن سے دور موت آئے

بہت ہی دور، اتنی دور موت آئے کہ مجھ کو میری ماں کے پاس لے جانا ممکن ہو
تو میری یہ وصیت ہے کہ یہ کاغذ مرے گھر کے پتے پر بھیج دو اور مجھ کو لے جا کر
اگر اس شہر میں یا گاؤں میں چھوٹی سی اک ندی بھی بہتی ہو
تو مجھ کو اس کی گودی میں سلا دو اور ندی سے
یہ کہہ دو کہ یہ گنگا کا بیٹا آج سے تیرے حوالے ہے
وہ ندی بھی مری ماں،
میری گنگا کی طرح میرے بدن کا زہر پی لے گی

یہ طرز احساس ان کی نظموں، غزلوں میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ اصل میں راہی ٹھیٹھ زمینی تجربوں کے شاعر تھے۔ انسانی تجربوں کی پیچیدگی سے زیادہ سروکار انھوں نے اپنے مشاہدے اور آس پاس رونما ہونے والے واقعات سے رکھا۔ مشاعروں میں وہ اکثر طنزیہ سیاسی قطعات پڑھتے تھے اور ان کا ایک قطعہ جس نے بہت شہرت پائی تھی اس زمانے کے یوپی کے وزیر تعلیم سمپورنانند جی کے بارے میں تھا جس کا خاتمہ اس مصرعے پر ہوتا تھا کہ — ''اور جہالت کہ سمپورن آنند تھا۔'' یہی رویہ ان کے لسانی مزاج کا پتہ بھی دیتا ہے جس میں نجی اور Exclusive محاورے یا اسلوب بیان کی سمائی سہل نہیں تھی۔ راہی کی اردو اور ان کی ہندی دونوں ایک

دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور زبان کے ایک ایسے تصور کی راہ ہموار کرتے ہیں جو امتزاجی، جمہوری اور وسیع المشرب رواداراننہ ہو۔ اس تصور کی وکالت نے ان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا کیں۔

کہ بکھر کے بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا
(''شیرازہ'' سید حامد صاحب کا مجموعہ منظومات)

صاف شفاف اور جگمگاتے ہوئے نوتعمیر شہر، ان بستیوں کے سحر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن کے پیچھے تاریخ کا ایک پورا سلسلہ سائے کی طرح لگا ہوا ہو۔ روایت کی ایک اپنی مہک اور اپنا جادو ہوتا ہے۔ مجھے وہ لوگ بھی اچھے لگتے ہیں جو صرف اپنے حال کے قیدی نہ ہوں اور جن کے ساتھ ایک ماضی بھی سانس لے رہا ہو۔ سید حامد صاحب کے اشعار کی یہ کتاب میرے اسی احساس کو تقویت پہنچاتی ہے۔ یہ ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے اخیر میں ایک غزل بھی ہے جو حامد صاحب کے مجموعہ غزلیات ''لمحات'' میں چھپنے سے رہ گئی تھی۔ کتاب کے تعارف میں انھوں نے نظموں کے پس منظر اور بعض متعلقہ تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ساٹھ ستر سال کے دوران جو کچھ دل و دماغ پر گزری ہے، افکار نے جو یورشیں متواتر کی ہیں، مسائل اور مصائب نے جس طرح ہجوم کیا ہے، تجربے اور تلخیوں نے سادگی اور تازگی کو جس انداز سے پیہم گھائل کیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم ان سب کو بھول جاتے ہیں۔ اپنی زندگی سے محو کر دیتے ہیں۔ یہ کام ہر شخص یکسوئی کے عالم میں حافظے اور تخیل کی مدد سے کر سکتا ہے۔ لیکن شاعر کے لیے، خواہ وہ قافیہ پیما ہی کیوں نہ ہو، یہ کام زیادہ آسان اور یہ سفر کہیں زیادہ دلکش اور کلفت رُبا، حیرت انگیز اور چشم کشا ہوتا ہے۔ اس عمل نے میرے عارضِ فکر سے نہ معلوم کتنی جھریاں مٹا دیں۔ زمان و مکاں کے دیار میں یہ طالع آزمائی، یہ گرہ کشائی، یہ نیم بیداری، یہ آنکھ مچولی، مختلف ادوار و اقالیم سے تجدید ملاقات، آڑی ترچھی چال، کبھی آگے بڑھنا، کبھی پیچھے ہٹنا، کبھی دائیں جانا، کبھی بائیں جانا ایک انوکھی جاذبیت رکھتا ہے۔ گویا آپ کی ساری زندگی ایک کتاب کی

طرح ہے جس کو تسلسل سے پڑھنے کے آپ پابند نہیں ہیں. جو باب جس وقت دل کو بھایا، وہی آپ نے پڑھنا شروع کر دیا۔"

یادیں شخصیت میں گہرائی پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ حافظے کا عمل صرف ماضی پرستی نہیں ہے۔ جبھی تو گوتم سدھارتھ نے کہا تھا کہ آدمی ہوا اور پانی کے بغیر چاہے کچھ دن رہ جائے، مگر اس سے اس کی یادیں چھین لی جائیں تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ اسی لیے نظموں کا یہ مجموعہ میرے لیے ایک تہذیبی دستاویز بھی ہے۔ بہ ظاہر اس کتاب میں ذکر ان اشخاص، مقامات اور واقعات کا ہے جو مصنف کے تجربے میں آئے، لیکن ان سب سے مل کر جو تصویر بنتی ہے، اس کے دو زاویے بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر واقعہ، شخص یا مقام ایک طرح کی استعاراتی جہت بھی رکھتا ہے۔ اسی لیے ہر بیان میں کسی نہ کسی تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی قدر کا تذکرہ خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حامد صاحب کی شاعری کا پس منظر اس روایت کے واسطے سے مرتب ہوتا ہے جو اردو کلچر یا ثقافت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کلچر میں شاعری صرف ایک انفرادی تخلیقی سرگرمی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کا ایک مخصوص ثقافتی دائرہ بھی تھا جس میں ادب کا رسمی اور ضمنی مذاق رکھنے والوں کی حسیت مسلسل گردش کرتی تھی۔ اس معاشرے میں شعر فہمی عام تھی۔ مشاعرے اور نشستیں اجتماعی زندگی کے روزمرہ معمولات میں شامل تھے۔ قادر الکلامی کا وصف جسے نئی شعریات کے نظام میں شاید اب پہلی سی عزت اور اعتبار حاصل نہیں۔ گزشتہ ادوار میں ایک بنیادی شعری قدر کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا بڑا کام سمجھا جاتا تھا۔ یہ باتیں اب کل کا قصہ بنیں۔ لیکن گزشتہ زمانوں میں خوش کلامی اور خوش فکری عام تھی اور تعلیم یافتہ طبقے میں ایک خاص طرح کی شوخی اور شائستگی کا رنگ بھی نمایاں تھا۔ اس مجموعے میں "شعر آشوب" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جس میں بدلتے ہوئے ماحول اور آداب شعر کا احاطہ کیا گیا ہے۔

کچھ بند سنیے:

مشاعرہ تو نہیں ہے کہ ہے یہ نوچندی
فضا یہاں کی مکدر ہوا یہاں گندی

یہاں گراں ہے لطافت کثافتیں مندی
زباں غلام نہیں ہے کہاں کی پابندی
مبارک اس کے سپوتوں کو اس کی فرزندی
یہاں تو سانس بھی لینا ہے اس فضا میں وبال

کوئی تحنیت ہے شاعر، کوئی ہے کارندہ
کوئی ہے تیل کوئی ہینگ کافرو شدہ
کوئی ہے چرخِ سخافت پہ مہر تابندہ
ضیائے جہل مرکب سے شعر تابندہ
مزید لطف، مغنی ہے اور خروشدہ
جمالِ شعر سے تابندہ تر ہے ان کا جمال

یہاں ملے گا عزیزو ہر ایک پیشہ ور
سوائے اہل سخن کے ہر ایک اہل ہنر
ہو جس کے پاس رگ شعر کے لیے نشتر
کرے گا ذبح سخن کو، دکھائے گا جوہر
کبھی ہو پھر یہ سعادت نصیب کس کو خبر
مسیح بن نہ سکے تھے تو بن گئے دجال

اس دلچسپ نظم کا آخری بند سن لیجیے:

رواں ہے تیل کی ندی کسی کے بالوں میں
لہو دہن کا بہا ہے لگا ہے گالوں میں
نہ سانولوں میں شمار ان کا ہے نہ کالوں میں
کہی ہے ایک غزل کوششوں سے سالوں میں

خدا نہ کردہ کہیں بہہ نہ جائے نالوں میں
کہیں ہیں لوگ مرے یار! آ، کو تو سنبھال

ہمارے اجتماعی کلچر میں، روایت سے بے لگام آزادی اور ایک سیل بلا کی صورت رونما ہونے والے ابتذال اور عامیانہ پن کے باعث ابتری اور زوال کا نقشہ آج عام دکھائی دیتا ہے۔ اس آندھی کو روکا نہ گیا تو ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ تشویش کا ایک عنصر اسی صورت حال کی وجہ سے ہمارے زمانے کی سماجی فکر کا لازمی حصہ بنتا جا رہا ہے۔ حامد صاحب کی یہ نظم (جس کا حوالہ ابھی دیا گیا) تو خیر اپنے مقصد کی سنجیدگی کے باوجود خوش طبعی کا ایک پہلو بھی رکھتی ہے، لیکن اس مجموعے کی بہت سی نظمیں، جن کا انداز متین اور تفکر آمیز ہے، تشویش کے اسی عنصر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انسانی رشتوں کی روز افزوں خرابی کا احساس، روایتوں کی پامالی کا احساس، سماجی تنظیم کی ابتری کا احساس، طبیعی ماحول کی پراگندگی کا احساس ان تمام نظموں میں ایک زیریں لہر کی طرح موجود ہے اور پڑھتے وقت ہم اس کے ارتعاشات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ یہ نظمیں ایک مٹتی ہوئی تہذیب، ایک غروب ہوتے ہوئے نظام احساس و اقدار، ایک پریشاں حال انسانی معاشرے کی روداد سناتی ہیں۔

اس مجموعے سے حامد صاحب کے یہاں مثنوی کی ہیئت کو ایک ذہنی ضرورت کے طور پر قبول کرنے کی روش کا کچھ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ رابرٹ براؤننگ اور ایلیزبتھ بیریٹ براؤننگ کا قصہ تو خیر محبت کی ایک جاں گداز حکایت پر مبنی ہے اور اس کا بیان مثنوی کے اسلوب میں اپنا ایک واضح جواز رکھتا ہے، لیکن مجموعے کی کئی نظموں سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اس کے شاعر کو ان سانچوں کی تلاش ہے جن میں ربط اور تسلسل کے ساتھ اپنی بات سموئی جا سکے، جس کے یہاں ایک شعلۂ مستعجل سے زیادہ، بہت سوچے سمجھے، پائیدار اور مستقل جذبوں اور خیالوں، یقینوں اور گمانوں کی دھیمی دھیمی آنچ اپنے اظہار کا راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔ حامد صاحب باطنی منظر نامے اور سطح کے اوپر تیرتی ہوئی حقیقتوں کی عکاسی کا یکساں سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس کی سب سے موثر مثال وہ نعتیہ نظم ہے جس سے اس مجموعے کی ابتدا ہوئی ہے۔ نظم کا ابتدائیہ حسب ذیل ہے:

دوپہر کا وقت صحرائے عرب کی تیز دھوپ
ریت کے تپتے ہوئے ذروں پہ اک صید زبوں

پیٹھ ننگی اور سینہ زیرِ بارِ سنگ و خشت
زخم کے اشکوں سے ریگ نقرہ ساماں لالہ گوں
دوسری جانب کوئی جلتے توے سے داغ داغ
کوئی انگاروں کے بستر پر چھڑکتا جوئے خوں

مونجھ کی رسی کے حلقے میں رگ گردن کہیں
پتھروں کی سل کے نیچے کوئی انساں سر نگوں
جرم کیا ہے آئے دن ملتی ہے کیوں ان کو سزا
کرب کی حالت میں کیوں چہرے سے ظاہر ہے سکوں
کیسے مجرم میں عقوبت سے فزوں ہوتا ہے عزم
کیسے خاطی میں لبھا سکتی نہیں دنیائے دوں

احساس تناسب اور موزوں طبعی ایک ایسا وصف ہے جو شخصیت سے ہوتا ہوا اظہار و بیان تک پہنچتا ہے۔ حامد صاحب کی موزونی طبع کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پیش آچکا ہے۔ ماریشس کی عالمی اردو کانفرنس کے دوران ایک مندوب کی طرف سے کچھ ایسی بات ہوئی جس کا سایہ اچھے بھلے ماحول کے ساتھ ساتھ ہم میں سے کئی شرکا کی طبیعت پر بھی پڑا۔ لطف جو غارت ہوا سو ہوا، مگر اس سے زیادہ ملال ہمیں اردو کی ترقی کے بعض منصوبوں کا تھا۔ اس واقعہ پر سب سے زیادہ خاموش حامد صاحب نظر آئے۔ البتہ کانفرنس کے آخری دن مشاعرے کی محفل میں انھوں نے ایک تازہ وارد نظم میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اپنے تجربے کا معروضی تلازمہ تلاش کرنے میں انھیں دیر نہیں لگی۔ یہ قدرت کلام کے علاوہ بدیہہ گوئی کے ہنر کا اظہار بھی تھا۔ علاوہ بریں حامد صاحب کی رائیں اور فیصلے چاہے جتنے دوٹوک ہوتے ہوں، شعر میں اپنے دل و دماغ پر وارد ہونے والے تجربے کا بیان وہ ہمیشہ محجوب اور بالواسطہ انداز میں کرتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو ان کی طبیعت کے رکھ رکھاؤ کا پتہ چلتا ہے، دوسری طرف یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ فارسی شعر و ادب کی روایت سے فطری مناسبت اور شغف نے ان کے اپنے اسلوب اظہار پر بھی واضح اثر ڈالا ہے۔ وہ قدرے فارسی آمیز زبان لکھتے ہیں، نثر میں بھی ن۔م۔ راشد کی

طرح مجتبیٰ حسین مرحوم (پاکستانی نقاد) نے راشد کی زبان کے اس پہلو پر کہیں کچھ لکھ دیا تھا جس پر راشد خاصے برہم ہوئے۔ کچھ اور لوگوں نے بھی اسی بنیاد پر راشد کی شاعری کو نشانہ بنایا ہے۔اس رویے کے معترضین سے راشد نے کوئی بحث تو نہیں کی البتہ یہ ضرور کہا کہ اردو کے اساتذہ اور نقاد اگر سال میں ایک دو نئے لفظوں سے بھی خود کو مانوس کرلیں تو اس میں بھلا نقصان کی کیا بات ہے۔

گجرات، ہندوستانی مسلمان اور راجندر یادو

ہندی کے نامور ادیب، دانشور اور رسالہ ''ہنس'' کے مدیر راجندر یادو کڑوی، متنازعہ باتیں کہنے کے لیے مشہور ہیں۔ کچھ ہی دنوں پہلے اپنے ایک اداریے میں انھوں نے ہنومان جی کو تاریخ کا پہلا دہشت گرد قرار دیا تھا جس نے راون کی لنکا میں آگ لگائی تھی۔ سنگھ پریوار نے ان کے خلاف زبردست ہنگامے کیے۔ اپنے ایک حالیہ اداریے میں انھوں نے اب ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی، تشدد اور ہندی مسلمانوں کی صورت حال پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس پر شک کیا جاسکتا تھا کہ اس طرح حساب برابر کیا جارہا ہے لیکن راجندر یادو دیانت دار آدمی ہیں۔ غلطی بھی کرتے ہیں تو دیانت داری کے ساتھ۔ ان کے اس اداریے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماس کمیونکیشن ریسرچ سنٹر میں مباحثے کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف شعبوں کے اساتذہ اور طلبا کے علاوہ ادب اور صحافت کی بعض معروف شخصیتوں نے بھی حصہ لیا۔ خاصی تند و تیز باتیں ہوئیں۔ بحث تقریباً چار گھنٹے چلی۔

راجندر یادو نے اپنے اداریے میں ''جو میں بھی ہوں، اور تم بھی ہو'' کے عنوان سے کچھ جلتے ہوئے سوالات اٹھائے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا ''اٹل بہاری واجپائی کی گوا والی تقریر میں کہیں سچائی بھی ہے کہ مسلمان جہاں اکثریت میں ہیں، ان میں رواداری اور برداشت کا مادہ کم ہے۔ جہاں اقلیت میں ہیں وہاں (اکثریت کے لیے) سر درد بن گئے ہیں۔ یہ واجپائی کی نہیں ہننگٹن کی رائے (بھی) ہے۔ اس کے مطابق اسلام ایک ماضی پرست سامنتی مذہب ہے اور نئی صورت حال اور جدید سائنس اور علوم سے اپنا تال میل نہیں بٹھا پاتا۔''

☆ ''نشاۃ ثانیہ جیسی کلبلاہٹ یا تقریباً تحریک کی شکل اختیار کرنے والی بیداری اسلام میں کیوں نہیں آئی؟''

☆ ''(زبان کی سطح پر) اصل مسئلہ اردو کا نہیں، اس کے رسم الخط کا ہے جو آج علاحدگی پسندی کا ہتھیار ہی نہیں خود اردو کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی ہے۔''

☆ ''مسلمانوں میں (اجتماعی سطح پر) جس میلان کو فروغ حاصل ہوا ہے وہ ایک طرح کے فرقہ وارانہ گھنّے پن کا ہے۔ یعنی اپنی بات کو صرف اپنے تک رکھنے کی چالاکی۔''

☆ اقلیتی فرقے کی ان کمزوریوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھنے والے سیکولر لوگوں نے مسلمانوں کے ہر کٹر پن کی تائید کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی اجتماعات میں (مثلاً افطار پارٹیوں مین) سفید ٹوپیاں لگا لگا کر پہنچنے لگے۔''

☆ ''میری تشویش یہ ہے کہ کسی اندرونی بحث کا سلسلہ مسلمانوں میں کیوں نہیں چلا؟ تیکھے اور بنیادی نوعیت کے سوال کیوں نہیں اٹھائے گئے؟ آج کے سائنسی ماحول اور ذہنی بیداری کی روشنی میں ایسا کیوں ہوا کہ کسی ادیب. دانشور نے شریعت کے آخری صداقت ہونے کی تصور کو چیلنج کیوں نہیں کیا؟''

جتنے سخت اور دوٹوک یہ سوال تھے، اتنی ہی سختی اور صاف گوئی کے ساتھ راجندر یادو کے ان سوالوں کا جواب بھی دیا گیا۔ کسی طرح کی رو رعایت نہ سوال کرنے والے کی طرف سے نہ جواب دینے والوں کی طرف سے۔ تقریب کی صدارت ہندوستانی ادبیات کے ممتاز عالم اور ہندی کے سربرآوردہ نقاد پروفیسر نامور سنگھ کر رہے تھے۔ انھوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے راجندر یادو کے تمام مقدمات کو غلط ٹھہرایا اور یہ کہا کہ ان کی باتیں (نادرۂ روزگار) نریندر مودی اور (برسر اقتدار) سنگھ پریوار کے بیانات کی توسیع معلوم ہوتی ہیں۔ لگتا ہے کہ یہ الفاظ راجندر یادو کے نہیں بلکہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے کسی ترجمان کی طرف سے کہے گئے ہیں۔ غرض کہ خاصی گرما گرمی رہی۔ قطع نظر اس کے کہ راجندر یادو کے اداریے میں بعض تاریخی شہادتوں اور حقائق کی صحت کا خیال بھی نہیں رکھا گیا تھا، معروضیت اور غیر جذباتی تجزیے کی دھن میں انھوں نے یہ بات بھی بھلا دی تھی کہ اس زہریلے اجتماعی ماحول میں، جب گجرات میں نفرت اور تشدد کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں پڑی اور مودی سرکار ندامت کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی گورو یاترا کے ذریعے نفرت اور تعصب کی سیاست کو ہوا دے رہی ہے، ہنس کا یہ اداریہ کس قسم کی سماجی خدمت انجام دے گا۔ ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کی آڑ میں اسلام اور اسلامی ثقافت پر جو ناروا حملے

کیسے تھے اور جس کی گونج ہمیں واجپائی جی کی گوا والی تقریر میں سنائی دی، اس کی اصل حقیقت سے اب پردہ اٹھ چکا ہے۔ دنیا یہ جان چکی ہے کہ ہننگٹن کے تصورات کی حیثیت ایک سیاسی حربے اور حکمت عملی کی ہے اور اس نے بہ ظاہر علمی لیکن درحقیقت ایک سیاسی مقدمے کی پیروی کی تھی۔ اس نے سامراجیوں کے ایجنٹ کی ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ مگر راجندر یادو تو کھلے کردار کے مالک ہیں۔ ان سے اتنی بھاری بھول کیسے ہوگئی۔

مباحثے میں شریک ہونے والوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مرکزی حکومت کی تائید اور حمایت کے سائے میں گجرات بلکہ سارے ملک کی اجتماعی زندگی آج جس آتش گیر ماحول سے دوچار ہے، اس میں اس طرح کے سوالوں پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ سوچ بچار آسان نہیں ہے۔ ابھی تو ہمارے زخم ہرے ہیں اور مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں چین سے سانس لینے کا موقعہ بھی میسر نہیں آیا ہے۔ مودی جی ایک صاحب کردار مجرم کی طرح اپنی روش پر قائم ہیں۔ دنیا بدل جائے وہ اپنی جگہ پہ اٹل (بہاری واجپئی نہیں) رہیں گے۔ بھاجپا حکومت اسی طرح ان کی ڈھال بنی رہے گی۔ ایسی صورت میں راجندر یادو کی نصیحت اور وعظ و پند کا رویہ کیا معنی رکھتا ہے؟

ہمارے عہد کے ضمیر کی ایک سب سے توانا آواز اروندھتی رائے کے مطابق:

"اگرچہ آج کے ہندوستان اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے جرمنی کے درمیان مماثلتیں لرزہ طاری کر دینے والی ہیں، لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ یہاں ہندوستان میں ہمارے پاس کوئی ہٹلر نہیں ہے اس کے بجائے ہمارے پاس ایک گشتی ٹولا، ایک متحرک سمفونک آرکسٹرا ہے۔ کئی سروں اور بہت سے بازوؤں والا سنگھ پریوار جو بی جے پی، آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک کے ذمے ایک مختلف ساز بجانے کا کام ہے۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ اس سمفنی میں راجندر یادو کی آواز کا شامل ہونا ایک انہونی بات ہے، خود راجندر یادو کے لیے بھی کیونکہ اسی آرکسٹرا کے خلاف تو وہ اب تک پورے جوش و جذبے کے ساتھ سینہ سپر رہے ہیں۔ جنگ کی اس گھڑی میں ہم اپنا ایک سپاہی کھونا نہیں چاہتے۔

مدرسے، فرقہ وارانہ دہشت گردی کے مراکز
یا فرقہ وارانہ دہشت گردی کا نشانہ

اجتماعی زوال کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ جانے پہچانے لفظوں کے معنی بدل دیے جاتے ہیں۔''مدرسے'' یا ''مدرسہ ایجوکیشن'' جیسے سیدھے سادے لفظ بھی آج ایک عجیب وغریب سازش اور سازش کے نتیجے میں پھیلنے والی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ موجودہ سیاست اور سیاسی ماحول نے بہت سی سچائیوں کی شکلیں بدل دی ہیں۔'مدرسے' جو ابھی تک علم اور تعلیم اور پرامن سرگرمیوں کے مراکز سمجھے جاتے تھے، آج انھیں بے علمی (جہالت) اور دہشت گردی کا گڑھ سمجھ لیا گیا ہے۔ یاد کیجیے، ڈیڑھ سو برس سے کچھ اوپر کا زمانہ، جب لارڈ میکالے نے ہماری قدیم تعلیمی روایت کا بہت مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستانی گوروکلوں اور پاٹھ شالاؤں میں جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ اتنی مضحکہ خیز ہے کہ انگلستان کے کنڈر گارٹن کی بچیاں بھی ان باتوں پر ہنسیں گی۔ سیاسی اقتدار رکھنے والے طبقے کی نیت میں فتور اور اس کے مقاصد غیر علمی ہوں تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔

عراق پر جارج بش (سینئر) کے حملے سے پہلے کی بات ہے۔ ایک بین الاقوامی ادبی تقریب میں شرکت کے لیے میں بغداد گیا ہوا تھا۔ وہاں ہمارے سفارت خانے میں اس وقت کمل نین بخشی صاحب ہندوستانی سفیر کے طور پر کام کر رہے تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے مشورہ دیا ''جب بھی وقت نکال سکیں، بابا گورونانک کا مدرسہ ضرور دیکھیے گا۔'' گورونانک مکہ معظمہ کے سفر میں بغداد سے گزرے تھے اور وہاں ایک مدرسے میں کچھ وقت گزارا تھا۔

''مدرسہ'' ایک محترم اور باعزت لفظ ہے۔ یہ لفظ ہمیں اپنی روایت کے ایک بہت قیمتی پہلو کی یاد دلاتا ہے۔ ودیا پیٹھ کی طرح، جہاں دنیا کے جھمیلوں سے دور، گیان دھیان میں ڈوبے ہوئے اساتذہ ادب اور فلسفہ، علوم اور صحائف کی روشنی سے طلبا کے شعور کو منور کرتے تھے اور انھیں

کائنات اور فطرت کے اسرار کا علم عطا کرتے تھے۔

مگر اب "مدرسہ" ایک بدنام لفظ ہے، مسلمان کی طرح۔ اس لفظ کو من مانے مفہوم دے دیے گئے ہیں۔ بنیاد پرستی، دہشت گردی، رجعت پسندی کے مرکز، عقل اور انسانیت اور تہذیب سے برسرِ پیکار آج مدرسے بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ ابھی چند روز پہلے ایک شہرۂ آفاق فرانسیسی مصنف (مائیکل ہوئلیبیق) کے اسلام دشمن بیانات تمام قومی اخبارات کی زینت بنے تھے۔

پتہ نہیں یہ بات مدرسے کے معترضین کو یاد ہے یا نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی پہلے مدرسۃ العلوم ہی کہلاتی تھی۔ 11 ستمبر کے بعد اپنے آس پاس کی اور اسی کے ساتھ ساتھ صدیوں کی جانی بوجھی حقیقتوں کو دیکھنے کا زاویہ اور انداز بدل گیا ہے۔ بہتوں کی نظر اب ترچھی نظر بن گئی ہے۔ چنانچہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جدید اور ترقی پسند زاویۂ نظر رکھنے والوں کے علاوہ، وہ لوگ بھی جو ماضی کو (ہندی میں ماضی کو بھوت کہتے ہیں) موجودہ پر ہی نہیں اپنے آئندہ پر بھی مسلط کرنے میں سرگرم ہیں۔ مدرسوں کو "بنیاد پرستی کے مراکز" کہتے ہیں اور انھیں شک اور بے اعتباری کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ انھیں مٹا دینے کے درپے ہیں۔

ہماری آزادی کی کہانی ہو یا ہماری اجتماعی تاریخ، دونوں کی تعمیر میں مدرسوں کا ایک خاص رول رہا ہے۔ "مدرسوں کے ملا" قومی آزادی کے معروف قائدین سے پہلے، آزادی کا علم اٹھائے ہوئے تھے اور ہر طرح کی قربانیاں (بہ شمول جان کی قربانی) دے رہے تھے۔ جدید تعلیم تو آج بھی ایک مراعات یافتہ طبقے اور گروہ کی میراث ہے۔ جتنے لوگ نئے فیشن کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ لوگ آج بھی مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں کے فرش پر نظر آجائیں گے۔ فرق یہ ہے کہ جدید تعلیم لوگوں کو طاقت بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے جب کہ مدرسوں کی تعلیم انھیں ان کی اصل توانائی سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ مدرسے سے نکلنے والے عام طالب علم کی تقدیر مسجد کا ملا کہلانا ہے۔ ان کے ساتھ عام سلوک یہی ہے۔ لیکن مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا محمود حسن سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد تک، قومی آزادی اور قومی وقار کے یہ رہنما، ان ہی مدرسوں کے پروردہ تھے۔ ہماری جنگ آزادی کو جدید تعلیم سے آراستہ ہونے والوں کی بہ نسبت، ان ہی "ملایانِ مکتب" نے سب سے پہلے ایک سمت اور مقصد سے ہم کنار کیا تھا۔ مدرسے کے یہی ملا ہمارے اولین انقلابی تھے۔

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ایک بھیدی کا بیان ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں سنگھ کی قائم کردہ تقریباً بیس ہزار پاٹھ شالاؤں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ مدھو لیمے نے (۱۰ جون ۱۹۷۹) کے ہفتہ وار سنڈے میں لکھا تھا کہ آر ایس ایس ایک نیم فوجی تنظیم ہے جو ملک اور حکومت پر قبضہ جمانا چاہتی ہے اور نازی لیڈروں کے نمونے پر ایک فاشسٹ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ گاندھی جی نے آر ایس ایس کو ایک ایسی فرقہ پرست پارٹی کا نام دیا تھا جو ایک جماعتی زاویہ نظر رکھتی ہے اور نازیوں اور فاشسٹوں کی مثال کہی جا سکتی ہے۔ ۱۹۳۹ء سے شروع کی جانے والی ایک پرارتھنا جو اس سنگٹھن کے اراکین کی ''راہبر'' سمجھی جاتی ہے، اس کے کچھ حصے حسب ذیل ہیں۔

''اے شفیق ماں! میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

اے ہندوؤں کی سرزمین، میں ایشور اور اپنے بزرگوں کے نام پر قسم کھاتا ہوں کہ میں ہندو مذہب، ہندو سماج اور ہندو سنسکرتی کو فروغ دینے میں اپنے جسم، اپنے دماغ اور اپنی روح سے ایمانداری کے ساتھ کام کروں گا اور اپنے اس عہد کا زندگی بھر پابند رہوں گا!''

مدرسے اس طرح کا کوئی نصب العین نہیں رکھتے نہ ہی مدرسہ ایجوکیشن کے سامنے ایسا کوئی مقصد ہے جسے شک کی نظروں سے دیکھا جائے۔ یہ تو بالعموم غریب، مفلوک الحال، پسماندہ بچوں کو پڑھائی کی آسانی مہیا کرنے کے سہل الحصول وسیلے ہیں جو پسماندگی معاشی سطح پر کمزور طبقوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اسی پسماندگی کے بیشتر مدارس بھی شکار ہیں۔ ان کی جدیدکاری کا ایک سلسلہ کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔

جس طرح ہر باریش انسان اسامہ بن لادن نہیں ہوتا (کیا قیامت ہے کہ امریکی سکھ بھی اس غلط نظری کی زد پر آ گئے) اسی طرح ہر مدرسہ نشین بھی امن و امان کے لیے خطرہ نہیں ہے اور مدرسے تنگ نظری، تعصب اور دہشت گردی کے گڑھ نہیں ہیں۔ انھیں دہشت گردی کی فیکٹریاں کہنے کے لیے وہ ''حوصلہ'' چاہیے جو بے خبری اور منافرت سے پیدا ہوتا ہے اور جو ریلیف کیمپوں کو بھی بچے پیدا کرنے والی فیکٹریوں کے طور پر دیکھ لیتا ہے۔

ہماری مشکل یہ ہے کہ جہاں کہیں انسانی حقوق کی بات چھڑے گی، اس میں ایک سیاسی جہت خود بخود پیدا ہو جائے گی۔ مدرسوں کو آج کے سیاسی ماحول اور فرقہ پرست طاقتوں کی

سازش سے الگ کر کے دیکھنا درست نہ ہوگا۔ اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسوں کی نظر تو اجنمے بچے میں بھی ایک دشمن دیکھ لیتی ہے۔ آج ہماری بنیادی ضرورت ایک ترقی پسند، تعمیری، سیکولر، سائنسی ایجوکیشن پالیسی کی ہے جو سائنسی مزاج کو تعلیم و تدریس کے تمام مراکز اور اداروں کی اساس بنانے کی جدو جہد کو اپنائے اور آگے لے جائے۔ ایک روشن منصفانہ، تعمیری راستے پر، ایک بہتر اجتماعی مستقبل کی طرف!

چراغ بجھتے چلے جارہے ہیں سلسلے وار

جاتی ہوئی پچھلی سردیوں کی اس دوپہر میں سریندر پرکاش کو دیکھ کر ایک دھچکا سا تو لگا تھا مگر پل بھر کے لیے بھی یہ بات دماغ میں نہ آئی کہ ان سے ملاقات آخری ہوگی۔

برسوں سے سریندر پرکاش اپنے خوش باش، صحت مند اور اعتماد سے بھرے ہوئے وجود کی بس پرچھائیں بن کر رہ گئے تھے۔ ذیابیطس نے انھیں کھوکھلا کر دیا تھا۔ آپ اپنے جسم کا بوجھ بمشکل اٹھا پاتے تھے۔ کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرتے تو اچانک پھر بیٹھ جاتے۔ انھیں دیکھ کر دل دہل جاتا تھا۔ بمبئی یونیورسٹی کے ایک ہال میں جدید افسانے پر بات چیت کے لیے لوگ جمع تھے۔ ندا فاضلی، یوسف ناظم، مشتاق مومن، انور قمر، مقدر حمید، الیاس شوقی اور بہت سے جانے ان جانے چہرے۔ ادھر بمبئی کے ہر سفر میں طبیعت اپنے آپ ہی اچانک اچاٹ ہو جاتی ہے۔ جب بھی جاؤ، دل پر یہ بوجھ سا حاوی رہتا ہے کہ ایک عمر کے مانوس دوستوں اور بزرگوں میں سے کوئی نہ کوئی ہمیشہ کے لیے گم ہو چکا ہے۔ اختر الایمان، سردار جعفری، مجروح صاحب، کیفی صاحب، انور خاں اور اب وہ شخص جو سراپا زندگی تھا اور محفل یاراں کی رونق۔ ایک ایک کر کے کتنے چراغ بجھ گئے۔ افسانے پر اس جلسے میں سریندر پرکاش سب کی توجہ کا مرکز تھے۔ بہت دھیمی، اکھڑی اکھڑی سی آواز میں، رک رک کر مرجھائی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کے ساتھ وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر شام بھی ہم نے ساتھ گزاری، انھی کے گھر پر۔ وہ دلی شہر کی ان گم شدہ فصلوں کو یاد کرتے رہے جب کناٹ پلیس کے مرحوم کافی ہاؤس میں یا دوستوں میں سے کسی کے گھر پر محفلیں جمتی تھیں۔ دیویندر ستیارتھی اور بلراج مین را سے لے کر حسن نعیم، بانی، عمیق حنفی اور محمود ہاشمی تک۔ اس زمانے میں ادبی ہنگاموں اور بحثوں کی گرما گرمی سے دلی کا ماحول چھلکا

پڑتا تھا۔ سریندر پرکاش اور بلراج مین را نئے افسانے کے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتے تھے۔ شاعروں میں عمیق حنفی، شہاب جعفری، بلراج کومل، کمار پاشی نے دلی کے ادبی معاشرے میں دھوم مچا رکھی تھی۔ تخلیقی اور فکری، دونوں سطحوں پر وہ نئے افسانے اور نئی شاعری کے سنہرے دن تھے۔ سریندر پرکاش اس دور کی باتیں یوں کر رہے تھے جیسے عمر گزشتہ کی کتاب کا ایک قیمتی باب کھل گیا ہو اور وہ اس میں کھو سے گئے ہوں۔

سریندر پرکاش کی تخلیقی استعداد غیر معمولی تھی۔ ان کے شعور کی تربیت کتابوں کے واسطے سے بہت کم ہوئی تھی۔ زندگی کے کھرے سچے تجربوں اور گرد و پیش کی دنیا کے براہ راست مشاہدے نے ان کے شعور کو وسعت بخشی تھی۔ اپنے ادھورے ناول ''فساں'' میں اور سوانحی قسم کے بعض مضامین میں انھوں نے غیر منقسم ہندوستان سے لے کر موجودہ زمانے تک کی اپنی زندگی کے کئی واقعات اور ادوار سے پردہ اٹھایا ہے۔ سریندر پرکاش کی حسیت میں اپنے اور اپنے زمانے کے تجربوں کو جذب کر لینے کی طاقت بہت تھی۔ بجوکا، بازگوئی، جمغورۃ الفریم، برف پر مکالمہ، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم،، چپی ژان، تلقارمس، جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں، ساحل پر لیٹی ہوئی عورت، خواب صورت۔ یہ اردو کی چند مشہور ترین نئی کہانیاں ہیں جن سے ایک نئے عہد اور ایک نئی بصیرت کی پہچان ہوئی۔ انسان کے مقدرات، اس کے اجتماعی زوال، اس کی تنہائی اور اُداسی، اس کی دنیاداری اور مادہ پرستی کے ایسے جیتے جاگتے مرقع بہت کم افسانہ نگاروں نے پیش کیے ہیں۔ سریندر پرکاش نئے انسان کے باطن کی تصویریں بناتے تھے۔ حیرت انگیز بصیرت کے ساتھ۔ بصیرت کے علاوہ تجربوں کو بیان کرنے کی ان کی صلاحیت بھی حیرت انگیز تھی۔ احساس کی شدت، وفور اور بہاؤ کی ایسی کیفیت سریندر پرکاش کے معاصرین میں بھی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ علامتی افسانے نے سریندر پرکاش کے واسطے سے بیانیہ کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ ان کے چاروں مجموعے، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم، بازگوئی، برف پر مکالمہ اور حاضر حال جاری، اردو کی نئی کہانی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں جو سریندر پرکاش کی یادوں کو ہمیشہ روشن رکھیں گے۔ ان کے قلم میں جادو تھا۔ ع

مرگ مجنوں پہ عقل گم ہے میرؔ

جون ایلیا

امروہے کا دانہ. بالآخر کراچی کی خاک کا پیوند بنا۔ جون ایلیا آج اس مردم خیز خطے کی عظیم الشان تخلیقی روایت کے سب سے ممتاز اور معروف ترجمان کہے جا سکتے ہیں۔ رئیس امروہوی. کمال امروہوی. سید محمد تقی جیسے باکمالوں کے اس خاندان میں جون ایلیا بھی نرالی آن بان والے انسان تھے۔

ان کے جیسے ڈھب اور ڈھنگ کی صورتیں موجودہ زمانے کے کاروباری ماحول میں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اصل میں زندگی اور شاعری کے آداب و اطوار کو ایک دوسرے میں یوں آمیز کر دینا کہ انھیں الگ کرنا آسان نہ رہ جائے، کچھ جون ایلیا ہی کو آتا تھا۔ طبعاً بوہیمین تھے. بے حد آشفتہ مزاج اور اپنے آپ سے قطعاً لاپروا۔ صورت شکل، چال ڈھال، ہاؤ بھاؤ سے شاعروں میں بھی الگ پہچانے جاتے تھے۔ شعر یوں پڑھتے تھے جیسے کسی خدا رسیدہ مجذوب کو حال آ گیا ہو اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہو۔ ان میں ایک عجب شان درویشی اور بلا کی سادگی تھی۔ بچوں جیسی معصومیت اور بھولپن۔ اردو معاشرے میں صادقین کے بعد وہ دوسرے بڑے قلندر تھے۔ اسے بھی اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ دونوں کا وطن امروہہ تھا اور وطن کی محبت نے مرتے دم تک انھیں بے قرار رکھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی رسا ذہن رکھتے تھے اور ان کی جیسی قادرالکلامی بھی اس عہد کے اکادکا شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ شعر اس بے تکلفی سے کہتے تھے جیسے باتیں کرتے ہوں۔

روز اک چیز ٹوٹ جاتی ہے
کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے

ہر گھڑی آسماں کو تکتا ہوں
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

حاصلِ کن ہے یہ جہانِ خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

یہ شاعری ہے کہ ساحری ہے۔ جون ایلیا کی غزلوں میں ایسی مثالیں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ حسرت کے لفظوں میں:

شعر کہتا ہوں ممتنع حسرت
نغز گوئی مرا شعار نہیں

جون ایلیا نے اسلامیات، تصوف اور اردو فارسی کلاسیک کا مطالعہ بڑی دل جمعی کے ساتھ کیا تھا۔ حافظہ قوی تھا۔ اساتذہ کے ہزاروں شعر یاد تھے۔ اس پر مستزاد ان کی طباعی اور قوت ایجاد۔ ان کی نو کلاسکیت نے نئے طرزِ احساس و اظہار کی قبولیت کا دروازہ بھی کھلا رکھا تھا اور وہ اپنی شاعری کے مضامین، موضوعات اور بیان و زبان کے پیرایوں کی بابت خاصی کشادہ نظری کا رویہ رکھتے تھے۔ اس انداز نظر نے جون ایلیا کی شاعری میں نئے پرانے، ہر مزاج کے قاری کے لیے دلچسپی اور کشش کا خاصا سامان پیدا کر دیا ہے۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص طرح کی شائستہ برہمی تھی اور ایک دائم و قائم اضطراب۔ نہ تو خود کسی وقت نچلے بیٹھتے تھے، نہ اپنے احساسات اور افکار کو دم لینے دیتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں کیفیات کے تنوع کے ساتھ ساتھ فکر کے گھنے پن، گہرائی اور دبازت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اپنے مجموعہ کلام ''شاید'' کے ابتدائیے میں انھوں نے اپنی جو فکری آپ بیتی بیان کی ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جون ایلیا کے ذہنی مسئلے گہرے بھی تھے اور گنجان بھی۔ اپنی صورت حال اور گرد و پیش کی دنیا میں اپنی حیثیت کے علاوہ وہ انسانی معاشرے، تہذیب اور کائنات کو درپیش سوالوں پر ہمیشہ سوچ بچار کے عادی تھے اور اپنے مقام و مرتبے کی آگہی بھی رکھتے تھے۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ اپنے بے تہہ معاشرے سے ناخوش اور ناراض بھی ہو جاتے تھے:

زنازادے مری عزت بھی گستاخانہ کرتے ہیں

جون ایلیا جیسے لوگ عام انسانوں کے لیے بیگانہ ہی رہتے ہیں۔ اپنی آزادہ روی، سنک اور لاابالی پن کی وجہ سے دنیا کا رویہ ان کی طرف جیسا بھی ہو، وہ خود کبھی دنیا کو خاطر میں نہیں لاتے۔ یوں جون ایلیا کو اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ مجتبیٰ حسین کا بیان ہے کہ ایک بار امروہہ پہنچتے ہی ریل گاڑی سے اترے، پچھاڑ کھا کے گرے اور زمین کے بوسے لینے لگے۔ ساتھ ہی اپنے آپ کو کوستے بھی جاتے تھے کہ کیسی بد بخت گھڑی تھی جب انھوں نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا۔ اب عمر بھر کا پچھتاوا ساتھ لگا ہے۔ ایسے پراگندہ طبع لوگ اب کہاں پیدا ہوتے ہیں:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ آتش بازی بند ہونی چاہیے
(امن عالم کا خواب)

ولیم فاکنر نے نوبیل انعام قبول کرتے وقت اپنے خطبے میں کہا تھا "ایٹم بم کے بعد انسانیت کے سامنے روحانی مسائل نہیں بلکہ صرف ایک جسمانی مسئلہ رہ گیا ہے۔ یہ مسئلہ ایک سوال پر مبنی ہے، یہ کہ انسانی نسل زندہ رہتی ہے یا نہیں؟" بے شک یہ سوال بہت بڑا اور بہت اہم ہے۔ لیکن اس سوال نے ہمارے زمانے کے لیے طرح طرح کے ذہنی اور روحانی مسئلے بھی پیدا کیے ہیں۔ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان نے خود اپنے لیے متنازعہ حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ خود اپنا عذاب بن گیا ہے۔ اپنے آپ سے ہر وقت الجھتا اور لڑتا رہتا ہے۔ اپنے آپ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور اپنی طرف سے اس شک میں مبتلا ہے کہ اپنی الجھنوں کا علاج وہ کبھی ڈھونڈ بھی سکے گا یا نہیں۔ وہ جذباتی اور روحانی سہارے جو کبھی بہت موثر اور کامیاب دکھائی دیتے تھے، اب اس کے لیے بھروسے کے قابل نہیں رہ گئے۔ مذہب کے نام پر نظریوں، مسلکوں، عقائد اور ایقانات کے نام پر ہمارے عہد کے انسان نے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہنا سیکھا ہے اور ایک دوسرے کی جان کے درپے ہے۔ فرقہ پرستی، تعصب، تنگ نظری، منظم نسل کشی کے جو مظاہر ہمیں اپنی دنیا میں اور اپنے آس پاس دکھائی دیتے ہیں ان کے پیش نظر اپنے آپ سے یا اپنے آزمودہ نظاموں اور اداروں سے کوئی امید بندھتی نہیں۔

۱۶ اگست ۱۹۴۵ء کو انسان کے ہاتھوں انسان کی تباہی کا ایک ناقابل قیاس تماشا سامنے آیا۔ ہیروشیما کا جگمگاتا ہوا شہر آن واحد میں ویران ہو گیا۔ ہمارے عہد کے معروف صحافی ضمیر

نیازی نے اپنی مرتبہ کتاب ''زمین کا نوحہ'' میں اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایٹمی توانائی کو انسان تعمیری کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہے تو بہت جلد اس دنیا سے غربت و فلاکت کی لعنتوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ (مگر) اس وقت تو استرا بندروں کے ہاتھ لگ گیا ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے

ایٹمی جنگ کی تباہ کاری کا جائزہ لیتے ہوئے ضمیر نیازی نے لکھا تھا:

''ایک دھماکا، چارسلیں، ہیروشیما، ۱۶ اگست ۱۹۴۵ء، وقت ۸ بج کر ۱۶ منٹ، مقامی۔ ایک لرزہ خیز دھماکا، آندھی، دھوئیں کے گھنے بادل، گھپ اندھیرا، پھر چاروں طرف آگ کے شعلے جو آن واحد میں آسمان سے بھی پرے اٹھنے کے لیے مچل رہے تھے۔ چاروں اور لاشیں ہی لاشیں اور جو زندہ بچ گئے تھے ان کے جسم پر کپڑوں کے چیتھڑے یا مادر زاد ننگے اور بدن کو تلہ جو کھال سے عاری تھا۔ اس قیامت صغریٰ کو ابھی تیسرا ہی دن تھا کہ یہی حال ایک اور شہر کا ہوا۔ پہلا شہر ہیروشیما تھا تو دوسرے کا نام ناگاساکی۔ پہلے ہلّے میں ایک لاکھ بیس ہزار اور دوسرے میں پچھتر ہزار افراد اسی دن مارے گئے۔ یہ واقعی خوش قسمت لوگ تھے۔ انھیں پتہ بھی نہیں چلا کہ زندہ بچ جانے والوں پر کیا بیتی۔ وہ لوگ بھی خوش نصیب تھے جو چند دنوں، ہفتوں یا مہینوں میں اس جہانِ گزراں سے گزر گئے۔ بدقسمت ترین تو وہ لوگ ہیں جو خود نہ تو زندوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور نہ مردوں میں۔ وہ تو بس بے بسی کے ساتھ اب چوتھی نسل کو زندہ درگور دیکھنے کے لیے سانس لینے کا ڈھکوسلا رچائے ہوئے ہیں۔''

عبرت اور شرم کی بات یہ ہے کہ انسان جس نے اپنے آپ کو تباہ کر لینے کی طاقت حاصل کر لی ہے، اپنے آپ کو مہذب، ترقی یافتہ، ماضی کے انسانوں سے ذہنی اور مادی طور پر بہتر بھی سمجھتا ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کے بعد امریکہ کے صدر ہیری ٹرومین (Harry Truman) کو جب اس ''عظیم الشان کامرانی'' کی خبر ملی تو موصوف نے فرمایا ''ہم نے سب سے بڑے سائنسی جوئے میں فتح حاصل کر لی ہے۔'' اب اس شاندار فتح کی تفصیلات سامنے آچکی ہیں۔'' جس علاقے پر ایٹمی بم گرائے گئے تھے، وہ رہائشی علاقہ تھا۔ تقریباً ساڑھے تین لاکھ کی آبادی پر مشتمل یہ شہر بہت پرسکون تھا اور اس کی آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ بم گرتے ہی چار میل کا

علاقہ پل بھر میں اجڑ گیا۔ چھیاسٹھ ہزار لوگ چند منٹوں میں ہلاک ہو گئے۔ ستر ہزار کے قریب شدید زخمی۔ ستر فیصدی مکانات کھنڈر بن گئے۔ تین دن بعد ناگاساکی میں فوراً مرنے والوں کی تعداد پچاس ہزار کے قریب تھی۔ چالیس فیصدی سے زیادہ مکانات، بازار اور کاروباری ادارے ویران ہو گئے تھے۔"

یہ کیسی جیت ہے؟ کس قسم کی کامرانی اور ترقی؟ ماہرین کی ایک رپورٹ کے مطابق "ایٹمی تاب کاری کے اثرات پچاس میل کے رقبے تک ہوا کے ذریعے پھیل سکتے ہیں۔ اس وقت امریکہ میں جوہری توانائی کے ستر مراکز ہیں۔ ایک سو تین جوہری ری ایکٹر ہیں۔ ان تمام جوہری اداروں کی وجہ سے بیالیس ملین لوگ تاب کاری کی زد پر ہیں۔ جوہری فضلے (Nuclear Waste) کی نکاسی کا مسئلہ الگ ہے۔ یہ فضلہ ہماری زمین کے سمندروں میں پھینکا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سمندر کی آلودگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس وقت غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق مختلف ملکوں میں تیس سے پینتیس ہزار تک جوہری بموں کا انبار موجود ہے۔ ان کی تخریبی طاقت ہماری زمین جیسی پچاسوں دنیاؤں کو چند لمحوں میں ملیامیٹ کر سکتی ہے۔"

تو کیا ہم خواب دیکھنا بھی بند کر دیں؟ ظاہر ہے کہ ہم چاہیں بھی تو شاید ایسا نہیں کر سکتے۔ زمانہ اس وقت جس طرف کو جا رہا ہے اگر اسے روکا نہ گیا اور سمت تبدیل نہ کی گئی تو نتیجہ ظاہر ہے۔ حالیہ فسادات کی تفصیل عام ہو چکی ہے۔ اس کا سب سے اندوہناک پہلو منظم نسل کشی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ ہم سنگ دل بہت ہو گئے ہیں۔ جان سے ایک دوسرے کو جس جس طرح سے مارا گیا، کیسے کیسے تخلیقی طریقے اختیار کیے گئے، سوچیں تو دل ڈوبنے لگتا ہے اور خواب بکھرنے لگتے ہیں۔ آج جس قسم کی سیاست اور سیاسی عقائد کا دور دورہ ہے اور شرم کی بات یہ ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی باگ ڈور سیاسی حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا، سب جانتے ہیں۔

یہ باتیں دل کو ڈرانے والی اور پریشان کرنے والی باتیں ہیں۔ اس لیے گفتگو کے خاتمے پر اب کچھ نظم سن لی جائے۔ دو نظمیں، چھوٹی چھوٹی، اس طرح ہیں۔

پہلی نظم فہمیدہ ریاض کی ہے۔ اس کے صرف آخری چند مصرعے ملاحظہ ہوں۔ ایک آزمائشی دھماکے کے بعد کا منظر دیکھیے:

کلیم کوئی نہیں یاں کلام کیا کیجیے
خدا کا جلوہ نہ تھا اس کا نام کیا لیجیے
یہاں ہواؤں میں اب گرم راکھ اڑتی ہے
کوئی گڈریا یہاں اب کبھی نہ آئے گا
فرازِ کوہ پہ جو بکریاں چرائے گا
کوئی پرندہ بھی اس سمت اب نہ جائے گا
کوئی کسی کو نہ پانی یہاں پلائے گا
اٹھے گا ابر تو برسے گی زہر کی بوچھار
گرج کی گونج سے آئے گی پھر ہنسی کی پکار
زمین کے سینے میں جس شے نے ڈال دی ہے دراڑ
چٹخ گئی ہیں ہوائیں جلا دیا ہے پہاڑ
بس اک ثبوت ہے انسان کی شقاوت کا
بس اک مہیب نشاں دہر کی ہلاکت کا
پہاڑ، تیرہ نصیب!
یہ چند اشک ہیں اک دردمند کی سوغات
بہت طویل تھا یہ دن، بڑی اداس ہے رات!

دوسری نظم کا عنوان ہے "سائرن بج رہا ہے"، شاعر کا نام ہے مصطفی رباب۔ نظم سنیے:

سائرن بج رہا ہے
اور میں
فنا سے پہلے
ایک نظم لکھ رہا ہوں
مجھے نہیں معلوم
کوئی اس نظم کو پڑھ پائے گا
پھر بھی

میں لکھنا چاہتا ہوں
ایک نظم
جس کا نصف حصہ
سرحد کے پار
کوئی سر جھکائے
میرے ساتھ لکھ رہا ہے
میں جانتا ہوں
سائرن وہاں بھی بج رہا ہے!

خطرے کا یہ سائرن ہماری زمین پر اس وقت سے لگا تار بجتا آرہا ہے جب ایٹمی تباہی کا پہلا منظر ہمارے سامنے آیا تھا۔ لہٰذا انسان اسی وقت سے ایک خواب بھی دیکھتا آرہا ہے۔ کب زمانہ اپنا رخ بدلے گا! کب ہمیں ہوش آئے گا! کب اقتدار کی سیاست اپنا گھناؤنا کھیل بند کرے گی اور انسانی تہذیب اپنی کھوئی ہوئی ڈور کا سرا ڈھونڈنے میں پھر سے کامیاب ہوگی! ورنہ تو یہی ہوگا کہ بقول شاعر:

ہم اِس دیس کے بھوکے ننگے
ہم اُس دیس کے بھوکے ننگے
بم پہنیں گے
بم کھائیں گے
اور بم اوڑھ کر سو جائیں گے
گلیوں سے جب ہم نکلیں گے
پیچھے پیچھے بم نکلیں گے
اسکولوں سے قلم دوات تو کم نکلیں گے
بم نکلیں گے
ہم اِس دیس کے بھوکے ننگے
ہم اُس دیس کے بھوکے ننگے

کاٹ کے پیٹ اپنے بچوں کا
میزائیل تیار کریں گے
بھوک کا کاروبار کریں گے

توقیر چغتائی

انجمن اسلام، ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا اور مسلم ادارے

معاصر روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" کے ایک شمارے (۳ نومبر ۲۰۰۲) میں ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا محرک اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق سپریم کورٹ کا ایک حالیہ فیصلہ تھا جس کی رو سے ان تعلیمی اداروں کو جو ریاستی یا مرکزی حکومت کی امداد کے بغیر چل رہے ہیں، ضرورت مند طلبا سے کیپٹیشن فیس کے نام پر اب بھاری رقوم کی وصولیابی کا کوئی حق نہ ہوگا۔ ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا ہے کیونکہ بعض افراد نے بظاہر ادارے چلانے کی خاطر طلبا اور ان کے والدین کے معاشی استحصال کا ایک بہانہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اس شک کا اظہار بھی کیا ہے کہ کہیں اس فیصلے کے باعث مذہبی اقلیتی اداروں کے معاملات میں حکومت کی طرف سے مداخلت بے جا کا ایک سلسلہ نہ چل پڑے اور یہ ادارے اپنے ان حقوق سے کہیں محروم نہ کر دیے جائیں جو آئین کی دفعات ۲۹ اور ۳۰ کے توسط سے انھیں فراہم کیے گئے تھے۔

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا اس وقت انجمن اسلام ممبئی کے صدر ہیں۔ انجمن نے پورے مہاراشٹر میں اقلیتی اداروں کا ایک جال بچھا رکھا ہے۔ اس کا دائرۂ عمل شمالی ہندوستان کی معروف مسلم یونیورسٹیوں سے کسی بھی طرح کم وسیع نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اپنے انفرا اسٹرکچر اور منصوبہ بندی کے لحاظ سے انجمن اسلام کے تحت چلنے والے تعلیمی اور تربیتی پروگرام اور ادارے آج تمام مسلمانوں کے لیے ایک مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً پچپن ہزار طالب علم (جن میں بیس ہزار تو صرف لڑکیاں ہیں) انجمن اسلام کے ۶۷ اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں انگریزی میڈیم اسکولوں سے لے کر اعلیٰ سطحی انسٹی ٹیوٹ، کالج اور پالی ٹیکنک تک شامل ہیں۔ انجمن اسلام کے آئندہ منصوبوں میں یونیورسٹیوں کے علاوہ فارمیسی، نرسنگ اور آرکیٹکچر کے

تین کالجوں کا قیام بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے انجمن اسلام اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا اور وسیع المقاصد اقلیتی ادارہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا ایک انتہائی سرگرم، فعال اور دل آویز شخصیت کے مالک ہیں دس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے انھیں ہمیشہ مخلص، مقصد آگاہ، نیک اندیش اور انجمن اسلام کی ترقی کے منصوبوں میں منہمک اور مصروف پایا۔ ان کی سربراہی میں انجمن اسلام نے کامرانی کی بہت سی نئی منزلیں طے کی ہیں اور مستقبل کا جو خاکہ ترتیب دیا ہے، اس کی تکمیل کے ساتھ یہ عظیم الشان ادارہ برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا بے مثال مرکز بن کر ابھرے گا۔ ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا نے اس ادارے کو اپنے ایک خوابنامے کی حیثیت سے ہمکنار کیا ہے اور اس کی تعبیر کے حصول کی خاطر انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ ان کے ذہنی اور جذباتی اور سروکار کا کچھ اندازہ ان کی ایک تقریر سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا تھا۔

"آج اس ملک میں مسلمانوں کی تقریباً پندرہ کروڑ کی آبادی ہے، یہ ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہے۔ اس کی پسماندگی ہمارے لیے تردد کی بات ہے۔ الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور اپنے ہم مسلک بھائیوں کی خستہ حالی، مفلسی، بیروزگاری اور غیر ذمہ داری پر کڑھتا رہتا ہوں۔ مفاد پرست عناصر نے آج ہندوستان کے مسلمانوں کو پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بابری مسجد جیسے مسائل میں الجھا رکھا ہے اور ان کے لیے ترقی کے تمام راستوں کو مسدود کر رکھا ہے۔ سادہ دل اور گم کردہ راہ چند مسلمان بھی فرقہ پرستوں کی سازشوں میں الجھے ہوئے ہیں اور چند لیڈر بھی اپنے اغراض و مفادات کے لیے انھیں کھلونوں سے خود کو بہلائے ہوئے ہیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی، جذباتی اور اقتصادی صورت حال نے اس وقت ایک ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں سے زیادہ دوسری قوموں کی توجہ اور تجزیے کا مرکز بن گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاست نے مسلمانوں کے مسئلے کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ کہیں عالمی سطح پر دو تہذیبوں کے تصادم کی بات کی جاتی ہے کہیں فرقہ وارانہ مسئلوں کے سیاق میں ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے رول پر بحث ہوتی ہے۔ تشویش کا اور عبرت کا مقام ہے کہ اب عامی اور عالم ہی نہیں ایسے سیاست داں بھی جن کے ہاتھوں میں حکومت اور

اختیارات کی باگ ڈور ہے۔کبھی مدارس کے کردار کو نشانہ بناتے ہیں۔کبھی خم ٹھونک کر ایک چوتھی جنگ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان ایٹمی طاقت بن چکے ہیں اور استرہ بندروں کے ہاتھ میں ہے۔ایسی فضا میں ایک دوسرے کو جنگ کے لیے للکارنے کا مطلب کیا ہوگا اور اس روش کا انجام کیا ہوگا۔سوچیے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔

چنانچہ گھوم پھر کر بات پھر وہیں تک آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی تعلیمی حالت اور ذہنی پسماندگی پر نئے سرے سے غور کرنا ہوگا۔سید حامد صاحب کے ایک حالیہ مضمون سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستان بھر میں یونیورسٹی جانے والے مسلم طلبہ کے صرف تین فیصد کو تعلیم دے رہی ہے۔اس میزان پر جامعہ ملیہ اعشاریہ میں چلی جائے گی اور جامعہ ہمدرد اس سے بھی نیچے۔'' ان تناسبات کی روشنی میں انجمن اسلام کے تحت چلنے والے ادارے، جنوبی ہندوستان کے ادارے، ہمارے مدارس جو ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں،اور سپریم کورٹ کا وہ فیصلہ جس سے آج کی یہ گفتگو شروع کی گئی تھی، ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک وسیع تر پس منظر میں اس پورے مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ہندوستانی مسلمانوں کی نجات کا صرف ایک راستہ ہے جو تعلیم سے ہو کر گزرتا ہے۔

کشمیر اداس ہے

''۔۔۔اور اس اندھیری رات میں اپنے کمرے کی تنہائی میں لیٹے ہوئے، میں سوچتا ہوں کیا اس مکان کے دوسرے کمروں میں لوگ واقعی سو رہے ہوں گے یا میری طرح ان کی نیند بھی اکھڑ چکی ہوگی اور میری طرح وہ بھی احساسات اور سوچ بچار کے ہاتھوں میں اس وقت کٹھ پتلی بنے ہوں گے۔ کل کیا ہوا؟ آج کیا ہو رہا ہے؟ اور کل کیا ہوگا؟''

محمود ہاشمی (مقیم لندن): کشمیر اداس ہے

یہ نقشہ محمود ہاشمی کی دستاویزی، یادگار اور نیم افسانوی تحریر ''کشمیر اداس ہے'' سے ماخوذ ہے۔ اس کا موضوع ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد کشمیر ہے۔ مگر پچپن برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل سے جڑے ہوئے سوالوں کی معنویت جوں کی توں برقرار ہے۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے یا انسانی مسئلہ یا تہذیبی مسئلہ۔۔۔ یا یہ کہ ایک ساتھ کئی مسئلے کشمیر کے ایک مسئلے میں الجھ گئے ہیں۔ اس سوال پر گفتگو کبھی آئندہ ہوگی۔ سر دست تو مجھے کشمیر کی اداس وادی سے اٹھنے والی دو بے چین روحوں کی یاد تازہ کرنی ہے جو پچھلے برس بہت کم مدت میں آگے پیچھے ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئیں۔ اقبالیات کے اسکالر پروفیسر محمد امین اندرابی اور انگریزی زبان کے بے مثال شاعر آغا شاہد علی۔

سید محمد امین اندرابی

امین اندرابی کشمیر یونیورسٹی کے معروف اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر تھے۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے بانی ڈائریکٹر پروفیسر آل احمد سرور کی سبکدوشی کے بعد انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالی تھی۔ انھوں نے مکاتیب اقبال پر اعلیٰ درجے کا تحقیقی کام کیا تھا اور انسٹی ٹیوٹ کے لیے

اقبال پر کئی اہم کتابیں مرتب کی تھیں۔ سرور صاحب کے کشمیر چھوڑنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے معیار کو قائم رکھنا آسان نہیں تھا۔ لیکن امین نے نہ صرف یہ کہ انسٹی ٹیوٹ کے وقار کی حفاظت کی، اس کی شاندار روایت کو آگے بھی بڑھایا۔

امین سے میری ملاقات تقریباً پچیس برس پہلے انسٹی ٹیوٹ کے ایک سمینار میں ہوئی تھی۔ اقبال اور مغرب کے عنوان سے برپا ہونے والے اس مذاکرے میں کئی ممتاز علمی شخصیتیں موجود تھیں۔ سردار جعفری، پروفیسر عالم خوندمیری (مرحوم)، جگن ناتھ آزاد، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، مہمانوں کی خبرگیری اور سمینار کے مختلف اجلاس کے اہتمام کی ذمہ داری سرور صاحب نے امین کے سپرد کر دی تھی۔ امین کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم نصرت نے انتظامات کا سارا مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ دونوں صبح سے شام تک تازہ دم اور مصروف دکھائی دیتے۔ نصرت کے مزاج میں سیمابیت، شگفتگی اور تیزی بہت تھی۔ مجھے یاد ہے، لگ بھگ ان ہی دنوں خوشونت سنگھ نے، جو اس وقت "السٹریٹڈ ویکلی" کے مدیر تھے، اپنے ایک مقبول و معروف کالم میں نصرت کا ذکر تفصیل سے کیا تھا۔ اس کے برعکس امین اندرابی کے مزاج میں ٹھہراؤ، جھجک اور متانت بہت تھی۔ وہ ایک شرمیلے اور خاموش انسان تھے۔

پچھلی سردیوں میں بھی کشمیر یونیورسٹی کی دعوت پر میرا سری نگر جانا ہوا تھا۔ تین چار شامیں اندرابی خاندان کے ساتھ ان کے خوبصورت اور آراستہ مکان میں گزریں۔ ایک شام گیارہ ستمبر کے واقعات کی عینی شاہد اور جوان سال صحافی مایا میر چندانی بھی اندرابی ولا میں ہمارے ساتھ تھیں۔ نصرت اور امین کے ہونہار بیٹے مجتبیٰ اور بیٹی تابش بھی تھے۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات سے ہوتی ہوئی گفتگو کشمیر پر آکے ٹھہر گئی۔ امین کے چہرے کی افسردگی میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ ایک دبے دبے سے جوش کے سبب، ان کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور وہ کہہ رہے تھے "دیکھیے تو! یہاں شام کے ساتھ ہی سناٹا چھا جاتا ہے۔ راستے ویران ہو جاتے ہیں۔ کاروبار تقریباً ٹھپ ہے۔ ہم باہر نکلتے ہیں تو یقین نہیں رہتا کہ گھر واپس بھی آئیں گے۔ ایک طرف تشدد کی راہ اپنانے والے نوجوان ہیں، دوسری طرف کشمیر کی حفاظت پر مامور فوجی۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب کون کس کی گولی کا شکار ہو جائے۔ نہ تو زندگی محفوظ ہے، نہ ہمارا وقار اور ناموس۔ تلاشی اور تحفظ کے نام پر ہم لوگ آئے دن توہین آمیز تجربوں سے گزرتے رہتے ہیں۔" ہم سب خاموشی سے امین کی باتیں

سن رہے تھے۔ اس کے بعد کسی طرح موضوع بدلا اور آغا شاہد علی کا تذکرہ چھڑ گیا۔ جن کا گھر امین کے پڑوس میں واقع تھا۔ آغا شاہد علی کی نظموں کے کشمیری ترجمے پر امین ان دنوں نظر ثانی کر رہے تھے۔

یہ امین سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ اب کے دسمبر میں سری نگر جانا ہوا تو امین ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ نصرت نے بتایا کہ ایک روز ناشتہ کرتے کرتے ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ انھیں اسپتال لے جایا گیا اور بس ذرا دیر بعد ہی انھوں نے دم توڑ دیا۔ ان کے دماغ کی شریانیں پھٹ گئی تھیں۔ کشمیر کی اداسی کے ساتھ یہ کشمیر کے ایک فرزند کی اداسی کا ہولناک انجام تھا۔

آغا شاہد علی

آغا شاہد علی کا انتقال دماغی سرطان کی وجہ سے ہوا۔ ان کی عمر کل ۵۲ برس تھی۔ چہرے مہرے سے اور بھی کم عمر لگتے تھے۔ نفیس، نرم خد و خال اور بچوں جیسا معصوم چہرہ۔ آغا شاہد علی کشمیر کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر آغا اشرف کے صاحب زادے تھے۔ آغا اشرف صاحب نے دلی کے ذاکر باغ میں بھی ایک گھر بنا لیا تھا۔ کبھی کبھار یہاں آکر رہتے تھے۔ قرب مکانی کی وجہ سے آتے جاتے کئی بار آغا شاہد علی سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ شرمیلے، کم سخن اور اپنے آپ میں گم رہنے والے نوجوان تھے۔ دہلی یونیورسٹی کے بعد انھوں نے امریکا کی پنسلوانیا یونیورسٹی میں ٹی ایس ایلیٹ پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی۔ آغا شاہد علی نے دو حیثیتوں سے امتیاز حاصل کیا۔ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں وہ انگریزی پڑھاتے رہے۔ وہ ایک انتہائی لائق استاد تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں میں (جن میں مغربی اور مشرقی کی کوئی تفریق نہیں) یکساں طور پر ان کی موت کا ماتم کیا۔ آغا شاہد علی کے لیے ان سب نے عقیدت اور محبت کے جن جذبوں کا اظہار کیا ہے، ان سے اس مرحوم کی لیاقت، مقبولیت اور منصب شناسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک معلم سے زیادہ یاد رہ جانے والی اور بڑی قابل توجہ حیثیت آغا شاہد علی کو ان کی شاعری کے واسطے سے ملی۔ وہ انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ انگریزی میں جیسی فطری، بے ساختہ، پرکشش، بصیرت اور تاثیر سے بھری

ہوئی شاعری وہ کرتے تھے۔ اس کی مثالیں اس عہد میں بہت کم یاب ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ غالباً ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ جب آغا شاہد علی کی عمر صرف ۲۳ برس تھی۔ اس کے بعد کئی مجموعے منظر عام پر آئے۔ انھوں نے انگریزی میں فیض کی نظموں اور اشعار کا ترجمہ بھی کیا۔ اس کتاب کو عالمگیر شہرت ملی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آغا شاہد علی کی اپنی شاعری کا ایک مجموعہ "ایک ملک جہاں کوئی ڈاک گھر نہیں ہے!" موجودہ انسانی صورتحال، خاص طور پر کشمیر کے ذہنی، جذباتی اور اجتماعی درد اور احساس بے بسی کی ایک غیر معمولی تخلیقی دستاویز ہے۔ یہ نظمیں دل کو چھوتی ہیں۔

ہندوستانی ادبیات کے بہت ممتاز اور معروف نمائندوں نے جن میں امتیابھ گھوش اور سجد انندن جیسے لوگ بھی شامل ہیں، آغا شاہد علی کی بے وقت موت کا سوگ منایا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی جریدوں میں مسلسل ان پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ انھوں نے مشرقی اور مغربی روایتوں اور تخلیقی مزاج کے انوکھے سنگم سے ایک نغمہ ریز اور ناقابل تقلید قسم کی شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس طرح دو تقریباً متضاد تہذیبوں اور رویوں کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھنے کا یہ تخلیقی انداز ہر لحاظ سے بے مثال ہے۔ آغا شاہد علی انتہائی نازک احساسات رکھنے والے شاعر تھے۔ فارسی اور ہندوستانی بلکہ پورے مشرق کی جمالیات کو انھوں نے جدید مغربی جمالیات کے ساتھ جس طرح ایک دوسرے میں آمیز کیا ہے اور اپنے وطن کے آشوب کو لازوال اور دلکش زبان عطا کی ہے اس کی اہمیت اور آب و تاب ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی شاعری ایک دردمند دل کی پکار ہے۔

آغا شاہد علی کے بوڑھے، دل شکستہ اور حوصلہ مند باپ نے اپنے نامور اور غیر معمولی بیٹے کی یاد میں ایک "آغا شاہد علی فاؤنڈیشن" قائم کیا ہے۔ فاؤنڈیشن کی طرف سے سالانہ یادگاری خطبوں کا اہتمام بھی کیا جائے گا۔ کچھ دنوں پہلے سری نگر میں ایک یادگار جلسہ ہوا تھا۔ بڑی بڑی شخصیتیں جمع تھیں۔ سب کے سب غم اور احساس محرومی کی ایک دل کو پگھلا دینے والی کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے:

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے!

دلّی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

دلّی کی تہذیبی زندگی بہت دنوں سے ایک مسلسل خرابی اور انتشار کی زد پر ہے۔اب یہ شہر پہچانا نہیں جاتا۔کچھ پرانے نشان آثار قدیمہ کی شکل میں ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔باقی تو جو کچھ ہے دلّی سے روایتی تعلق رکھنے والوں کے لیے نیا اور نامانوس ہے۔

بیگم حمیدہ سلطان دلّی کی پرانی تہذیب کی آخری باقی ماندہ نشانیوں میں تھیں۔مدت سے بیمار تھیں۔گھر سے نکلنا تقریباً بند تھا۔پھر بھی دلی کا اور اردو کا تذکرہ ان کے بغیر ادھورا تھا۔ان کا تعلق لوہارو خاندان سے تھا۔غالب کے سسرالی رشتہ دار۔حمیدہ آپا کے انداز و اطوار، لب و لہجے، شکل و صورت میں گئے دنوں کے تہذیبی وقار اور آن بان کی جھلک آج بھی دکھائی دیتی تھی۔وہ پچھلے سینتالیس برس سے انجمن ترقی اردو (ہند) کی دلی شاخ کی سربراہ تھیں۔پرانی دلی میں ان کی شاندار حویلی اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کا مرکز بن گئی تھی اور عظمت رفتہ کے ایک دور کی یاد دلاتی تھی۔وہ محفلیں اور جلسے منعقد کرتی رہتی تھیں۔غالب کے یوم وفات پر ہر سال مرزا غالب کے احاطے میں ایک تقریب کا اہتمام کرتی تھیں۔ان کے دم سے بجھتی ہوئی دلّی میں بھی خاصی رونق تھی۔

ایک زمانے میں حمیدہ آپا شعر بھی کہتی تھیں۔مگر وہ معروف ہوئیں،ایک نثر نگار کی حیثیت سے۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ نیلمبر کے نام سے اور دو ناول 'رنگ محل' اور 'ثروت آرا' کے نام سے شائع ہوئے۔یہ ناول مقبول بھی ہوئے۔خاندان لوہارو کے شعرا کا ایک تذکرہ بھی انھوں نے مرتب کیا تھا۔اپنے مرحوم بھائی جناب فخرالدین علی احمد، سابق صدر جمہوریہ اور ان کی بیگم عابدہ احمد صاحبہ کی مدد سے انھوں نے یادگار غالب کمیٹی کا ڈول ڈالا تھا۔آگے چل کر یہی کمیٹی غالب انسٹی ٹیوٹ کی شکل میں برگ و بار لائی۔

حمیدہ آپا اردو اور غالب سے اپنی محبت اور دلی شہر کے تہذیبی ماحول اور سرگرمیوں سے اپنے تعلق کی بنیاد پر جانی جاتی تھیں۔ ان کے اٹھ جانے سے بزم آرائیوں کا ایک سلسلہ ختم ہوگیا۔ شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا۔

۱۹ جنوری کو حمیدہ آپا رخصت ہوئیں۔ اس کے اگلے دن ۲۰ جنوری کی صبح کو اچانک پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی کی موت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کیمپس اور آس پاس کے علاقے میں گویا کہ ایک بجلی سی گری۔ ایسا لگا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور آس پاس کی بستی میں اچانک زندگی ٹھہر گئی ہے اور ہر طرف صرف سناٹا ہے۔

سید ضیاء الحسن ندوی کو ایک استاد کی حیثیت سے جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، وہ ہر لحاظ سے غیر معمولی تھی۔ وہ جامعہ میں شعبۂ عربی کے صدر اور فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگو یجز کے ڈین تھے۔ جامعہ کی تمام اعلیٰ انجمنوں کے رکن کی حیثیت سے، جامعہ کی انجمن اساتذہ کے صدر کی حیثیت سے ان کی خدمات کا اعتراف ہر حلقے میں کیا گیا۔ وہ ایک انتہائی شریف النفس انسان اور لائق استاد تھے۔ عربی زبان و ادب پر وہ عبور رکھتے تھے اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں انھوں نے جامعہ کی اور ہندوستان کی نمائندگی کی تھی۔ پچھلے کچھ برسوں سے وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے عربی مجلّے ثقافت الہند کے مدیر اعلیٰ بھی تھے۔ ان کی نگرانی میں مولانا ابوالحسن علی ندوی پر ایک خصوصی نمبر کے علاوہ بھی اس مجلّے کے جو شمارے منظر عام پر آئے، انھیں ملک اور بیرون ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔

ضیاء الحسن مرحوم اچھے انسانوں کی اس معدوم ہوتی ہوئی قسم کے نمائندے تھے جو زندگی کے ہر دائرے میں اور ہر سطح پر انسانی وقار اور شرف کی حفاظت کرتی ہے۔ جب بھی اور جو بھی ذمے داری ان کے سپرد کی گئی، ضیاء الحسن مرحوم نے اس کا حق ادا کردیا۔ اپنے شاگردوں میں، ساتھیوں میں، دوستوں اور شناساؤں میں انھیں ہمیشہ محبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ایک ایسے دور میں جب اچھے اچھوں نے دنیاداری کے چلن سیکھ لیے ہیں اور بہت سے اساتذہ کو بھی اب اپنے منصب کی حرمت اور رکھ رکھاؤ کا خیال نہیں رہتا۔ ضیاء الحسن مرحوم ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اخلاق کی وسعت، ان کے مزاج کی ملائمت، ان کی خوش خلقی اور نیکی، ان کے کردار کی صلابت اور ان کی صالح، بے داغ شخصیت کی کشش اور دلآویزی کا

اعتراف سب کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی اور اس وقت ندوہ کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی تھے۔ ضیاء الحسن مرحوم کے تعزیتی جلسے میں ندوۃ العلماء کے سربراہ اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر حضرت مولانا رابع حسنی ندوی ایک وفد کے ساتھ شریک ہوئے۔ اس جلسے میں جامعہ کے طلبا اور اساتذہ اور کارکنوں کے علاوہ دلی شہر کی علمی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پوری بستی امڈ آئی ہے اور ضیاء الحسن مرحوم کے انتقال کا غم صرف ان کے عزیزوں اور رفیقوں کا غم نہیں ہے۔ یہ غم ایک دنیا کا غم ہے۔ انھیں جامعہ کا وقار ہمیشہ عزیز رہا چنانچہ محض اپنے وسائل میں اضافے کی غرض سے انھوں نے کوئی ایسی خدمت کبھی قبول نہیں کی جو ایک شریف، لائق اور قناعت پسند معلم کے شایان شان نہ ہو۔ صبح سے شام تک وہ یا تو طالب علموں میں گھرے رہتے تھے یا پھر ادارے کے کاموں میں مصروف۔ ان کی صحت برسوں سے خراب تھی۔ انھوں نے لاپروائی برتی تو صرف اپنی صحت کی طرف سے۔ کس کو پتہ تھا کہ ان کی روشن اور فیض رساں زندگی کا سفر اچانک اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔

ضیاء الحسن مرحوم کو جو محبت اور عزت اپنی زندگی میں ملی وہی ان کی موت کے سانحے پر بھی ان کے ساتھ رہی۔ ہزاروں کے مجمعے نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ انھیں رخصت کیا۔ وہ مدتوں اسی طرح یاد کیے جائیں گے:

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اس دیوار میں کہیں کوئی کھڑکی نہیں ہے
(ایک خواب جو پورا نہ ہو سکا)

کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو بار بار دیکھے جاتے ہیں۔ایسا ہی ایک خواب میرا بھی ہے۔ یہ کہ ہوا کی ایک بے پرواموج کی طرح، پرواز میں مصروف پرندوں کی طرح، یا خوشبو کی ایک لہر کی طرح، یا خیال کی طرح ہندوستان اور پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف، جو لوگ آباد ہیں، جب چاہیں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ جا سکیں۔ کچھ لوگوں نے تو اس خواب کے ساتھ ایک عمر گزار دی اور نا کام و نامراد دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ہندوستان میں جدید مصوری کے قافلہ سالار اور کسی یونانی رزمیے کے روایتی کردار جیسے دراز قامت، کشادہ پیشانی ''پادریوں جیسی لہراتی ہوئی داڑھی اور گھنے گچھے'' جیسے ابروؤں کے سائے میں چمکتی ہوئی ذہین، بے حد تیز اور دوربین آنکھوں والے، بہت نرم آواز اور سہج انداز و اطوار والے مصور پدم بھوشن، بھابیش سانیال ایک سو ایک برس کی زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

سانیال صاحب، جنہیں لوگ پیار سے بابا کہتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ میں حائل سیاست، نفرت، تعصب، جہالت اور بے خبری کی دیوار میں زندگی بھر کسی کھڑکی، کسی دریچے یا روشن دان کا خواب دیکھتے رہے۔ ۱۹۴۷ کی تقسیم ایک حقیقت سہی اور اس حقیقت کی تہہ سے جھانکتی ہوئی تاریخ کی منطق بھی ایک حقیقت سہی، لیکن ہر ایسی دیوار جو انسان بناتا ہے، اگر چاہے تو اس دیوار میں ایک روزن، ایک روشن دان کی گنجائش بھی نکال سکتا ہے۔ ہمارے پردھان منتری اٹل بہاری واجپئی جی بہت پہلے جب ایک ملغوبہ حکومت میں وہ ہندوستان کے وزیر

خارجہ تھے، ایک معروف تقریر میں انھوں نے بہت زور دے کر یہ بات کہی تھی کہ ''بٹوارے کی دیوار میں کوئی کھڑکی تو کھلنی ہی چاہیے۔ کچھ تاک جھانک تو ہونی ہی چاہیے!'' لیکن واہ رے سیاست کا جبر۔ اب تو جہازوں کی پرواز بھی بند ہے۔ رہے پرندے تو ان پر بھلا انسان جیسی بد بخت اور مجبور و مقہور مخلوق کا کون سا حکم چل سکتا ہے۔ دونوں ملکوں کے سیاست دانوں نے کم از کم بٹے ہوئے خاندانوں کے لیے تقسیم کی دیوار کو دیوار گریہ بنا دیا۔ یہ صرف سیاست کے ہاتھوں انسانی رشتوں کے زوال کا عروج ہے۔

سانیال صاحب سے جب بھی ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستان کا، لاہور کا، لاہور کے کالج آف آرٹس کا تذکرہ بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ کرتے تھے۔ ان کے اس رویے کے پیچھے ان کی ذاتی زندگی کے ایک پورے دور کی کہانی، ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتے تھے، ان کی زندگی میں یہ برصغیر کا تیسرا بٹوارہ تھا۔ پہلا بٹوارہ ۱۹۰۵ کی تقسیم بنگال، دوسرا بٹوارہ ۱۹۴۷ جس نے ہزاروں برسوں پر پھیلی ہوئی مشترکہ تہذیبی روایت اور تاریخ کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اور تیسرا بٹوارہ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا قیام۔ ان کا جنم آسام کے اس علاقے میں ہوا تھا جو بنگال سے ملحق ہے اور وہاں بنگالی بولی جاتی ہے۔ مصوری کی پہلی سند انھوں نے کلکتہ کے گورنمنٹ کالج آف آرٹ سے حاصل کی تھی۔ ۱۹۲۹ میں لاہور کے کانگریس اجلاس کے موقع پر لالہ لاجپت رائے کا ایک پورٹریٹ بنانے کی غرض سے لاہور جانے کا موقع ملا اور وہ وہیں کے ہو رہے۔ پورٹریٹ کا کام ختم کرنے کے بعد انھوں نے لاہور کے میو کالج آف آرٹ میں لیکچرشپ قبول کرلی۔ پھر اس کالج کے وائس پرنسپل بنا دیے گئے۔ اچانک ان پر برطانوی حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ اس شبہے میں کہ وہ انگریزوں کے وفادار نہیں ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے حامی ہیں۔ انھیں نوکری چھوڑنی پڑی۔ لیکن وہ لاہور نہیں چھوڑ سکے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ میں لاہور کے کالج آف آرٹس کی بنیاد رکھی اور اسے پروان چڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۷ میں ملک تقسیم ہوا تو بھابیش سانیال بھی لاہور سے ہجرت کر کے دلّی میں آبسے۔

لاہور کا کالج آف آرٹس، میں نے پہلی بار ۱۹۸۶ میں دیکھا۔ فیض احمد فیض کی بڑی بیٹی سلیمہ ہاشمی، جو بالآخر اس کالج کی پرنسپل ہوئیں اس زمانے میں وہاں پڑھاتی تھیں۔ انھی کی قیادت میں اس کالج کے در و دیوار سے ہمارا تعارف ہوا۔ کالج کے چپے چپے پر سانیال صاحب کی

یادوں کے نشان تھے۔ وہ لوگ بھی جنھوں نے سانیال صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا ان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ پاکستان سے واپسی پر للت کلا اکیڈمی کی سالانہ نمائش میں سانیال صاحب سے ملاقات ہوئی اور لاہور کا ذکر آیا تو ان کی آنکھیں اچانک چمک اٹھیں۔ لاہور کے ذکر پر وہ ہمیشہ جذباتی ہو جاتے تھے۔ اب سے دس پندرہ برس پہلے تک ہندوستان اور پاکستان کی تہذیبی زندگی میں یہ فاصلہ اور یہ فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ دونوں ملکوں کے شاعر ادیب، دانشور، مصور، موسیقار، فن کار آئے دن آتے جاتے رہتے تھے۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانوں کا دروازہ اتنی سختی کے ساتھ ایک دوسرے کے لیے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اسلام آباد کے ہندوستانی سفارت خانے میں ادبی جلسے اور نمائشیں، مشاعرے اور محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ اسی طرح دلی کے پاکستانی سفارت خانے میں موسیقی کی محفلیں، مذاکرے، جلسے ہوتے تھے۔ یوم اقبال کی سالانہ تقریب میں کسی نہ کسی ہندوستانی ادیب کو بطور مقرر یا مقالہ نگار دعوت دی جاتی تھی۔ خوشونت سنگھ نے اقبال کی نظموں 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ' کا انگریزی ترجمہ ایسی ہی ایک تقریب میں سنایا تھا۔ ادبی اور ثقافتی جلسوں میں ہندو مسلمان سکھ سب کے سب بلا تکلف شریک ہوتے تھے۔ پاکستانی ہائی کمشنر کی رہائش پر بھی برابر جلسے ہوتے رہتے تھے۔

ایسی ہی ایک محفل میں جس کا اہتمام اس زمانے کے پاکستانی ہائی کمشنر (غالباً) ریاض کھوکھر صاحب نے کیا تھا سانیال صاحب کے ساتھ ایک شام گزری تھی۔ پاکستانی قوالی اور موسیقی کی محفلیں سب سے زیادہ اس دور میں منعقد ہوئیں جب اردو کے معروف ادیب، افسانہ نگار منیر احمد شیخ دلی میں پاکستان کے کلچرل کاؤنسلر تھے۔ ان کے گھر کی محفلوں میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کے صحافی، ادیب، دانشور، فن کار، سبھی شریک ہوتے تھے۔ ان موقعوں پر سانیال صاحب بھی اکثر دکھائی دیتے۔ کبھی ریشماں، کبھی غلام علی، کبھی مہدی حسن، کبھی اقبال بانو، کبھی صابری برادران اپنی آواز کا جادو جگا رہے ہیں اور ہندوستان پاکستان کی مشترکہ تہذیبی روایت نے تمام سامعین کو بغیر کسی فرق اور امتیاز کے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔ کیسا صحت مند ماحول تھا۔ دونوں ملکوں کی سیاست میں اتار چڑھاؤ کے تماشے بار بار سامنے آئے لیکن گزشتہ زمانوں میں حالت جیسی بھی تھی آج سے تو بہر حال بہتر تھی۔

سانیال صاحب ایک بار لاہور جانا چاہتے تھے۔ لاہور کے مصور انھیں بلانا چاہتے تھے۔ ان

میں سانیال صاحب کے شاگرد بھی تھے اور ان کے لاہور کے زمانہ قیام کے کچھ دوست احباب بھی۔ افسوس کہ ایک معصوم سی خواہش دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ آج (۱۴ جنوری) کے اخبار نے خبر دی کہ ایک پاکستانی کرکٹ کھلاڑی پر اپنی حکومت کا عتاب صرف اس لیے نازل ہوا کہ جنوبی افریقہ کے سفر میں اس نے ایک شام کسی ہندوستانی فن کار کے ساتھ گزار لی تھی۔ یہ کیسی بے توفیقی اور کیسی گھٹا ٹوپ جہالت اور بدبختی ہے۔ آنے والے دن، اگر سیاست کے شکنجے سے کبھی آزاد ہو سکے اور مشترکہ تہذیب، تاریخ اور روایت کا سنہرا دور پھر سے شروع ہو سکا تو لوگ بھلا کیا کہیں گے اور ہمیں کن ناموں سے یاد کریں گے؟ سوچنے کی بات ہے! ہماری تہذیب، ہماری معیشت، ہماری مشترکہ تاریخ، ہمارے جغرافیے ہمارے انسانی جذبوں اور ضرورتوں، سب کا تقاضہ یہی ہے کہ اس دیوار کو گرنا چاہیے۔ کم سے کم ایک کھڑکی یا دروازہ تو اس دیوار میں کھلنا ہی چاہیے۔

ذاکر صاحب، اردو اور سیکولر ہندوستان

سابق صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے یوم پیدائش سے متعلق تقریبات کے دوران ۸ فروری ۲۰۰۳ کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے آڈیٹوریم میں ایک مذاکرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس موقع پر جہاں مسلمانوں کو درپیش بہت سے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسئلے زیر بحث آئے، وہیں اردو کے سوال پر بھی کچھ گفتگو ہوئی۔ اس جلسے میں صحافیوں، دانشوروں اور زبان و ادب کے علاوہ سماجی علوم کے ماہروں، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے اساتذہ اور میدان سیاست کی بعض معروف شخصیتوں پر مشتمل ایک نمائندہ تعداد موجود تھی۔ بس ایک رسم الخط کے سوال کو چھوڑ کر جس نے ذرا گرمی پیدا کی تھی، باقی تمام مسئلوں پر غیر جذباتی انداز میں گفتگو ہوئی اور اردو کے تحفظ اور ترویج کی منصوبہ بندی پر سنجیدگی کے ساتھ سوچ بچار ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے خوش آئند بات تو یہی ہے کہ اردو اور اردو کلچر کے بارے میں روایتی حلقوں سے ہٹ کر اب ایک ایسا محاذ بھی قائم کیا گیا ہے جس میں مختلف زبانوں، ثقافتوں اور مسلکوں سے تعلق رکھنے والے یکجا ہوئے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر یہ امید بندھتی ہے کہ اردو کے سوال کو صرف جذباتی سوال کے طور پر نہیں دیکھا جائے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے زمانے کی سیاست کا واحد سروکار، اقتدار حاصل کرنا یا اپنے حریفوں کو اقتدار سے بے دخل کرنا یا اگر چھین جھپٹ کر اقتدار حاصل کر لیا گیا ہے تو اسے ہر قیمت پر بچائے رکھنے سے زیادہ کچھ اور نہیں رہ گیا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں زبان، ادب، تعلیم، تہذیب، معاشرت اور ہمارے نظام اخلاق، اقدار کی جو درگت بنی ہے، سب پر ظاہر ہے۔ برسر اقتدار سیاست کا سب سے بڑا کارنامہ، بدقسمتی سے، یہی رہا ہے کہ اس نے تشدد، تعصب، بدنظمی، بدمذاقی، زور زبردستی، گنوارپن اور رجعت پسندی کو ہمارے اجتماعی ماحول میں ایک طرح کی جھوٹی عزت اور اعتبار کے درجے تک پہنچایا ہے۔ اصل میں کسی بھی حکومت کے

مزاج، مقاصد اور مصلحتوں کو جاننے کا سب سے موثر وسیلہ اس کے تعلیمی اور ثقافتی پروگرام اور پالیسیاں ہوتی ہیں۔ احیا پرست بلکہ فاشسٹ حکومتوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے تعلیم اور ثقافت کے شعبوں پر اپنا شکنجہ ہمیشہ مضبوط رکھا۔ اس وقت تفصیل میں جائے بغیر صرف اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم اور ریڈیو۔ ٹی وی کی عام کارکردگی کا ایک سرسری جائزہ کافی ہوگا۔ اردو اور اردو کلچر کا حال ہر جگہ پتلا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایک ذمے دار کارکن نے بتایا کہ ہندوستان بھر میں اردو کے پروگرام ایگزیکیٹیوز کی جگہیں (بیالیس سے زیادہ) یا تو خالی پڑی ہیں یا پھر اردو کا کام ایسے لوگ دیکھ رہے ہیں جو اردو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے۔ اردو مجلس، اردو سروس کے شعبوں میں کیسی رونق رہا کرتی تھی اور تمام بڑے ریڈیو اسٹیشنوں پر اردو کے معروف ادیبوں شاعروں کو کیسا نمایاں اعتبار اور قبولیت حاصل تھی۔ یہ سب گئے دنوں کا قصہ ہے۔ ٹی وی پر مذہبی سیریلز اور سنسکاروں کی باڑھ آئی ہوئی ہے۔ اردو کا چلن عام ہے مگر اسے اردو نہیں کہا جاتا ہے۔ صرف ETV (اردو چینل) کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ اردو پروگرام سمٹتے جا رہے ہیں۔ اب جہاں تک اردو زبان کی تعلیم کا تعلق ہے، تو جنوب کی چند ریاستوں، کشمیر اور مہاراشٹر کو چھوڑ کر، خصوصاً شمالی ہندوستان میں حالات خاصے حوصلہ شکن ہیں۔ بہار میں بظاہر صورت حال اتنی خراب نہیں۔ لیکن وہ ریاستیں جنھیں اردو کا علاقہ کہنا چاہیے، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، ہریانہ، راجستھان، دلّی، پنجاب، ہر جگہ اردو کو سانس لینے کے لیے بھی جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے ادارے اور اکیڈمیاں کبھی مجبوراً، کبھی مصلحتاً، کبھی ضرورتاً یہی کہتی رہتی ہیں کہ اردو کی ترقی ہو رہی ہے اور اردو کا مستقبل محفوظ ہے۔ اصل میں ترقی اردو کے بجائے کچھ نام نہاد اردو والوں کی تو ہو رہی ہے۔ لیکن حکومت کی مراعات کا حال بقول پروفیسر آل احمد سرور، صرف ایسا ہے گویا شاخوں کو پانی دیا جا رہا ہے اور جڑیں سوکھ رہی ہیں یا کاٹ دی گئی ہیں۔ جب تک ابتدائی اور ثانوی سطح پر حکومت دیانتداری کے ساتھ اردو کی تعلیم اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا انتظام نہیں کرتی۔ حالات اسی طرح بد سے بدتر ہوتے رہیں گے۔ معاصر انگریزی قومی روزنامے، ٹائمز آف انڈیا میں ڈاکٹر ذاکر حسین سوسائٹی کے سکریٹری اطہر فاروقی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اعداد و شمار کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ رفتہ رفتہ اردو کو اسکولوں اور دفتروں سے ہٹانے اور ختم کرنے کی ایک مہم جاری

ہے۔ اتر پردیش میں بہت سے اردو استاد رکھے گئے، بہوگنا اسکیم کے تحت۔ مگر ان میں اکثریت ایسوں کی ہے جو اردو لکھنے پڑھنے سے قاصر ہیں۔ شمالی ہند کی کئی یونیورسٹیاں جہاں اردو کے شعبے ہر حیثیت سے ممتاز تھے، اب بس سسک رہے ہیں۔ سرکاری سرپرستی کے تقریباً خاتمے نے اردو کی بقا کا راستہ بند کر دیا ہے۔ اندھیرے اور مایوسی کی اس فضا میں ایک خوش آئند پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔ اردو کے حقوق کی جنگ صرف اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کی جنگ نہیں ہے۔ یہ مورچہ مختلف علاقوں، زبانوں، گروہوں سے تعلق رکھنے والے کچھ ایسے لوگوں نے بھی سنبھال لیا ہے جو تشدد، منافرت اور فرقہ پرستی کے اس موسم جنوں میں ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری ڈھانچے کو بچائے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو یہ جانتے ہیں کہ اگر (بابری مسجد کی طرح) یہ ڈھانچہ ہی سلامت نہ رکھا جا سکا تو یہ ملک بھی بکھر جائے گا۔

۸ فروری کی شام کو ذاکر حسین سوسائٹی کی طرف سے منعقدہ مذاکرے میں اسی اندیشہ ناک صورت حال کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس شام، سوسائٹی کے اراکین اور اردو کے بہی خواہوں کا ایک وفد سلمان خورشید صاحب کی قیادت میں راشٹرپتی بھون بھی گیا اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ صدر محترم کی طرف سے جو جواب ملا، توقع کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے (بجا طور پر!) یہ تاکید کی کہ اردو پڑھنے والے بچوں کے والدین اور سرپرست بھی اپنی ذمے داری کو سمجھیں، بچوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، اور یہ کہ اردو والے اپنے اپنے علاقے میں اردو کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے والوں کا سروے کریں، پھر اعداد و شمار کی بنیاد پر اپنا مطالبہ متعلقہ عہدیداروں کے سامنے رکھیں۔ تلقین و موعظت کی اس گھڑی میں وفد کے ایک رکن کی طرف سے یہ آواز بھی اٹھی کہ حکومت دوسری زبانیں بولنے والوں سے تو یہ مطالبہ کبھی نہیں کرتی کہ وہ اپنے اردو خواں ہونے کا ثبوت اور اپنی تعداد کا حساب پیش کریں۔ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق جہاں، جس علاقے میں بھی اردو گھرانے اور اردو کو اپنی زبان کہنے والے آباد ہیں، بچوں کے لیے اردو میڈیم اسکول قائم کرنے اور اردو کی تعلیم کا بندوبست کرنا حکومت کی آئینی ذمے داری ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ۱۹۵۲ میں اردو تحریک کا بیڑا اٹھایا تھا اور حکومت کے سامنے کئی مطالبات رکھے تھے۔ بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ ان لوگوں کے لیے جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے

ہیں تعلیم کے نظام اور نصاب میں اردو کی جگہ محفوظ کر دینی چاہیے، ان کا سب سے اہم مطالبہ یہ تھا کہ شمالی ہندوستان میں اردو کے علاقے کی نشاندہی ضروری ہے تاکہ آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت، ایک علاقائی زبان کے طور پر اردو کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ ذاکر صاحب نے پچیس لاکھ افراد کے دستخطوں پر مشتمل ایک میمورنڈم بھی اس وقت کے صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ موجودہ حکومت (ایک خاص سطح پر) ماضی، ماضی، ماضی کی گردان کا شوق تو رکھتی ہے لیکن ایک روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے نہ تو ماضی کے کچھ بھولے ہوئے سبق دوہرانا چاہتی ہے نہ تاریخ کی بیلنس شیٹ میں اپنے قومی اور اجتماعی خساروں کا حساب دیکھنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ اردو ہمارا اجتماعی اور مشترکہ ماضی ہی نہیں، ہماری جمہوریت اور سیکولرازم کے مستقبل کا پیمانہ بھی ہے۔ یہ پیمانہ، خدانخواستہ ٹوٹ گیا تو باقی کیا رہ جائے گا:

بس سوچ لیجیے اور اداس ہو جائیے

جو ہم ادھر سے نہ گزریں گے کون دیکھے گا
دیویندر ستیارتھی اور جیلانی کامران کی یاد میں

مت جا، مت جا، مت جا جوگی!

دراز قامت، سفید لہراتی ہوئی داڑھی، لمبے بال، کرتے پاجامے اور لمبے کوٹ میں ملبوس، بغل میں کاغذوں کا ایک پلندہ یا کپڑے کا تھیلا۔ جوگیوں کی سی صورت، گرد و پیش کے ماحول سے لاتعلق اور بے پروا دیویندر ستیارتھی کو آپ کہیں بھی دیکھ سکتے تھے۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی، وہ دن نکلتے ہی گھر سے چل پڑتا تھا، پھر وہ ہوتا تھا اور دلی کی سڑکیں، نہ جانے کیسی بے چین روح تھی جسے کہیں قرار نہ تھا۔

اُن دنوں بلراج مین را کا ''شعور'' نکل رہا تھا۔ دریا گنج کے چائے گھر یا امبر ریستوراں میں سہ پہر کے قریب مین را پہنچ جاتا۔ پھر ادھر ادھر سے اس کے کچھ دوست احباب۔ ترا ہا بیرم خاں کے قریب اوپری منزل کے ایک کمرے میں مین را نے ''شعور'' کے دفتر کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ ہفتے میں ایک دو بار دیوندر ستیارتھی بھی ادھر آجاتے۔ یہ دور کم سے کم اردو کی حد تک، ستیارتھی کی تخلیقی تھکن یا خاموشی کا تھا، لیکن لکھنا پڑھنا، اپنی چیزیں چھپوانا انھوں نے بند نہیں کیا تھا۔ ہندی اور پنجابی میں ستیارتھی کی کہانیاں، ناول، مضامین، یادیں، یاترا ورتن، ان دنوں بھی چھپ رہے تھے۔ اردو والے یاد ضرور کرتے تھے کہ ہاں کبھی قلم رو ہند میں ایک لکھنے والا، لوک گیتوں کا شیدائی اور جنم جنم کا آوارہ گرد ادیب اس نام کا تھا۔

ستیارتھی کے سادھوؤں جیسے روپ رنگ، حلیے اور مزاج کا بس ایک ہی اردو ادیب زمانے کی آنکھ نے دیکھا۔ اس کی کتاب ''میں ہوں خانہ بدوش'' میں گرو دیو ٹیگور کے ساتھ

ستیارتھی کی ایک تصویر بھی شامل تھی۔ دونوں میں بلا کی مماثلت، اس فرق کے ساتھ کہ ٹیگور کے لمبے بال اور لہراتی ہوئی داڑھی برف کے گالے جیسی سفید، ستیارتھی کے بال دھوپ میں دن بھر راستے ناپنے کے باوجود بھی سیاہ تھے۔ روایت ہے کہ اس تصویر کو دیکھ کر پطرس نے ایک فقرہ چپکایا تھا: خضاب سے پہلے، خضاب کے بعد!

ستیارتھی کا شاید ہی کوئی شناسا اور دوست ایسا رہا ہو، جس نے اسے طنز تمسخر کا نشانہ یا موضوع نہ بنایا ہو۔ منٹو نے اسے فراڈ کہا تھا لیکن ستیارتھی نے ایسی شفاف، موہنی اور بھولی بھالی شخصیت پائی تھی کہ پلٹ کر کسی کو جواب دینے کا اسے خیال تک نہیں آیا۔ چاہے جتنا کاٹ دار فقرہ اس پر آزمایا جائے، جواب میں بس ایک بے ضرر، کچھ اداس اور بجھی ہوئی سی مسکراہٹ ستیارتھی کے ہونٹوں پر پھیل جاتی تھی۔ اپنے آپ سے ایسی لاتعلقی کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوگی۔

ستیارتھی کی اس ادا نے زندگی بھر اس کا ساتھ نبھایا۔ اس نے لگ بھگ چورانوے برس کی عمر پائی۔ یہ واقعہ ستیارتھی کی جوانی کا ہے جب گاندھی جی کی تحریک پر ستیارتھی اور اس کے ساتھ ہندی کے ایک معروف شاعر پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے آسام تک لوک گیت جمع کرنے کا ڈول ڈالا تھا۔ اس زمانے میں نہ تو آج کی جیسی سفر کی سہولتیں، نہ ریکارڈنگ کی آسانیاں۔ ستیارتھی کے لیے جم کر کہیں بیٹھ رہنا مزاجاً ممکن نہیں تھا۔ لوک گیتوں کے پھیر میں آٹھوں پہر کی آوارہ گردی کو ایک بہانہ مل گیا۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک روز ستیارتھی کچھ سبزی ترکاری خریدنے کے لیے گھر سے نکلا تو پھر مہینوں بعد واپس آیا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کی پتنی نے اڑتی پڑتی ایک خبر سن کر کہ ستیارتھی مغربی پنجاب (پاکستان) کے کسی گاؤں میں دیکھے گئے ہیں، پاکستانی صدر کو اپنی بپتا لکھ بھیجی۔ صدر موصوف نے ستیارتھی کی تلاش کا پروانہ جاری کیا اور ڈھونڈ ڈھانڈ کر ستیارتھی کو جیل پہنچانے کے بجائے پاکستانی پولس نے واگھہ کی سرحد کے اس طرف ہندوستان میں ڈھکیل دیا۔

لوک گیتوں کو جمع کرنے میں ستیارتھی کا انہماک ایک مقدس کارجنوں کا انداز رکھتا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ ستیارتھی نے ڈیڑھ لاکھ سے تین یا چار لاکھ تک گیت جمع کیے۔ ان کی پوتھیاں اپنے قلم سے مرتب کرتا رہا، اس کا بس برائے نام حصہ اردو میں شائع ہوا۔ اس سے کچھ زیادہ ہندی میں۔ یہ متاع بے بہا، ستیارتھی کی یادوں کی طرح اس کے گھر کی دیواروں میں محفوظ ہے۔ اس

عظیم الشان کارنامے کے ساتھ کسی مہذب معاشرے میں ستیارتھی نے سانس لی ہوتی تو آج قومی سطح پر اس کا سوگ منایا جاتا۔ اس کی یادگار قائم کی جاتی، اس کی عمر بھر کی ریاضت اور محنت کا پھل دنیا کی نظروں سے اس طرح چھپا نہ رہتا۔ لیکن یہاں تو قصہ یہ رہا کہ ستیارتھی کی موت کی خبر بھی دیکھنے میں نہ آئی۔ قومی اخبارات جو بے ڈھنگے اور بے کردار سیاست دانوں کی سالگرہ، بیماری، دھاندلی کی خبروں سے اٹے رہتے ہیں، ستیارتھی کی طرف سے بے نیازانہ گزر گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کہیں کوئی تعزیتی جلسہ بھی ہوا یا نہیں۔ بقول مجید امجد:

جو ہم ادھر سے گزرتے ہیں کون دیکھتا ہے
جو ہم ادھر سے نہ گزریں گے کون دیکھے گا!

ہوا نے دی ہے خبر رات کے گزرنے کی

لاہور سے کسی نے ای میل پر چودھری محمد نعیم کو یہ اطلاع دی کہ جیلانی کامران بھی زندگی کی آخری رات گزار کے اس خراب آباد سے رخصت ہوئے۔ایک اچھے انسان سے دنیا خالی ہوگئی۔اردو کی نئی شاعری، نئی تنقید، نئی حسیت کو فروغ دینے والوں میں جیلانی کامران کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

اب تو خیر راستہ دشوارتر ہوگیا ہے، لیکن دس بارہ برس پہلے دو مرتبہ جب لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو جیلانی کامران سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔انتظار حسین اور کشور ناہید کے گھر پر، یا شیزان میں جہاں لاہور کے بہت سے اردو ادیب جمع ہو گئے تھے، یا پھر پاک ٹی ہاؤس میں جہاں دن بھر لکھنے والوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔زاہد ڈار، انتظار حسین، انور سجاد، انیس ناگی کے ساتھ ایک دو بار جیلانی کامران سے بھی ملنا ہوا۔وہ ایک شرمیلے، کم سخن، نرم آثار اور ہجوم میں بھی اپنی تنہائی کی حفاظت کرنے والے انسان تھے۔ایک زمانے میں جیلانی کامران نے افسانے بھی لکھے تھے، مگر کچھ عرصہ بعد شاعری اور تنقید کے ہو رہے۔اردو کے "نئے" لکھنے والوں میں وہ اس حیثیت سے ممتاز تھے کہ ایک تو انھوں نے مشرق و مغرب کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ بہت گہرائی کے ساتھ کیا تھا، پھر مشرق کے تخلیقی اور فکری میلانات کے تو وہ عاشق ہی نہیں عارف بھی تھے۔ انگریزی، اردو، دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔منصور حلاج کی کتاب الطواسین کا جیلانی کامران نے انگریزی میں جو غیر معمولی ترجمہ کیا ہے وہ بجائے خود ایک تخلیقی شان رکھتا ہے۔

مشرقی علوم اور ادبیات خصوصاً مشرق کے متصوفانہ ادب اور وارث شاہ، بلھے شاہ، حسین شاہ کی قائم کردہ لوک روایت کا انھوں نے بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے۔نئی حسیت کی تفسیر و تعبیر کے سلسلے میں جیلانی کامران کی تحریریں الگ سے پہچانی جاتی ہیں۔ پاکستان کی تہذیب اور ایک علیحدہ فکری روایت کے ضمن میں جیلانی کامران کے مقدمات سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اس

حقیقت کا اعتراف ہر حلقے میں کیا جائے گا کہ ان کی جیسی دانشورانہ بصیرت اور ادب کو عبادت کا درجہ دینے والے ادیب ہمارے زمانے میں خال خال ہی نظر آئیں گے۔ جیلانی کامران نے غالب کی تخلیقی شخصیت کا جائزہ بہت وسیع اور پر پیچ فکری تناظر کے ساتھ لیا ہے۔ وہ ادب کو کسی معاشرے کی تہذیبی زندگی سے تعلق رکھنے والی مجموعی سرگرمی کا حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کی نثری تحریروں میں تاریخ اور تہذیب کے ادراک کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ اپنے مقدمات پر وہ سختی سے قائم رہتے تھے، مگر ان کی طبیعت میں ایک دلآویز نرمی اور مخاطب کو زیر کر لینے والی سادگی تھی۔ وہ اپنی باتیں ہمیشہ دھیمے، دوستانہ اور بہت رچے ہوئے لہجے میں کہتے تھے۔ نئے لکھنے والوں سے جیلانی کامران کو شکایت یہ تھی کہ وہ دور کی کوڑیاں لانے کے پھیر میں مغربی کلچر اور روایت کے ریگزاروں میں تو بھٹکتے پھرتے ہیں، مگر اپنی تاریخ اور اپنے اجتماعی ماضی کے آئینے میں اپنی حقیقت کا اتا پتہ ڈھونڈنے کی جستجو نہیں کرتے۔ اپنے تہذیبی تشخص کی تلاش اور تعمیر جیلانی کامران کے بنیادی سروکاروں میں سے ایک تھی۔ اس شغف کا اظہار ان کی نثری تحریروں سے زیادہ مستحکم اور پرکشش طریقے سے جیلانی کامران کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کے شعری مجموعے استانزے کی اشاعت کو آج بھی اردو کی نئی شاعری کے پس منظر میں ایک ہمیشہ باقی رہنے والے یادگار واقعے کا نام دیا جاتا ہے۔

جیلانی کامران براہ راست بیان کے شاعر نہیں تھے، یہاں تک کہ ان کی طویل سے طویل نظم میں بھی رمزیت، ایجاز اور تحیر کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ وہ ایک طلسماتی رنگ اور آہنگ کی مدد سے اپنی نظموں کو تصویروں اور شبیہوں کا تاثر عطا کرنے پر قادر تھے۔ ان کے شعر کی داخلی بنت کے ساتھ ساتھ اس کی خارجی، لسانی ہیئت کی تعمیر کا سلیقہ بھی انہی سے مخصوص ہے۔ خوش آہنگی اور بہاؤ کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں نئی علامتیں وضع کرنے کی ایک فطری اور بے ساختہ صلاحیت کا اظہار بھی ہوا ہے:

کبھی اگر تم زمیں سے گزرو، زمیں جو ہم سب کی سلطنت ہے
تو جس طرف اک کلی کے مہرے پہ چاندنی اپنا نام خود ہے،
وہاں ذرا دیر کے لیے اپنی عمر کی رفت و بود رو کو
زمیں کو لمحوں کی بادشاہت میں دیکھنا ہو

تو اس طریقے سے آرزوؤں کے ساتھ دیکھو
کہ جس طرح لوگ اپنے محبوب کے بدن کو
وصال کے وقت دیکھتے ہیں
میں کچھ نہیں، اپنے گیت کا، اپنی موت کا نامہ بر ہوں!

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا

(الف لیلہ کے شہر کی سب سے ہولناک رات)

بغداد کی راتوں میں آج بھی شہرزاد کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ایک چوراہے پر مرجینا اور اس کے گرد پھیلی ہوئی ایک کہانی کے کرداروں، علی بابا چالیس چور کے مجسمے نصب ہیں۔بغداد کے مضافات میں ایک جگہ حضرت جنید بغدادی، حضرت معروف کرخی، حضرت ابراہیم بن خواص کی ابدی آرام گاہوں سے ملحق قبرستان میں خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کی قبر دکھائی دی۔ہم وہاں تک ہندوستانی سفارت خانے کے سب سے پرانے کارکن صالح رمضان رضا کی رہنمائی میں پہنچے تھے۔صالح رمضان کردہیں اور ابھی تک ہندوستانی سفارت خانے سے وابستہ ہیں، پچھلے دنوں جنگ کے دوران زی ٹی وی پر ان کا ایک انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا گیا تھا، بغداد کی فضا آج بھی طلسماتی اور پر اسرار ہے۔یہ عجیب شہر ہے، ایک ساتھ کئی زمانوں میں سانس لیتا ہوا۔

چنگیز خان کے پوتے ہلاکو نے ۱۲۵۸ء میں اس شہر پر قیامت ڈھائی تھی۔مورخ گبن کا بیان ہے کہ بغداد کی سڑکوں پر تین روز تک خون بہتا رہا۔دجلہ کا رنگ لال ہو گیا تھا۔کوئی سولہ لاکھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔اسلامی تاریخ کا سب سے قیمتی ذخیرہ لوٹ لیا گیا۔عباسی خلفا کے سنہرے دور کی تمام یادگاریں مسمار کر دی گئیں۔کتب خانے اجاڑ دیے گئے، نوادر لٹیروں کی نذر ہوئے۔بغداد کی عظمت اور تاریخ کو مٹانے کی یہ پہلی منصوبہ بند کوشش تھی۔اب کے اس کوشش میں امریکی، برطانوی فوجیوں اور امریکی حکومت کے زرخرید صحافیوں نے بھی حسب توفیق حصہ لیا۔

ابھی چند روز قبل زمانے کی آنکھ نے اس شہر پر جو کچھ گزرتے دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ ہولناک ہے۔ ہلاکو کے ساتھ اب جارج بش اور بلیئر بقول ارندھتی رائے "The Bully and the Boughts" کے چہرے بھی نظر آتے ہیں۔ ''اتحادی افواج'' (جو دراصل تاریخ کے انہی دو مجرموں کا اتحاد ہے) کی موجودگی میں دس ہزار برسوں کی تاریخ کا اثاثہ دیکھتے دیکھتے برباد ہو گیا۔ کتب خانوں کو آگ لگا دی گئی۔ ان میں قرآن حکیم کا سب سے قیمتی اور قدیم نسخہ بھی تھا۔ ایک طرف ہزاروں سال کی شاندار تاریخ کا سرمایہ تھا، دوسری طرف جارج بش اور بلیئر کی فوجوں کا اندھا عتاب اور اڑتالیس گھنٹوں کی زبردست لوٹ مار، عراقیوں سے ان کا ماضی، ان کی تاریخ، ان کا حافظہ چھینا جا رہا تھا۔

ایک جاتک کہانی کے مطابق، ہوا، پانی اور غذا کے بغیر انسان چاہے کچھ دیر رہ لے، لیکن حافظہ چھن جائے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔ بش اور بلیئر پٹرول کے ذخیروں سے پہلے ایک عظیم الشان تہذیب کے تمام سرمائے کی تباہی کے درپے ہیں۔ عراقیوں کی Brain Washing کا سلسلہ جاری ہے، جھوٹی خبریں بھی اسی شدومد کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ انگلستان کا کوئی میوزیم بغداد کی لوٹ کا کوئی مال نہیں خریدے گا! گویا کہ ہم ایک تہذیب کی بربادی کے محرک تو ہو سکتے ہیں، لیکن اپنی پارسائی کا بھرم بھی بنائے رکھیں گے۔ ویسے تو یہ بات عام ہے کہ تاریخی نوادر کا مال سب سے پہلے اسی ملک کے بازاروں میں پہنچتا ہے۔ اس ملک کے میوزیم دنیا بھر سے غائب کیے گئے نوادر اور آرٹ کے شاہکار نمونوں سے بھرے پڑے ہیں۔ آثار قدیمہ کے عراقی ماہروں، سماجی مفکروں اور دانشوروں کا خیال ہے کہ ''اتحادی'' افواج نے جان بوجھ کر غارت گری اور لوٹ مار کے اس کھیل کو ہوا دی ہے۔ ڈونالڈ رمسفیلڈ جو ایک سابق پہلوان ہیں اور جن کی اسکیم کے مطابق اس جارحیت کا پورا خاکہ مرتب اور نافذ کیا گیا تھا، بغداد کے نیشنل میوزیم اور کتب خانوں کی بربادی پر موصوف نے بس اتنا کہا کہ ''اس میں کون سی نئی بات ہے، یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔'' تاریخ اور تہذیب کے مجرموں کا ذہن اسی طرح کام کرتا ہے۔ گجرات کے پچھلے فسادات پر ہم اپنے

ایک ضمیر فروش سوشلسٹ وزیر (جارج فرنانڈس) سے بھی یہ جملہ سن چکے ہیں کہ "اس فساد کے دوران بھلا ایسی کون سی نئی بات ہوئی ہے!"

''اتحادی''افواج نے عراق پر اس غاصبانہ قبضے کے خلاف احتجاج کرتی ہوئی ایک پر امن اور نہتی بھیڑ پر گولی چلا دی۔ نتیجے میں دس شہری شہید ہو گئے۔''بش کے بچے'' جارج بش کا خیال ہے کہ امن قائم کرنے کے لیے ان کے فوجیوں کو کچھ سختی تو کرنی ہی پڑے گی۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ نصیریہ میں اتحادی افواج اور''صدام مخالف، حریت پسند'' عراقیوں کی ایک ملی جلی بیٹھک میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب مل جل کر عراق کی تعمیر نو کا کام بھی کرنا ہوگا۔ روایت ہے کہ نادر شاہی افواج نے جب دلی کے بے گناہ شہریوں کو جی بھر کے تہہ تیغ کر لیا اور نادر شاہ اس اجڑی ہوئی بستی کے دورے پر نکلے تو راستے میں ایک نوزائیدہ بچے پر نظر پڑی۔ نادر شاہ نے گھوڑے کی لگام کھینچی، انھیں ڈر تھا کہ بچہ کہیں کچل نہ جائے۔ چنانچہ نیزے کی انی اس کے سینے میں اتار دی اور اس بچے کو اچک کر سڑک کے کنارے پھینک دیا۔ یہ ایک جابر کا رحم تھا۔ کویت کے ایک اسپتال میں اب اس عراقی بچے''علی'' کی جان بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے ماں، باپ، بھائی سب کے سب امریکی بم باری کی نذر ہو گئے اور اس بچے کے دونوں ہاتھ ضائع ہو چکے ہیں۔ برطانوی امریکی فوجی اور کویتی ڈاکٹر اس بچے سے اب آنکھ ملاتے گھبراتے ہیں۔

ارندھتی رائے نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے:

''آپریشن عراقی آزادی؟ میں تو ایسا نہیں سوچتی۔ یہ کارروائی تو کچھ اس قسم کی ہے کہ آؤ ذرا دوڑ لگائیں (اور دیکھیں کہ کون جیتتا ہے) مگر پہلے میں تمھارے گھٹنے توڑ دوں!'' بغداد پر سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بم گرانے کے بعد، جب ایک بازار کو''سہواً''اڑا دیا گیا اور شہری مارے گئے تو امریکی افواج کے ایک ترجمان نے کہا کہ''یہ تو خود عراقی ہیں جو اپنے آپ کو اڑا رہے ہیں۔ وہ

پرانی، فرسودہ میزائلیں داغ رہے ہیں۔ یہ میزائلیں اوپر جاتی ہیں پھر (انہی کے سروں) پر نیچے گر پڑتی ہیں!"

❖

مصری نژاد دانشور سمیر امین تھرڈ ورلڈ فورم کے ڈائرکٹر ہیں۔ ابھی حال میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے۔ (فرنٹ لائن، ۲۵ اپریل ۲۰۰۳ء) ان کا خیال ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عراق میں اب ویت نام کی جیسی صورت حال سے دو چار ہوں گے۔ جہاں تہاں سے اس انٹرویو کی کچھ باتیں:

"یہ جنگ صرف تیل کے لیے نہیں ہے۔ اس کا مقصد مغربی ایشیا پر اقتدار قائم کرنا ہے، اس علاقے کی جغرافیائی اور فوجی اہمیت کے باعث۔ یہ علاقہ افریقہ، ایشیا اور یورپ سے تقریباً یکساں دوری پر ہے۔ بغداد سے لندن، جوہانسبرگ اور بیجنگ کا فاصلہ کم و بیش برابر کا ہے۔ اس علاقے پر تسلط قائم کر لینے سے امریکہ کو ساری دنیا پر قابو پانے میں آسانی ہوگی۔ خاص طور سے چین، ہندوستان اور روس پر۔ امریکہ کا وژن (مستقبل کا خاکہ) یہی ہے اور وہ لوگ جو اس وقت وہاں برسرِ اقتدار ہیں، خاصے دوٹوک انداز میں اس منصوبے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس وقت واشنگٹن میں ایک فوجی ٹولے کا قبضہ ہے۔ ایک (جعلی اور) مشکوک الیکشن کے ذریعے اس گروہ نے اقتدار حاصل کیا ہے۔

امریکی جارحیت کے خلاف احتجاج کے معاملے میں ہندوستان نے ذرا کمزور موقف جو اختیار کیا تو شاید اس لیے کہ خود ہندوستان اس وقت ایک بہت بڑے خطرے سے دو چار ہے۔ ہندوتو (Hindutva) کا خطرہ! بہر حال اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں اس جارحیت کی مخالفت نہیں ہوئی۔ مغربی ایشیا کے معاشروں میں اس وقت ایک ابال آیا ہوا ہے اور اس علاقے کی حکومتیں اپنا قانونی جواز کھوتی جا رہی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، لیکن ایک بات صاف ہے، عراقی عوام پر بمباری کے بدصورت وسائل کے استعمال کا امریکی منصوبہ یہ تو نہیں کہ یہاں (اس علاقے میں) جمہوریت قائم کر دی جائے۔ اس منصوبے کا مقصد موجودہ نظام کے

متبادل کے طور پر ایک اور طرح کی آمریت کا قیام ہے۔ صرف عراق میں ہی نہیں بلکہ اس علاقے کے تمام عرب اور غیر عرب ملکوں میں!

فرانس کے وزیر خارجہ نے امریکہ کو خبردار کیا تھا کہ اس جنگ کا نتیجہ وہ نہیں ہوگا جو امریکی سمجھتے ہیں، بلکہ انتشار بڑھتا ہی جائے گا۔ اس کی بات درست تھی۔ امریکی جنگی ٹولے کے احمقوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ امریکی جارحیت کے خلاف عراقیوں کی مزاحمت رفتہ رفتہ مضبوط تر ہوتی جائے گی۔ دنیا بھر میں عوام کی رائے یقینی طور پر اس حملے کی مخالف ہے۔ افریقہ کے نوے فیصد سے زیادہ لوگ اس بہیمانہ جنگ کے خلاف ہیں۔ امریکہ بتدریج باقی دنیا سے الگ تھلگ پڑتا جائے گا۔ اس لحاظ سے امریکی جنگی ٹولہ عالمی رائے عامہ کے ہاتھوں پہلے ہی ایک سیاسی شکست سے دوچار ہو چکا ہے۔ عراقی عوام کی حمایت اور احتجاج کا سلسلہ بڑھتا جائے گا۔ یہ صورت حال اس علاقے (مغربی ایشیا) کی ریاستوں کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کرے گی۔ پورے علاقے میں رائے عامہ امریکہ کے اور زیادہ خلاف ہوتی جائے گی۔

عرب دنیا ایک (اور متحد) نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک فلسطین کے مسئلے پر ان ممالک کے رویے کا تعلق ہے، تو یہ سب ایک ہیں۔ پوری عرب دنیا میں اب زیادہ سے زیادہ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسرائیل کے لیے امریکہ کی حمایت غیر مشروط ہے اور مکمل ہے۔ یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ امریکی جنگی ٹولہ ایک احمقانہ، غیر ذمے دارانہ، خطرناک اور مجرمانہ وژن کا حامل ہے۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

یہ جنگ عراق پر قبضے کے ساتھ ختم نہیں ہوگی۔ عراق کے پاس گوریلا جنگ کی ایک روایت رہی ہے۔ وہ حوصلہ مند اور جری عوام کی تاریخ رکھتے ہیں۔ وہ موت سے ڈرتے نہیں!

یہ کیسا دلدوز موسم خزاں ہے
کہیں پہ خاک اڑائی کہیں پہ پھول کھلائے

جنگ کی تباہ کاری کا منظر چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ عمارتیں جو کھنڈر بن گئیں، فصیلیں جو تباہ ہو گئیں، بصرہ آیل ریفائنری کے باقی ماندہ نشانات، لیکن عراقیوں نے ''فتح'' کی یادگار قائم کر لی ہے۔ دریا کے اس طرف ایران ہے، ادھر عراق کی سرزمین، جا بجا صدام حسین کی تصویریں، کٹ آؤٹس، روایتی انداز کی پرانی عمارتوں کی جگہ نئی تعمیرات نے لے لی ہے۔ شط العرب کے کنارے شہیدوں کے مجسمے نصب کر دیے گئے ہیں۔ جگہ جگہ بینرز پر عربوں کے اشعار لکھے ہوئے ہیں:

ہم ماضی کے گیت گاتے ہیں
ہمارے بول مستقبل کے لیے ہیں

قصر المؤتمرات میں ابھی ذرا دیر پہلے شاعر عبدالرزاق بڑے پرجوش لہجے میں خطیبانہ شان کے ساتھ اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔

پیغمبر عربوں میں پیدا ہوئے۔
ماضی ہمارا ہے۔ ایک شاندار، روشن ماضی۔
مستقبل بھی ہمارا ہوگا!

یہ خواب نہیں۔ روداد ہے نومبر ۱۹۸۹ء میں بغداد کے ایک سفر کی جہاں اس عروس البلاد کے تمام پانچ ستارہ ہوٹل غیر ملکی مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس بین الاقوامی علمی، ادبی تقریب میں شرکت کے لیے یورپ کے مختلف ملکوں سے، خلیجی ریاستوں سے، ایشیا اور افریقہ

سے۔ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور دانشوروں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ قاہرہ، دمشق، اشبیلیہ، غرناطہ، استنبول، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور، دلّی کی طرح یہ شہروں کا شہر بغداد بھی ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک پائیدار نقش بن چکا ہے۔ اس شہر کی رونقیں، بازار، شاہراہیں، گلیاں، محلے، رہائشی بستیاں، یہاں تک کہ قبرستان بھی جہاں نامی گرامی شعرا، صوفیا، علما اور مشاہیر محوِ خواب ہیں۔ اس شہر کے ثقافتی مراکز اور ادارے اور پاس سے آنے والے سیاحوں کو اپنے شکوہ اور عظمت و جلال سے تھوڑی دیر کے لیے مبہوت کر دیتے ہیں۔ حمورابی کے شہر بابل کی ہزاروں برس پرانی سڑک سے گزرتے ہوئے، جس سے کبھی شاہانہ جلوس گزرا کرتے تھے اور جس کے چاروں طرف ایک عظیم الشان تہذیب کے آثار بکھرے ہوئے ہیں، میں نے یورپ اور مغرب کے دوسرے علاقوں سے آنے والے ہر مندوب کی آنکھوں میں ایک رشک آمیز حیرت اور تحسین کے نشانات دیکھے۔ ایران اور عراق کا تہذیبی ماضی جس کے سلسلے ہزاروں برس پر پھیلے ہوئے ہیں (دنیا کی سب سے پرانی تہذیبوں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے) آج بھی انتہائی ہولناک آزمائشوں سے گزرنے کے باوجود اپنے پورے وقار اور تمکنت کے ساتھ زندہ ہے۔ عراقی ایک خودسر اور مغرور قوم ہیں۔ اور اس وقت طاقت کے نشے میں چور، ایک کوتاہ اندیش اور بدحواس امریکی قیادت نے انسان کشی اور بربریت کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس کے خلاف عراقیوں کا سب سے بڑا اسلحہ اپنی قومی غیرت اور حمیت کا احساس ہے۔ ایک بظاہر کمزور اور محدود وسائل رکھنے والے ملک کا یہ افتخار کسی نو دولتی تہذیب کا پرچم اٹھانے والے شخص کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسی لیے اجتماعی دیوانگی اور بربادی کا یہ تماشا ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ تو کیا عراقیوں کو چپ چاپ سب کچھ جھیلتے رہنا چاہئے اور دنیا کو چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے رہنا چاہیے۔ لیکن آج کی یونی پولر دنیا میں امریکہ کے علاوہ بھی ایک بڑی طاقت موجود ہے، رائے عامہ کی طاقت جو اس عہد کے اجتماعی ضمیر کی طاقت کا دوسرا نام ہے اور اس طاقت نے جارج بش اور ٹونی بلیئر کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ دونوں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے ہیں، ان کی اس تنہائی کا انجام؟ تاریخ کے کوڑے دان میں ہمیشہ کا قیام اور ایک متاعِ دشنام یا اور کچھ۔ خدایا! یہ رسی کب تک یونہی دراز ہوتی رہے گی۔

افتخار جالب

ان دنوں موت کی جھڑی سی لگی ہوئی ہے، سریندر پرکاش، جون ایلیا، دیویندر ستیارتھی، جیلانی کامران۔ ابھی یہ زخم ہرے تھے کہ کراچی سے افتخار جالب، لاہور سے بیگم ایلیس فیض اور علی گڑھ سے اسعد بدایونی کے انتقال کی خبر ملی۔

کوئی سال بھر پہلے، افتخار جالب نے اپنی نثر و نظم کی مشترکہ کتاب "لسانی تشکیلات اور قدیم بنجر"، مجھے کنگسٹن (امریکہ) سے بھجوائی تھی۔ کیسی بدبختی ہے کہ کراچی کے ایک باسی سے رابطے کا راستہ بھی امریکہ سے ہوکر گزرتا ہے۔ ہندو پاک سرحد کے دونوں طرف براہ راست آمد و رفت کا راستہ بند ہے۔ شمس الرحمن فاروقی سے معلوم ہوا کہ افتخار جالب اپنی بیمار بیٹی کے علاج کے لیے لاہور گئے ہوئے تھے۔ یہ علاج عمران خان کے قائم کردہ شوکت خانم کینسر ہاسپٹل میں ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ بیٹی صحت یاب ہوتی، افتخار جالب پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اس کی تاب نہ لا سکے۔ کیسی زندہ، توانا اور طباع علمی ادبی شخصیت یوں دیکھتے دیکھتے چل بسی۔ افتخار جالب بڑے ذی علم انسان تھے، ان کے مضمون "لسانی تشکیلات" نے اردو میں ایک نئے تنقیدی تصور اور ضابطے کی داغ بیل ڈالی لیکن افتخار جالب صرف خالی خولی اصول اور تھیوری کے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے ادب کی تعبیر و تفہیم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا، اسے برتنے کی طاقت بھی رکھتے تھے۔ منٹو کے افسانے "پھندنے" اور انور سجاد کے مجموعے "استعارے" کا تجزیہ انھوں نے غیر معمولی ذہانت اور گہرائی کے ساتھ کیا ہے۔ زمانہ ساز اور بے تہہ ادیبوں کے برعکس، افتخار جالب مزاجاً گوشہ نشین تھے، ادبی جلسوں اور ہنگاموں سے تقریباً لاتعلق۔ البتہ نئے لکھنے والوں میں ان کی دلچسپی کبھی ختم نہ ہوئی۔ افضال احمد سید، ذی شان ساحل، اجمل کمال، آصف فرخی، عذرا عباس اور کراچی کے نسبتاً نئے ادیبوں کے لیے افتخار جالب ہمیشہ توجہ کا مرکز بنے رہے۔ وہ ایک صحت مند اور روشن دماغ رکھتے تھے۔ جبر کسی بھی طرح کا ہو، نظریاتی، سیاسی، ثقافتی؛ افتخار جالب کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مصلحت کوش زمانے میں افتخار جالب کا شمار ہم ذہن اور ضمیر کی آزادی کے سب سے کھرے اور سچے ترجمانوں میں کر سکتے ہیں۔ اب ان کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ افتخار جالب کی نئی کتاب سے ایک نظم کا ابتدائیہ حسب ذیل ہے۔ نظم کا عنوان ہے "زیست کا کوڑا ملبہ"۔

اے خوش بخت کہ امریکا نے
آداب سفارت کی بحالی کا ارادہ باندھا
ویت نام ایک نئے دور میں داخل ہوگا
صنعت وحرفت و کلچر کی فراوانی میں
کوئی قلت ہے، تو بس اتنی کہ
الفاظ کی ناداری ہے!

بیگم ایلس فیض

بیگم ایلس فیض، ہمارے فیض صاحب کی نصف بہتر تھیں۔ کئی لحاظ سے اپنے نامور اور مقبول خاص و عام شوہر کے وجود کی تکمیل۔ فیض احمد فیض جن دنوں راولپنڈی سازش کیس کے تحت جیل میں تھے، بیگم ایلس فیض نے اپنی بیٹیوں سلیمہ اور منیزہ کے لیے بیک وقت شفیق ماں اور ذمے دار باپ کا رول ادا کیا۔ فیض صاحب نے ان کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا: ''ان بیٹیوں کو تم سے بہتر ماں نہیں مل سکتی تھی۔'' فیض کے خطوطِ زنداں کا ایک مجموعہ ''گڑی ہیں کتنی صلیبیں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ چودھری محمد نعیم ادھر فیض اور ایلس کے خطوط انگریزی میں منتقل کر رہے تھے۔ یہ ترجمہ بیگم ایلس فیض کی نظر سے گزرنے کے بعد شائع ہونا تھا۔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد ہمارے سب سے معروف اور محبوب شاعر کی یہ تحریریں جدید دور کی ادبی تاریخ کا ایک علیحدہ باب ہیں۔ اس کا کچھ بیان بیگم ایلس نے فیض کی شخصیت پر اپنے یادگار مضمون میں بھی کیا ہے۔

فیض صاحب نے زندگی کا خاصا حصہ جلاوطنی میں گزارا۔ ان کی نظم ''مرے دل مرے مسافر'' جلاوطنی کے اسی دور کی یادگار ہے۔ تقریباً پندرہ برس پہلے کی ایک شام کو، اس نظم کے واسطے سے اداسی کا ایک تکلیف دہ تجربہ سامنے آیا۔ ہوا یہ کہ وہ عید الفطر کی شام تھی اور ہم لاہور میں بیگم فیض کے مہمان تھے۔ فیض صاحب کی بڑی بیٹی سلیمہ ہاشمی نے اس نظم کی بنیاد پر کچھ سلائڈس تیار کی تھیں، جن سے ایک چھوٹی سی دستاویزی فلم مرتب ہوگئی تھی۔ پس منظر میں ٹینا ثانی کی طلسمی آواز میں فیض صاحب کی نظم ''مرے دل مرے مسافر'' کے بول تھے۔ کھانے کے بعد ہم یہ فلم دیکھ رہے

تھے کہ ایک سسکی کی آواز ابھری، اچانک ہم سب بیگم فیض کی طرف دیکھنے لگے جن کا چہرہ اپنے جذبات کا ضبط قائم رکھنے کی کوشش میں تمتما اٹھا تھا اور ان کے آنسو چھلک پڑے تھے:

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا

ان کا دل فیض صاحب کے ساتھ اس دور کی یادوں سے بھر گیا تھا جو وطن سے دور اجنبی دیاروں میں بے یقینی اور افسردگی کی ایک مستقل کیفیت کے ساتھ گزرا تھا۔ بیگم ایلس کا تعلق مغرب کے ایک سفید فام خاندان سے تھا، مگر ان کی روح یکسر مشرقی تھی، وہی حیاداری، درد مندی، ایثار اور قناعت پسندی جس سے ہماری روایتی خواتین کی پہچان ہوتی ہے۔ فیض صاحب کی تخلیقی اور ذہنی زندگی میں بھی بیگم ایلس کی حیثیت ایک سچے رفیق کی تھی۔ انھوں نے فیض صاحب کے مسودے، ان کی چیزیں، یادیں بہت سلیقے کے ساتھ سنبھال رکھی تھیں، ان کے جانے سے بہت کچھ کھو سا گیا ہے۔

اسعد بدایونی

اسعد بدایونی کی جواں مرگی کا غم مدتوں باقی رہے گا۔ نئی غزل کے شاعروں میں اسعد بدایونی کی آواز الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ کلاسیکی دروبست کے ساتھ ایک نئی حسیت کا اظہار اسعد بدایونی کی غزل کا انفرادی رنگ تھا۔ انھوں نے داستانوں اور قصص سے ماخوذ علامتوں، پیکروں اور استعاروں کی مدد سے غزل کا ایک نیا محاورہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کی آواز میں توانائی، خودسری اور ایک شائستہ برہمی کی کیفیت ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ ایک زمانے نے ان کی آواز غور سے سنی اور انھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا، مگر اسعد نے خود اپنے ساتھ انصاف نہیں کیا، علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستگی بھی ان کی لاپروا اور بوہیمین زندگی کو سنبھالا نہ دے سکی۔ صحت کی طرف سے بہت بے نیاز تھے اور اب تو ان کی ناوقت موت کے بعد یہی احساس

ہوتا ہے کہ اسعد بدایونی نے زندہ رہنے کی جد و جہد کے بجائے ایک مستقل مشق فنا کے ساتھ اپنے شب و روز بسر کیے، یہاں تک کہ ان کے اعصاب نے جواب دے دیا۔ نئے شب خون میں ان کی چار غزلیں چھپی ہیں، ہر ایک کی ردیف میں ایک مرکزی استعارے پھول کی تکرار:

بدن میں شور مچا پھر لہو میں پھول کھلا
کھلا سکے تو کسی دشت ہو میں پھول کھلا
ہے اس جہاں سے گزرنے کے بعد لامحدود
ابھی تو صرف یہاں چار سو میں پھول کھلا

ہم اہل دل تھے سو تیری زمیں پہ پھول کھلائے
جہاں جہاں بھی گئے ہم وہیں پہ پھول کھلائے
قلندراں تو عجب ہیں نہ ان کی پوچھو کچھ
کہیں پہ خاک اڑائی کہیں پہ پھول کھلائے

جو آرزو ہے کہ سارے جہاں میں پھول کھلیں
سوال پھر بھی ہے کیسے خزاں میں پھول کھلیں
یہ کائنات تری خوشبوؤں سے بھر جائے
یقیں میں پھول کھلیں یا گماں میں پھول کھلیں

نہ اک خیال نہ اک مرحلے میں پھول کھلائیں
زمین عشق پہ ہر زاویے میں پھول کھلائیں
جو لوگ سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھے
اب ان کی خاک سے کس مقبرے میں پھول کھلائیں

موت اور محرومی کی اس فصل میں یہ کیسے پھول کھل رہے ہیں کہ ہر پل کے ساتھ خزاں کا احساس بڑھتا ہی جاتا ہے۔

زوالِ بغداد کی کہانی
کچھ ہماری، کچھ شیخ سعدی کی زبانی
(مردار دنیا کے لیے گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں!)

آج اپریل (بقول ایلیٹ سب سے بے رحم مہینے) کا دسواں دن ہے۔ بغداد، بصرہ، کربلا، نجف اور دور پاس کی بستیوں کے بچے کل رات (۹،۱۰ اپریل کے بیچ کی رات) شاید چین سے سوئے ہوں گے یا شاید نہ سوئے ہوں۔ بہت سے بچے، نوجوان، بوڑھے زخمی ہیں۔ کچھ لوگ تین ہفتے کی قیامت خیز بربادی اور ہنگاموں کے باعث ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ہر بستی آن کی آن میں کوفہ بن گئی ہے۔ بے مہری کا دور دورہ ہے۔ متعدد بچے، جوان، بوڑھے اپاہج ہو گئے ہیں۔ بہت سے باغ اجڑ گئے، عمارتیں ڈھیر ہو گئیں، دفاتر اور ادارے برباد ہو گئے۔ بستیاں ویران، مجسمے زمیں بوس، اقتدار کی علامتیں منتشر، بازاروں اور سڑکوں پر قیامت کا منظر۔ بی بی سی اور سی این این پر بار بار ایک تصویر دکھائی جاتی ہے۔ ایک مخبوط الحواس عراقی صدام حسین کے ایک پوسٹر سے اپنے انجام کا بدلہ لے رہا ہے۔ ہجوم جارج بش کے نعرے لگا رہا ہے، جبر سے رہائی کا جشن منانے والے امریکی اور برطانوی فوجیوں سے معانقہ کر رہے ہیں۔ انھیں چوم رہے ہیں، جارج بش اور ٹونی بلیئر کی فوجوں نے کیسی زبردست انسانی خدمت انجام دی ہے۔ اے بنی اسرائیل تمھارے تحفظ اور سلامتی کی خاطر اور اس تیل کی خاطر جو امریکہ اور برطانیہ کی ہری بھری شاداب زمینوں کی تہہ سے کھسک کر نہ جانے کیوں اور کیسے "نیم خواندہ اور پسماندہ" عربوں کے ریگزار میں روپوش ہو گیا۔ فطرت کی اسی ایک غلطی کے باعث آج زمانے کی آنکھ یہ تماشا دیکھ رہی ہے۔

اسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے ہیں، دوائیں اور طبی امداد کا سامان کم پڑ گیا ہے، تو کیا ہوا؟ یہ سب امریکہ سے آجائے گا۔ آج صبح کے اخبار میں بغداد کی سڑکوں پر لوٹ مار اور اجتماعی ابتری کی تصویریں بھری پڑی ہیں، ایک کارٹون میں صاحبان ذی شان جارج بش اور ٹونی بلیئر اپنے نحیف کاندھوں پر پٹرول سے بھرے پیپے اٹھائے عام لٹیروں کے ساتھ بھاگے جا رہے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی! صحافی سخت ترین حالات میں بھی شرارت سے باز نہیں آتے، اسی لیے تو درجن بھر صحافی امریکی و برطانوی فایر پاور کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھے۔ الجزیرہ ٹی وی کے متعلقین بھی مارے گئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، یہ تو ہونا ہی تھا۔ صحافی جھوٹ بولیں گے تو سزا پائیں گے، اسی لیے تو امریکہ اور برطانیہ دونوں نے دنیا بھر کے میڈیا پر اپنی لگام کس رکھی ہے۔ دنیا بھر کے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے لیے ان واقعات میں ایک سبق بھی چھپا ہوا ہے۔ انھیں چاہیے کہ آئندہ امریکہ بہادر کے اقدامات پر لب کشائی کرنے سے پہلے اپنا انجام سوچ لیں۔ عراق ایک ملک تھا، اب ایک علامت بن چکا ہے، اب اس کے حصے بخرے ہوں گے۔

تو صاحب! ہم بھی اب کچھ اور نہیں کہتے۔ آپ کو گلستاں بوستاں والے شیخ سعدی کی طرف لیے چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ بغداد کے زوال پر ان کا ردعمل کیا تھا! ہلاکو کی فوجوں نے صدیوں پہلے جب اس شہر دل پذیر پر حملہ کیا تھا اور تباہی مچائی تھی، جب دجلہ کا رنگ انسانی لہو سے لال ہو گیا تھا، کتب خانے تباہ کر دیے گئے تھے اور گلی محلے لاشوں سے پٹ گئے تھے، اس وقت ہمارے شیخ نے ایک مرثیہ کہا تھا، فارسی میں۔ ہم ذیل میں اس مرثیہ کا اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ مترجم ہیں ہمارے مولانا الطاف حسین حالی۔ ان کی کتاب حیات سعدی سے یہ ترجمہ لیا گیا ہے۔ مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
برزوالِ ملکِ مستعصم امیرالمومنیں

شیخ سعدی کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

آسماں کا فرض ہے کہ مستعصم کی تباہی پر، زمیں پر خون برسائے۔
اے محمد (صلعم) اگر آپ قیامت ہی کو مرقد سے باہر نکلیں گے۔

تو ابھی نکل کر، قیامت دنیا میں دیکھ لیجیے۔
محل کے ناز پروروں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا،
اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا۔
زمانے کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیے۔
یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔
جنھوں نے اس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑا کرتے تھے اور زمین پر بیٹھتے تھے وہ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں۔
کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اس خاک پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑا کرتے تھے۔
آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں چاہیے کیونکہ جب انگوٹھی پر سے نگین جاتا رہتا ہے تو نری کلونس رہ جاتی ہے۔
دجلے کا پانی نکتر لہو ہو گیا ہے۔ اگر اب جاری رہے گا تو گلستانِ بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دے گا۔
شہیدوں کی خاک پر نوحے کی کیا ضرورت ہے، کیونکہ ان کے لیے ادنا نعمت، فردوس بریں ہے۔
ہاں! مگر رحم اور اسلام کی ہمدردی کے سبب دوست کا دل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے۔
کل تک صبر کرو، قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منھ لے کر اٹھیں گے۔
یارو! دنیا پر بھروسا کرنا اور اس سے دل لگانا نہیں چاہیے، کیونکہ آسمان، کبھی دوست ہے، کبھی دشمن!
شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا۔
اور جب قضا آتی ہے۔

تو رائے صائب کی قوت جاتی رہتی ہے۔
جس بہادر کی گھات میں اجل ہوتی ہے،
اس کی اصیل تلوار لڑائی کے دن میان سے باہر نہیں نکلتی!
جب نصیب پلٹ گیا پھر اس کا امتحان کرنا بے فائدہ ہے۔
اور جب زین الٹ گیا،
پھر حملہ کرنا فضول ہے۔
یارو! مردار دنیا کے لیے گدھ آپس میں لڑ رہے ہیں۔
اگر تم عقل مند ہو،
تو سی مرغوں کی طرح الگ بیٹھو!

مولانا حالی نے اپنی کتاب میں شیخ سعدی کا یہ مرثیہ نقل کرنے سے پہلے لکھا تھا:

''اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم وفن کے ماہر اور ارباب حرفت وصنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے، عیش وعشرت کے سامان حد سے زیادہ ہر طرف مہیا نظر آتے تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و داب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لرزتے تھے اور بڑے بڑے شہریار اور فرمانروا بارگاہ خلافت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ (ظاہر ہے کہ ان دنوں اقوام متحدہ کا وجود نہ تھا اور عراقی حکومت پر کسی طرح کی پابندی نہ تھی۔ ش ح)۔ تہواروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی، وہاں ایک مدت پہلے سے راستے کے تمام منظر اور بالا خانے کرایہ داروں سے رک جاتے تھے۔ الغرض۔۔۔ یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس دار الخلافے کا بے چراغ ہونا، جو چھ سو برس (!) بوسہ گاہ ملوک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بربادی جس کا سایۂ اقتدار یورپ، ایشیا اور افریقہ (امریکہ کی اس وقت تک ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ش ح) پر برابر پڑتا تھا اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزارہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تاتاریوں کی تیغ بے دریغ سے قتل ہونا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحۂ روزگار سے مٹ جانا، مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستعصم باللہ کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم وستم بھی اس کی آنکھوں کے روبہ رو گزرے تھے جو ہلاکو خاں (؟) کے خوں خوار لشکر نے بغداد میں

برپا کیے۔۔۔(یہ مرثیہ) شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونے والا اور خود اسلام کے سوا کوئی اس کا ماتم دار اور سوگ وار دنیا میں باقی نہ تھا۔"

اور مرثیہ (معہ ترجمہ) نقل کرنے کے بعد حالی نے یہ حاشیہ بھی لگایا ہے کہ "مستعصم باللہ کو کیسا ہی نالائق اور قابل نفریں سمجھو، مگر یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے اٹھ گئی، بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے، ایک بارگی ان میں تزلزل آگیا اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحہ ہستی سے یک قلم محو ہو گیا!" (اہل عرب توجہ فرمائیں!)

ہمارا خیال ہے کہ آج اس بیان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ جنگ اور جارحیت کا تماشا کل یعنی کہ ۹ اپریل کو ختم نہیں ہوا، بلکہ شروع ہوا ہے۔ چلتے چلتے اسی کتاب کا ایک اور جملہ ہم دوہرائے دیتے ہیں کہ "رسول اللہ کے بنی عم کا خون تاتاری وحشیوں کے ہاتھ سے آب باراں کی طرح بہایا گیا اور جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ چشم زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا!"

وقت کا پہیہ پیچھے کو نہیں گھومتا۔ مگر تاریخ میں یہ کیسی خرابی ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی دوہرا دیتی ہے۔ صاحبو! اب آنے والے دنوں میں بقول اقبال ع

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا

یہ کس کا خواب تماشا ہے؟

کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

پروین تو گڑیا نے ایک انٹرویو کے دوران یہ انکشاف کیا کہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کا وجود ہمارے بہت سے مسئلوں اور پریشانیوں کا سبب ہے۔ ''دیش کی مریادا'' کو بچانے کے لیے اس یونیورسٹی کو بند کر دینا چاہیے۔ ہماری وزارت فروغ انسانی وسائل بہت دنوں سے اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ اس رنگا رنگ ملک کی ذہنی زندگی کو ترقی دینے کے لیے ماضی کی بہت سی غلطیوں کا علاج کر دیا جائے۔ جیوتش ودیا کے شعبے اور راز کار رفتہ علوم کے مراکز اسی نیک اندیشی کے ساتھ قائم کیے جا رہے ہیں۔ اردو ادیبوں اور اساتذہ کے ایک حلقے نے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کو مرد آہن کا جو خطاب دیا ہے تو اسی لیے کہ ڈاکٹر صاحب سائنس کے آدمی ہوتے ہوئے بھی سائنس کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ تاریخ کی کتابوں میں تبدیلی کے ذریعہ تاریخ کا دھارا موڑنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک طرف جارج بش نے دہشت پسندی کے خلاف رواداری، انصاف اور روشن خیالی پر مبنی جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ دوسری طرف ہمارے یہاں مشترکہ روایات، اقدار اور تاریخی وراثت کے نشانات کو مٹانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس سلسلے کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی بارہویں کلاس کے ہندی نصاب سے عالمی شہرت یافتہ ادیب پریم چند کو رخصت کیا جا رہا ہے اور ہندی کی بی جے پی ساختہ ادیبہ مردولا سنہا کو لایا جا رہا ہے۔ پریم چند کے معروف ناول نرملا کی جگہ اب مردولا سنہا کا گمنام ناول ''جیوں مہندی کے رنگ'' پڑھایا جائے گا۔

پریم چند اور مردولا سنہا میں کیا مشترک ہے اور کیا مختلف ہے اس کو جاننے سمجھنے کے

لیے بس اتنا جان لینا کافی ہوگا کہ منشی پریم چند تو بس عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور غریب، پسماندہ انسانوں کی ترقی اور فلاح کے حامی اور علم بردار تھے۔ مردولا سنہا بھارتیہ جنتا پارٹی کے خواتین مورچہ کی جنرل سکریٹری ہیں اور جہیز کی لعنت سے قطع نظر، جاہل شوہروں کی طرف سے بے زبان بیویوں پر ڈھائے جانے والے مظالم تک کو درست سمجھتی ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ ''زیادہ تر غلطی عورت ہی کرتی ہے۔ وہ مرد کو اتنا مشتعل کر دیتی ہے کہ اسے مجبوراً عورت پر ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے۔''

جب ایک سائنس داں ایچ آر ڈی وزیر نے جیوتش ودیا اور توہمات کا پرچم اٹھا رکھا ہو تو ادبی، علمی، تہذیبی اداروں اور علم اور فکر کی دنیا میں مردولا سنہا جیسوں کا راستہ صاف سمجھنا چاہیے۔ اب اس ملک کے بچے آزادی کی نئی تاریخ کے نام پر ویر ساورکر اور ان کے ٹولے کے کارناموں کا حال پڑھیں گے۔ اور ادب کی تاریخ میں پریم چند کی جگہ مردولا سنہا کا نام باجے گا۔ ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے!

یہ ارندھتی رائے کون ہیں؟

پوچھنے والا کوئی اور نہیں ہمارے باکمال ناول نگار، ''اداس نسلیں'' جیسی شاہکار کتاب کے مصنف عبداللہ حسین ہیں۔ ''ذہن جدید'' کے حالیہ شمارے میں انھوں نے اس واقعے پر حیرانی جتائی ہے کہ چاروں طرف ارندھتی رائے کا بھلا اتنا چرچا کیوں ہے؟ وہ پاکستان گئیں تو وہاں بھی دانشوروں، صحافیوں اور ادیبوں نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ کیا یہ دھوم دھڑ کا صرف اس وجہ سے ہے کہ ارندھتی رائے انگریزی میں لکھتی ہیں؟

بے شک، انگریزی میں لکھنے کے اپنے فائدے ہیں۔ لکھنے والا بہت جلد ہی ''لائم لائٹ'' میں آجاتا ہے۔ میڈیا اسے آن کی آن میں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہاں قصہ کسی ایرے غیرے کا نہیں ارندھتی رائے کا ہے۔ یہ دبلی پتلی، منحنی سی، نازک خد و خال والی خاتون جو صرف ایک ناول لکھ کر اس عہد کی سب سے بڑی اور ممتاز ہستیوں میں گنی جانے لگیں، انھیں ہم اس ''عہد کا ضمیر'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اپنا ایک کروڑ سر سٹھ لاکھ کا انعام انھوں نے ایسے پچاس اداروں اور افراد میں بانٹ دیا ہے جو ہماری اجتماعی تعمیر اور بہبودی کو اپنا نصب

العین بنائے ہوئے ہیں اور فسطائیت، جہالت، روشن خیالی کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ اپنے ناول کی رائلٹی سے ملنے والی لاکھوں کی رقم بھی انھوں نے اسی طرح نرمدا بچاؤ آندولن کے لیے وقف کر دی تھی۔ گجرات کے فسادات پر، نیوکلیائی تجربے کے ہیبت ناک تماشے پر۔ اور ابھی حال میں غریب عراقیوں پر امریکہ کے مظالم اور بڑے بش کے بچے چھوٹے جارج بش کی جارحیت اور بہیمانہ مقاصد پر ارندھتی رائے نے جو مضامین لکھے، ساری دنیا میں ان کا چرچا رہا۔ مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں ان مضامین کے ترجمے چھپے۔ 'آج' کراچی کے مدیر اجمل کمال بھی ارندھتی رائے کے مضامین کی کتاب اردو میں شائع کرا رہے ہیں۔ جارج آرویل نے صحیح کہا تھا کہ جنگ کے زمانے کا ادب صحافت ہوتی ہے۔ اس وقت ہم سب خیر اور شر کی ایک جنگ کا تماشہ دیکھ رہے ہیں!

ارندھتی رائے کی ایک تحریر جس کا تعلق آج کے عراق کی صورت حال سے ہے اس لائق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ ارندھتی رائے نے لکھا ہے:

''میں اس قدر دکھی کبھی نہیں تھی جتنی کہ آج ہوں! پہلا دکھ تو اس بات کا ہے کہ چچا سام (امریکہ) کے کردار کو میں نے جیسا سمجھا تھا، وہ بالکل سو فیصد ویسا ہی نکلا۔ عراق پر حملہ کر کے امریکہ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آج اس لمحہ، تہذیب و تمدن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ میں انگلینڈ اور آسٹریلیا کو ملزم قرار دینے کی گستاخی نہیں کروں گی۔ وہ تو محض چوپائے ہیں۔ اپنے مالک کا اشارہ سمجھ کر کسی پر بھی جھپٹ سکتے ہیں۔ جس کے پاس اپنا دماغ نہیں ہے وہ میری نظر میں بے چارہ ہے، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا ملک۔

میں سمجھتی تھی کہ اپنے زور قلم سے، اپنی ڈرامائی حاضری سے اور اپنی لیاقت سے میں تاریخ کے دھارے کو موڑ سکتی ہوں۔ میرا یہ غرور بصرہ اور بغداد کی سڑکوں پر چور چور ہو کر بکھرا پڑا ہے۔ پتہ نہیں، اسے وقت کے جھاڑو سے کب سمیٹا جائے گا۔

بلی دہاڑ نہیں سکتی۔ کھسیا تو سکتی ہے۔ جھپٹا تو مار ہی سکتی ہے۔ میرا جھپٹا یہ ہے کہ میں بوکر پرائز اور لینن فاؤنڈیشن ایوارڈ دونوں ان اداروں کے منھ پر پھینک مارتی ہوں جو دکھ کے اس لمحے میں میرے ساتھ نہیں ہیں۔

پیسے کی طاقت یہ ہے کہ وہ لبھا سکتا ہے۔ انسان کی طاقت یہ ہے کہ وہ اسے ٹھکرا سکتا ہے۔

دوستو! آگے آؤ! انسان کی طاقت کے مظاہرے کا اتنا اچھا موقع ہماری زندگی میں دوسری بار شاید ہی آئے۔ جب تک دھرتی پر امریکی کلچر جیسے ڈائناسور موجود ہیں، کہیں بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے!" (جن ستا، ۶ر اپریل ۲۰۰۳ء)

جو ادیب آزمائش کی گھڑی میں کوئی واضح موقف اختیار نہیں کرتا اور صرف اپنے آقاؤں کے سامنے دم ہلاتے رہنے کو کافی سمجھتا ہے، وہ ادیب نہیں کچھ اور ہے۔۔۔ پریم چند نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں غلط نہیں کہا تھا کہ "ہم بہت سو چکے۔ اب اور سوتے رہنا موت کی علامت ہوگی۔"

الوداع ابن فرید!

بظاہر گرد و پیش کی دنیا تو اپنی جگہ ٹھہری رہتی ہے مگر آدمی ایک دن اچانک چپ چپاتے گزر جاتا ہے۔ ابھی ابھی اپریل کے آخری ہفتے میں ابن فرید سے دن بھر کی ملاقات رہی تھی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی طرف سے رام پور کی رضا لائبریری میں غالب پر ایک مذاکرے کا اہتمام تھا۔ ابن فرید نے عرصے سے اسی شہر کو اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ مذاکرے میں شریک ہوئے۔ رام پور کی ادبی روایت کے بارے میں مضمون پڑھا، دوستوں سے ہمیشہ کی طرح ملتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت اپنی دو کتابیں، ایک افسانوں کی، دوسری مضامین کی تحفتاً عنایت کیں۔ انھیں دل کا پرانا مرض تھا۔ مگر بظاہر صحت مند اور خوش دکھائی دیے۔ اب جو اچانک ان کے انتقال کی خبر ملی تو ان کی پوری زندگی کا نقشہ آنکھوں میں پھیل گیا۔

میرٹھ کے ایک رسالے "معیار" میں سب سے پہلے ان کا ایک افسانہ پڑھا تھا۔ عنوان تھا "مجسمے"۔ یہ تقریباً پینتالیس برس پرانی بات تھی۔ مدتوں بعد ہم علی گڑھ پہنچے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ ابن فرید یونیورسٹی میں نفسیات پڑھاتے تھے۔ ادب اور اسلامیات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ذہنی اعتبار سے ہمیشہ مستعد، مصروف اور زندگی یا زمانے کے سنجیدہ مسئلوں میں منہمک انھوں نے بہت سوچا اور بہت لکھا۔ نفسیاتی تنقید اور بین العلومی تنقید کی سطح کو بلند کرنے اور مقبول بنانے میں ابن فرید کی تحریروں کا نمایاں حصہ ہے۔ بہت ملنسار، خوش باش اور جذباتی

طبیعت پائی تھی۔قوم کی اصلاح اور ترقی کا خیال انھیں بے چین رکھتا تھا۔اپنی اہلیہ کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک ادارہ قائم کرلیا تھا اور ایک زنانہ رسالہ بھی شائع کرتے تھے۔رام پور دارالسرور کی زندگی انھیں ذہنی اعتبار سے بہت راس آئی تھی۔ ہر طرح کی نمود و نمائش اور آپا دھاپی سے الگ اپنے کاموں میں مگن رہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کی اہلیہ رخصت ہوئی تھیں۔ یہی غم جان لیوا ثابت ہوا۔ابن فرید کے اٹھ جانے سے دنیا ایک انتہائی مہذب اور شریف انسان سے خالی ہوگئی ہے۔حق مغفرت کرے۔

الہ دین کا چراغ، ماہنامہ سائنس اور اصغر علی انجینئر

جنوبی دلی کی مسلم اکثریتی آبادی اوکھلا میں پرانی دلی جیسی بھیڑ بھاڑ، رونق اور بے ترتیبی سے چھلکتی ہوئی ایک بستی ہے، ذاکر نگر۔ ذاکر نگر کی ایک گلی میں کوئی دس برس پہلے الہ دین کا ایک چراغ روشن ہوا۔ جب سے اب تک اس چراغ کی لو بڑھتی ہی جاتی ہے۔ ہم نے بہت سے جادوگروں کا تماشا دیکھا ہے۔ مگر کوئی تماشا اتنی دیر تک تو نہیں ٹھہرتا۔ پل دو پل کے لیے دیکھنے والے حیران ہوتے ہیں۔ پھر تماشا ختم اور تماشائی اپنے اپنے راستے پر۔ لیکن اردو ماہ نامہ سائنس کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے صرف ایک اپنی محنت اور لگن سے اپنے جادوئی چراغ کو ابھی تک سنبھال رکھا ہے۔ اس چراغ کی لو مسلسل تیز ہوتی جا رہی ہے۔

اردو کے مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے کہیں لکھا تھا کہ "بہت دنوں تک اپنے ریاضی میں فیل ہونے کو ہم اپنے مسلمان ہونے کی واحد دلیل سمجھتے رہے۔ گویا کہ ہنسی ہنسی میں یوسفی صاحب نے اپنی قوم کے مزاج پر تبصرہ کیا ہے کہ اسے عام طور پر ریاضی اور سائنس سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔ ذرا سوچیے تو۔ یہ کتنی عجیب اور انہونی بات ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اسلام اور سائنس لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ یا ذہنی بیداری سے بہت پہلے مسلمانوں نے نئے علوم اور سائنس کا علم بلند کیا۔ "مغربی سائنس اور حکمت" طب، فلکیات، ریاضی، ہیئت، نجوم، ارضیات، کیمیا، جغرافیہ، جہاز رانی، طبیعیات کے میدانوں میں مسلمان بہت عرصے تک پیش پیش رہے۔ ہمارے نوبل انعام یافتہ سائنداں پروفیسر عبد السلام نے اپنے ایک مضمون میں سائنس اور سائنسی علوم کی طرف سے مسلمانوں، خاص کر عربوں اور پاکستانیوں کی بے شوقی، غفلت اور بے نیازی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ مسلمان ممالک اگر ہوش میں آجائیں تو اپنی متحدہ کوششوں اور وسائل کی مدد سے آج بھی تھیوریٹکل فزکس کی دنیا میں انقلاب لا سکتے

ہیں، ایک عالمی سطح کا مرکز قائم کر سکتے ہیں۔ اپنی پسماندگی کے بوجھ سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ برسوں پہلے، نوبیل انعام حاصل کرنے کے بعد، پروفیسر عبدالسلام ہندوستان آئے تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی انھوں نے ایک تقریر کی تھی۔ ان کا زور اسی بات پر تھا کہ مسلمان اپنی کھوئی ہوئی میراث کو پھر سے حاصل کرنے کی جدوجہد کریں اور جدید سائنس و ٹکنالوجی کی دنیا میں اپنے پچھڑے پن سے نجات کا راستہ ڈھونڈیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اردو ماہنامہ سائنس کے ذریعے اسی نصب العین کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اب تک اس رسالے کے ایک سو بارہ شمارے چھپ چکے ہیں۔ ایک ایسے حوصلہ شکن دور میں جب اردو رسالے سال دو سال بھی مشکل سے چل پاتے ہیں۔ ماہنامہ سائنس کا جاری رہنا، مقبول ہونا اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں رہنے بسنے والے اردو خوانوں تک اس کا پہنچنا بڑی خوش آئند بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی ہی جدید دنیا کے الہ دین کا چراغ ہیں۔ اس بھید کو ہمارے بزرگوں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔ سرسید احمد خاں نے انیسویں صدی میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے جدید علوم کی اہمیت پر نہ صرف یہ کہ زور دیا، سائنسی ادب کے فروغ اور ترقی کا راستہ بھی اختیار کیا۔ سائنسی کتابوں کے ترجمے کروائے، سائنسی موضوعات پر مضامین لکھوائے، تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ اردو خوانوں کا مزاج بدلنے کی کوشش کی۔ ان کے رفیقوں میں کیسے کیسے حوصلہ مند لوگ تھے۔ ایک روایت پرست، رسوم زدہ، سست رفتار قوم کو انھوں نے نئے علوم کی روشنی اور رفتار سے روشناس کرنے میں عمریں گزار دیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ انیسویں صدی میں جب مغلوں کے زوال کے بعد ہندوستان میں نئے علوم اور ایک نئی تہذیب کا ڈنکا بج رہا تھا، سرسید اور ان کے رفقا اگر مسلمانوں میں جدید افکار اور تعلیم کی اشاعت کے بجائے صرف جذباتی مسئلوں میں الجھے رہتے تو آج ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال کیا ہوتی۔ ماہ نامہ سائنس کے نئے شمارے (۱۱۲) کے اداریے میں کہا گیا ہے:

''آج (مسلم) عوام کی اکثریت غربت کا شکار ہے جب کہ شاہی افراد اور حکام کے محلات کئی کئی ایکڑ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک میں آج اتنے سائنداں ہیں کہ تمام ''مسلمان ممالک'' میں کل ملا کر اتنے سائنداں نہیں۔ گزشتہ کئی صدیوں سے ان ممالک

میں شاید ہی کوئی موجد پیدا ہوا ہو یا انھوں نے کوئی اپنی ٹکنالوجی/ دریافت پیٹنٹ (محفوظ) کرائی ہو۔ (افغانستان اور عراق ہی کے جیسے) ایک تاریخی حادثے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب کہا تھا:

"انیسویں صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا محاصرہ کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھایا جائے۔ اُدھر روسیوں کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں، اِدھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے" یامقلب القلوب یا محول الاحوال" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جو کہ ایک ایسے مقابلے کا نتیجہ نکلنا تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو دوسری طرف ختم خواجگان۔ دعائیں ضرور فائدہ پہنچاتی ہیں، مگر انہی کو جو عزم و ہمت رکھتے ہیں۔ بے ہمتوں کے لیے وہ ترک عمل اور تعطل قویٰ کا حیلہ بن جاتی ہیں۔" (غبار خاطر)

اصغر علی انجینئر کا سیکولر پرسپیکٹیو

فرقہ پرستی، تنگ نظری اور جہالت کے خلاف ہمارے ملک میں جو لڑائی جاری ہے اس کا ایک مورچہ اصغر علی انجینئر نے سنبھال رکھا ہے۔ وہ ایک انتہائی حوصلہ مند، جری اور روشن خیال دانشور کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے سیاست اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور چند اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اصغر علی انجینئر کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں صرف خالی خولی خیال کی سطح پر سرگرم نہیں ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ کرتے بھی رہتے ہیں۔ ژاں پال سارتر نے کہا تھا کہ سوال دنیا کو سمجھنے کا نہیں، دنیا کو بدلنے کا ہے۔ یعنی یہ کہ عمل کے بغیر صرف خیال سے کام نہیں چلتا۔ اصغر علی انجینئر کی شخصیت ایک سماجی کارکن کے طور پر معروف ہے۔ انھوں نے اپنے اصلاحی اور تعمیری مشن کا آغاز اپنے فرقے میں پھیلی ہوئی توہم پرستی اور مذہب کے نام پر عام انسانوں کے استحصال کے خلاف جدوجہد سے کیا۔ کئی بار ان پر جان لیوا حملے ہوئے۔ انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن انھوں نے ہار نہیں مانی۔ ان کا آزاد ذہن اور بے چین روح اپنے مشن سے دست بردار نہیں ہوئے۔ ایک سماجی مفکر اور دانشور کے علاوہ وہ ایک انتہائی سرگرم اور بہادر سماجی کارکن کے

طور پر بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

ادھر کچھ دنوں سے وہ سیکولر پرسپیکٹیو کے نام سے ایک پندرہ روزہ ٹلز میگزین بھی شائع کر رہے ہیں۔ ''سیکولر پرسپیکٹیو'' کے تازہ شمارے میں ''ہندوستان، بی جے پی کے راج میں'' عنوان سے اصغر علی انجینئر کی ایک تحریر شامل ہے۔ اس تحریر میں کئی سوال اٹھائے گئے ہیں اور ایسی کئی باتیں کہی گئی ہیں جن پر سوچ بچار ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ ''ٹی ڈی پی کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ وہ آندھرا پردیش میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ مرکز میں اس کی حمایت بی جے پی کو کافی مقدار میں وہ تیل فراہم کر رہی ہے جس کے ذریعہ وہ ملک کی دیگر ریاستوں میں فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا رہی ہے۔ اگر چندرا بابو نائیڈو نے این ڈی اے کی حمایت نہیں کی ہوتی تب یقینی طور پر گجرات کے بھیانک اور یکطرفہ فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوئے ہوتے۔ گجرات میں جو کچھ ہوا اس کے لیے بڑی حد تک ٹی ڈی پی بھی ذمہ دار ہے اور وہ اس ذمے داری سے اپنا دامن بچا نہیں سکتی۔ اس طرح ٹی ڈی پی بھی اس انجام میں برابر کی شریک ہے جسے خوشونت سنگھ نے بجا طور پر ''ہندوستان کا خاتمہ'' کہا ہے۔''

سیکولر پرسپیکٹیو ۹- بی ہمالیہ اپارٹمنٹس، پہلی منزل، سڑک ٦، سانتا کروز (ایسٹ) ممبئی ۴۰۰۰۵۵ سے شائع ہوتا ہے۔

یہ کیسا گورکھ دھندا ہے یہ کیسا تانا بانا ہے (انیسویں صدی بیسویں اور اکیسویں صدی سے آگے کیوں ہے!)

پروفیسر سی ایم نعیم (چودھری محمد نعیم) پچھلے چالیس برسوں سے امریکہ کے شہر شکاگو میں رہتے ہیں۔ ابھی پچھلے برس تک وہ شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔ امریکہ کی بیشتر یونیورسٹیوں میں اردو زبان و ادب اور جنوب ایشیائی ثقافت کے امریکی اساتذہ (اور طلبا) نعیم صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و تدریس میں نعیم صاحب ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اردو سکھانے کے لیے انھوں نے انگریزی میں جو ریڈر تیار کی ہے اور جسے پوری مغربی دنیا میں قبولیت ملی، اب دنیا بھر میں کمپیوٹر پر دستیاب ہے۔ جو چاہے اسے ڈاؤن لوڈ کرلے اور گھر بیٹھے اس سے فائدہ اٹھائے۔ نعیم صاحب نے میر کی فارسی خودنوشت ذکرِ میر کو انگریزی میں مرتب اور منتقل کیا ہے۔ اردو سے انگریزی میں تخلیقی ادب کے کئی ترجمے کیے ہیں۔ انگریزی میں کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ انگریزی میں دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اردو کے مشہور زمانہ انگریزی رسالے "Annual of Urdu Studies" کے (جو ان دنوں وسکانسن سے پروفیسر محمد عمر میمن کی ادارت میں شائع ہوتا ہے) بانی ایڈیٹر رہے ہیں، تیس پینتیس برس پہلے یہ رسالہ شکاگو سے نکلا تھا اور اس وقت اس کا نام MEHFIL تھا۔ اس رسالے نے انگریزی دانوں میں اردو زبان و ادب سے شناسائی کی ایک روایت کو ترقی دی ہے۔ ذاکر حسین سوسائٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے اب اس انگریزی جریدے کے ہندوستانی ایڈیشن کی اشاعت کا ڈول ڈالا گیا ہے۔ یہ ایک خوش آیند منصوبہ ہے!

ان دنوں نعیم صاحب کی دلچسپی کا خاص میدان انیسویں صدی کے ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی روایت اور اردو کی علمی و ادبی روایت ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کا انھوں نے اپنے کئی مضامین میں جائزہ لیا ہے۔ خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں کا۔ انیسویں صدی کی ذہنی بیداری میں نذیر احمد کا رول بہت ممتاز ہے۔

غالب کی حویلی کے راستے سے نذیر احمد کی حویلی تک

پرانی دلی، لال کنواں سے ذرا آگے، کھاری باؤلی کی ایک گلی میں نذیر احمد کی وسیع و عریض حویلی، آج زبان حال سے، برصغیر کے مسلمانوں کے ماضی اور حال کی داستان سناتی ہے۔ اب اس حویلی میں ڈپٹی نذیر احمد کے حقیقی پوتے مسلم احمد نظامی صاحب رہتے ہیں۔

پچھلے ہفتے نعیم صاحب دلی آئے تو انھوں نے مسلم صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ہم صبح صبح جامع مسجد پہنچے جس کی سیڑھیوں کے نیچے جامعہ ملیہ کے عبدالرشید صاحب ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں انہی کی رہنمائی میں مسلم صاحب تک پہنچنا تھا۔ ہمارے پاس ابھی کچھ وقت تھا اس لیے سوچا کہ مسلم صاحب سے پہلے بلی ماران میں غالب کی حویلی دیکھتے چلیں۔ جب سے وزارت ثقافت نے اس حویلی کو اپنی تحویل میں لیا ہے اس کی حالت بہت سدھر گئی ہے۔ غالب کی حویلی کیا ہے، انیسویں صدی کی تہذیب کا اور تاریخ کا ایک مرقعہ ہے۔ غالب اور ان کے معاصرین کی تصویریں، آثار، تاریخی نقوش اور یادگاریں! البتہ غالب کے ہم عصروں کی تصاویر جہاں آویزاں ہیں، وہاں امیر مینائی کی تصویر پر مصحفی کا نام لکھا ہوا ہے! خیر گلی قاسم جان سے نکل کر ہم ڈپٹی نذیر احمد کے محلے میں پہنچے۔ بھنے ہوئے گوشت، کباب پراٹھوں کی خوشبو، پھر گرم مسالوں کی تیز مہک، کھاری باؤلی کی وہ گلی ہمارے سامنے تھی جہاں ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ گزارا۔ ان دنوں یہ گلی کیسے کیسے عظیم المرتبت اصحاب کے قدموں سے آباد ہوئی ہوگی۔ محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، سرسیدؒ!

ایم اے او کالج کا غبن اور ڈپٹی نذیر احمد کی تقریر

اس ملاقات میں مسلم صاحب نے ہمیں ڈپٹی نذیر احمد کی ایک یادگار تقریر کا قصہ سنایا۔ یہ ساری داستان انھوں نے اپنے ایک مضمون "دادا کی کہانی پوتے کی زبانی" میں بھی بیان کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سرسید کالج فنڈ سے تقریباً تین لاکھ روپیوں کے غبن کی وجہ سے بہت دل گرفتہ تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تقریر کے جادو کا انھیں خوب پتہ تھا، ڈپٹی صاحب کے بار بار منع کرنے کے باوجود اصرار کر کے انھیں اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ جلسہ ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کی تقریر ہوئی۔ تین لاکھ کی جگہ سات لاکھ کی رقم جمع ہوگئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے جو تقریر وہاں کی تھی اور سامعین نے اس تقریر کا جو اثر لیا۔ اپنے آپ میں وہ ایک ڈرامے کی طرح دلچسپ اور کشمکش سے بھرا ہوا قصہ تھا۔ مسلم صاحب کی ٹکسالی زبان اور جذبات سے معمور بیان نے اس قصے کو مزید پرکشش بنادیا تھا۔ افسوس کہ ہمارے یہاں تاریخ اور تہذیب کے حکائی (Oral) وسائل کو محفوظ اور ریکارڈ کرنے کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ حال اس قوم کا ہے جس نے دنیا کی سب سے ضخیم داستان مرتب کی۔ ابھی دلّی میں گئے زمانوں کی خبر لانے والی جو دو چار صورتیں باقی ہیں، ان کا ہونا بہت غنیمت ہے۔ اردو کی اکادمیوں اور اداروں کو ان کے تحفظ کی فکر کرنی چاہیے۔ مسلم صاحب ہی سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا امام بخش صہبائی کی خستہ وشکستہ قبر اینگلو عربک کالج کے احاطے میں، مسجد کی مشرقی دیوار کے پاس ابھی موجود ہے۔ اس عمارت کو بچانے اور محفوظ کرنے کے سلسلے میں حکومت نے کچھ اقدامات کیے ہیں۔ مولانا صہبائی کی قبر پر اگر ایک کتبہ بھی لگوا دیا جائے تو اچھا ہے۔ ہم جو اپنی اجتماعی تاریخ کی طرف سے حکومت کی غفلت اور تعصب کا گلہ کرتے رہتے ہیں، اس تاریخ کے آثار کو قائم رکھنے کی کچھ فکر ہمیں خود بھی تو کرنی چاہیے۔

انیسویں صدی کیا دوبارہ آسکتی ہے؟

برصغیر کی اجتماعی تاریخ میں یہ صدی مغلوں کے زوال اور انگریزی حکومت کے قیام کے باوجود ایک روشن صدی تھی۔ ہم اسے اردو کی تخلیقی روایت کے نقطۂ عروج (غالب) اور جدید اردو نثر کے فروغ اور تشکیل کی صدی بھی کہتے ہیں۔ جس وقت پورے ہندوستان میں اصلاحی تحریکوں

کا ڈنکا بج رہا تھا، سرسید اور ان کے رفیقوں نے ایک تھکی ہاری قوم کے اعتماد کو بحال کرنے کی زبردست جدوجہد کی۔ یہی صدی انجمن پنجاب اور علی گڑھ تحریک کی صدی بھی ہے۔

ہمارے یہاں اسی صدی کے دوران نئے علوم کے چراغ روشن ہوئے۔ ادب، صحافت، ثقافت، علوم اور افکار کی دنیا میں انقلاب آیا۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے جس آزمائش کا سامنا کیا، جن پریشانیوں سے گزرے اور جس طرح انتہائی حوصلہ شکن حالات کے باوجود روشن خیالی، رواداری، اور امید پروری کے راستے پر ڈٹے رہے، ہمارے لیے ان واقعات میں بہت سے سبق چھپے ہوئے ہیں۔ ہمارے انیسویں صدی کے بزرگ، آج کے مقابلے میں زیادہ مثبت، معقول اور صحت مند رویوں کے مالک تھے۔ سرسید کے ساتھ ساتھ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک، وقار الملک اور ان کے ہم خیال بزرگوں کی سرگرمی کے بغیر مسلمانوں کے لیے شاید کوئی راہ نجات مشکل سے ہی نکل سکتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی تہذیبی روایت اور اپنے عقائد سے مکمل وابستگی کے باوجود تعمیر و ترقی کے نئے وسیلوں کا خیر مقدم کیا۔ تنگ نظری، جہالت، خود فریبی اور بے عملی کے عذاب سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ جذباتی مسئلوں سے حتی الامکان دور رہے۔ اکیسویں صدی کی دہلیز پر ہمارے اجتماعی کردار اور رویوں کے بارے میں جو باتیں ہر طرف کہی جا رہی ہیں، وہ سب کی سب غلط تو نہیں ہیں۔ ہماری انیسویں صدی شاید بیسویں اور اکیسویں صدی سے بہت آگے تھی! ہمیں اس کے کھوئے ہوئے سرے کو پھر سے پانے کی کوشش کرنی ہوگی۔

دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

استاد بسم اللہ خاں صاحب

برسوں پہلے مغربی بنگال کے نامور پولس افسر اور معروف اردو شاعر عین رشید نے استاد بسم اللہ خاں پر ایک دستاویزی فلم بنائی تھی۔ اس فلم میں خاں صاحب کے ساتھ ساتھ ان کے شہر بنارس کی حیثیت بھی مرکزی تھی۔ خان صاحب آج بھی اسی شہر کی ایک گلی میں رہتے ہیں:

اک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

(احمد فراز)

خان صاحب جو ایک بھرے پرے گھر اور خاندان کے ساتھ رہتے ہیں ان دنوں بیمار ہیں، بے بس ہیں اور بے سہارا ہیں۔ زندگی کے اس موڑ پر جب انھیں اپنی ثقافتی وفنی خدمات اور کمالات پر مطمئن، آسودہ اور شاد کام ہونا چاہیے تھا، انھیں فکر معاش نے گھیر رکھا ہے۔ انھیں جب بھارت رتن کا اعزاز دیا گیا تو پہلی بات جو ان کے ذہن میں آئی، یہ تھی کہ اس اعزاز کے ساتھ انھیں کچھ اقتصادی امداد بھی ملے گی یا نہیں۔ خاں صاحب نے شہنائی جیسے ساز کو شادی بیاہ کے روایتی منڈپ سے نکال کر موسیقی کی دنیا میں غیر معمولی اعتبار اور امتیاز کے مرتبے تک پہنچایا۔ وہ اس انڈو مسلم تہذیبی روایت کے سب سے بڑے ترجمانوں میں ہیں، جس نے حضرت امیر خسرو

سے لے کر آج تک ایک شاندار ثقافتی سلسلے کو قائم رکھا ہے۔ پیرانہ سالی کے باوجود آنکھوں میں بچوں کی جیسی نرمی اور شوخی، باتوں میں بلا کا بھولا پن، صوم وصلوٰۃ کے پابند، اسی کے ساتھ ساتھ موسیقی میں عبادت جیسا انہماک۔ ایک دنیا ان کے فن پر سر دھنتی ہے۔ ان کے قدرداں مشرق ومغرب کے کئی ملکوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کئی مرتبہ انھیں بڑی بڑی مراعات کی پیش کش ہوئی، وہ چاہتے تو کہیں بھی جا کر بس جاتے اور سکھ چین سے بسر کرتے۔ مگر خاں صاحب کی شخصیت میں درویشی اور سادگی کے اوصاف کے علاوہ اپنے وطن سے محبت کا جذبہ بھی اتنا شدید ہے کہ وہ کہیں جانے پر رضامند نہیں ہوئے۔ لوگوں نے بہت اصرار کیا تو خان صاحب نے کہا ٹھیک ہے، ہم چلے چلیں گے بشرطیکہ اس شہر کی گنگا جمنی تہذیب اور گنگا کا کنارہ بھی ساتھ چلے جس نے دنیا بھر میں صبح بنارس کا چراغ جلا رکھا ہے۔ خاں صاحب اپنی بیماری اور خستہ حالی سے زیادہ افسردہ اس بات پر ہیں کہ پردھان منتری کوی اٹل بہاری واجپئی نے ان سے ان کے پوتے کے نام ایک پٹرول پمپ الاٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا، یہاں تک کہ ایک تاریخ بھی طے کردی تھی کہ اس وقت تک وعدہ پورا ہو جائے گا، مگر بات جہاں کی تہاں رہی:

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا

کوئی سال بھر پہلے خاں صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انصاری آڈیٹوریم میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ پھر آئیں گے۔ ہم ان کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعا کرتے ہیں اور اس شام کی راہ دیکھ رہے ہیں جب خاں صاحب اپنی شہنائی کے ساتھ ایک بار پھر ہمارے ساتھ ہوں گے۔ خاں صاحب کی حالیہ علالت کی خبر پھیلی تو ان کے ایک مداح ایک ایئر کنڈیشنر کی سوغات نذر کرنے کے لیے ان کے پاس جا پہنچے تاکہ خاں صاحب کو گرمی کے عذاب سے چھٹکارا ملے۔ گویا کہ وہی ملکہ فرانس میری انتوائنت والا مضمون کہ ''روٹی نہیں ملتی تو کیک کھائیں!'' کیا واقعی ہم ایک ایسی دنیا کے باسی ہیں جو نرم و نازک احساسات سے یکسر عاری ہو چکی ہے!

بے زبانی زباں نہ ہو جائے!

ابھی حال میں ملکہ پکھراج کی آپ بیتی کا انگریزی ترجمہ Song Sung True کے نام

سے "کالی فار ویمن" نے شائع کیا ہے۔ یہ خوبصورت ترجمہ رام جس کالج، دہلی یونیورسٹی میں تاریخ کے سابق استاد اور مشہور مورخ سلیم قدوائی نے کیا ہے جو ہندوستانی موسیقی کے عاشق بھی ہیں اور ان دنوں بیگم اختر کی سوانح مرتب کر رہے ہیں۔ ملکہ پکھراج کی داستان حیات ایک زبردست آزمائش اور انسانی جد و جہد کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے پس منظر پر کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے اور اپنی پیدائش سے لے کر آج تک کے حالات کا بیان بہت سچائی اور بے تکلفی کے ساتھ کیا ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ والیٔ کشمیر کے دربار سے وابستگی، پھر اپنی شادی، شوہر اور بچوں کے معاملات، مسلسل بنتے بگڑتے حالات، بدلتے ہوئے انسانی تعلقات اور اپنی موجودہ حالت کی تصویریں ملکہ پکھراج نے اس خوبی کے ساتھ مرتب کی ہیں کہ ایک عجیب و غریب دنیا اور اس سے بھی زیادہ حیران کر دینے والی زندگی کا تماشا سلسلے وار بنتا گیا ہے۔ بقول فراق:

کبھی اداس، کبھی شادماں، کبھی گمبھیر!

اصل میں خودنوشت کے لیے بڑے واقعات اور بڑے تجربوں سے زیادہ ضروری شخصیت کا کھراپن اور دیانت داری ہے۔ اس لحاظ سے ملکہ پکھراج کی خودنوشت دیس بدیس کی بہت سی مشہور اور ممتاز شخصیتوں کی خودنوشت سے کہیں زیادہ دلچسپ اور قابل قدر ہے۔ ملکہ پکھراج نے یہ خودنوشت اپنی مادری زبان ڈوگری سے شرابور اردو میں بہت بکھری ہوئی یادداشتوں کے طور پر قلم بند کی تھی۔ سلیم قدوائی نے اپنی طرف سے کوئی ترمیم و اضافہ کیے بغیر پورے مسودے کو اس سلیقے کے ساتھ منظم کیا ہے کہ ایک انتہائی مربوط کہانی بن گئی ہے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ اور شوہر کی بیماری اور انتقال کا قصہ ملکہ پکھراج نے تمام ضروری جزئیات کی مدد سے اس طرح پیش کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ایک پکچر گیلری سی کھل جاتی ہے۔ سلیم قدوائی نے ترجمے کی زبان اور اس کے اسلوب و آہنگ میں کسی طرح کی بناوٹ اور تکلف کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی۔ سادگی سے مالا مال زبان اور فطری انداز بیان نے اس کتاب کو ایک خوبصورت لسانی مرقعہ بنا دیا ہے۔ ہم اس کتاب کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ بیان کردہ واقعات اور اشخاص کو دیکھتے بھی جاتے ہیں۔ ملکہ پکھراج کی طاقت ور مترنم اور مستحکم آواز کی طرح ان کی یہ خودنوشت بھی ہمیں سنگیت کے ایک پیچیدہ سُر اور سناٹے کو چاک کرتی ہوئی کسی راگ مالا سے دو

چار کرتی ہے۔ ہر اعتبار سے ایک قیمتی کتاب جسے پہلی فرصت میں پڑھا جانا چاہیے۔ سلیم قدوائی کا بیان ہے کہ ملکہ پکھراج کی تحریر کو انگریزی میں منتقل کرتے وقت، اکثر وہ ان کا کوئی کیسٹ بھی آن کر دیتے تھے، تا کہ ہمارے زمانے کی سب سے مانوس اور مترنم آوازوں میں سے اس آواز کا کچھ جادو بھی ان لفظوں میں جذب ہوتا جائے۔ سازِ ہستی کی صدا غور سے سن!

ابوالفیض سحر

اردو گھر میں تقریباً دن بھر ہم ساتھ رہے۔ اس روز اتفاق سے عینی آپا بھی وہاں آ گئی تھیں۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا، باتیں کیں، ابوالفیض سحر حسب معمول خاموشی اور توجہ کے ساتھ عینی آپا کی باتیں سن رہے تھے۔ سہ پہر کو ایک دوسرے سے رخصت ہوتے وقت کسے خبر تھی کہ یہ دن ابوالفیض سحر کی زندگی کا آخری دن ہے۔ اس ملاقات کے اگلے ہی دن وہ چپ چپاتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وہ بہت کڑھی ہوئی، شائستہ اور ملائم شخصیت کے مالک تھے۔ حیدر آباد کی نرم آثار، نستعلیق اور مرتب تہذیب کی جیتی جاگتی مثال۔ پچھلے بیس بائیس برسوں کے تعلق میں مجھے ایک بھی ایسا دن یاد نہیں جب ابوالفیض سحر کی شخصیت کبھی بے قابو ہوئی ہو یا انھوں نے کسی کا دل دکھایا ہو۔ بلا کے محنتی انسان تھے۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ جب سنیے اردو کی باتیں۔ کسی کے بارے میں کوئی ناروا لفظ ان کی زبان پر کبھی نہیں آیا۔ لڑکپن سے جوانی تک کا زمانہ آزمائشوں سے بھرا ہوا تھا لیکن سحر صاحب صحیح معنوں میں سیلف میڈ آدمی تھے۔ ترقی اردو بورڈ کے پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ پھر اپنے آپ کو پوری طرح اردو کے لیے وقف کر دیا۔ اردو کے مسائل پر غور کرتے رہے۔ لکھتے پڑھتے رہے اور اسی حال میں رخصت ہو گئے:

قرض جتنے تھے گویا ادا ہو گئے

دلی کی ادبی محفلوں میں ان کی کمی کا احساس ان کے دوستوں کو مدتوں پریشان رکھے گا:

بلا کی چمک اس کے چہرے پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

(احمد مشتاق)

لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیل غم

بھیشم ساہنی

رفتید و لے نہ از دلِ ما!

نازک اور پاکیزہ خدوخال والے، سلوٹوں سے بھرے ہوئے اس چہرے میں کوئی تو بات ایسی تھی کہ دیکھنے والوں میں طمانیت اور اداسی کا احساس ایک ساتھ جگاتی تھی۔ بھیشم ساہنی نے بہت خاموش طبیعت پائی تھی۔ اپنے بڑے بھائی بلراج ساہنی کے مقابلے میں صحت اور قد و قامت کے لحاظ سے بظاہر وہ کمزور ٹھہرتے تھے۔ مگر ان کی شخصیت میں ایک اندرونی طاقت تھی جس نے انھیں نہ تو جسمانی کمزوری سے زیر ہونے دیا، نہ اس ملک اور ماحول میں روز بروز بڑھتی ہوئی تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے سیلاب سے۔ وہ بہت نرم مزاج، سیدھے بھاؤ والے، متین اور شرمیلے انسان تھے۔ بالعموم اپنے آپ میں گم اور شہرت، مقبولیت اور توجہ کی دھوپ سے بہت جلد پریشان ہو جانے والے۔ میں نے فیض احمد فیض سے متعلق ایک ٹیلی ویژن ریکارڈنگ میں انھیں شرکت کی دعوت دی تو بغیر کسی اصرار کے راضی ہو گئے اور معینہ وقت پر ETV کے اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ فیض صاحب سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ پھر سب سے بڑا رشتہ تو یہ تھا کہ دونوں کے خواب اور رویے مشترک تھے۔

جب کھلی تیری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی

دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم

ریکارڈنگ کے دوران بھیشم جی نے نہ تو فیض سے اپنے تعلق کے اظہار میں کسی مبالغے کا اظہار کیا، نہ ان کی شاعری سے باخبری کا دعویٰ کیا۔ فیض صاحب سے ان کا بہت قریبی تعلق تھا اور اردو وہ خوب اچھی طرح لکھ پڑھ سکتے تھے۔ لیکن انھیں ایسی ہر بات اور ہر تذکرے سے حجاب تھا جس سے ان کی اپنی کسی خوبی یا بڑائی کا پہلو نکلتا ہو۔ ان کے سیریل 'تمس' کو جو بے مثال مقبولیت ملی اور ان کی کہانیاں ناول و ڈرامے جس ذوق وشوق کے ساتھ پڑھے گئے ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو آپے میں نہ رہتا۔ لیکن بھیشم جی میں حیاداری، انکسار اور شخصی وقار کا احساس بھی بہت گہرا تھا۔ ان کی تحریروں کے علاوہ ان کی فلموں کو دیکھتے ہوئے بھی یہی تاثر مرتب ہوتا ہے۔

ایک بار شملہ کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز میں ان سے ملاقات ہوئی اور کئی دن ساتھ گزرے۔ وہاں وہ فیلو کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کی اہلیہ شیلا جی بھی ساتھ تھیں۔ دونوں میں غیر معمولی مناسبت اور ہم آہنگی تھی، اتنی کہ ایک دوسرے کے بغیر دونوں آدھے ادھورے سے لگتے تھے۔ کچھ عرصے پہلے شیلا جی کا انتقال ہو گیا تو بھیشم جی بجھ سے گئے۔ اپنے نجی غم کا ذکر تو نہیں کرتے تھے مگر آنکھیں ویران ہو گئی تھیں اور وہ پہلے سے زیادہ چپ رہنے لگے تھے۔ دوسری طرف اس دنیا کا غم جس کی پرچھائیاں ان کی کتابوں میں ڈولتی پھرتی ہیں۔ تقسیم اور فسادات کے تجربے سے براہ راست دو چار ہونے کے بعد بھی ان کے یہاں کسی طرح کی کڑواہٹ، مایوسی اور بیزاری پیدا نہیں ہوئی۔ ظلمت پسندی کے خلاف سینہ سپر رہنا انھوں نے اپنے فلسفۂ حیات اور ایقانات سے سیکھا تھا اور ہر حال میں اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا ان کی سرشت کا حصہ تھا۔ ہماری دنیا کو ان کی ضرورت آج ہمیشہ سے زیادہ ہے:

ہے مکرر لب ساقی پہ صلا تیرے بعد!

اے ہمالہ اے فصیل کشورِ ہندوستان

کاٹھ گودام سے رام گڑھ تک کا راستہ، سبز پوش پہاڑوں اور اونچے اونچے پیڑوں کی دورویہ قطار کے بیچ سے گزرتا ہوا، بہت لمبا نہیں ہے۔ موٹر کار سے جائیں تو کوئی گھنٹے بھر کا سفر۔ لیکن سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک، چڑھائی اور پیچ نے پیدل چلنے والوں کے لیے اسے خاصا

مشکل اور حوصلہ طلب بنا دیا ہے۔ پھر بھی روایت یہی ہے کہ گرو دیو ٹیگور نے یہ ساری مسافت پیدل ہی طے کی تھی۔ ان کی ایک بیٹی، جو تپ دق کی مریضہ تھیں، صحت کی بحالی کے لیے وہاں لے جائی گئی تھیں۔ شوالک پہاڑیوں کے سرسبز سلسلے میں گھری ہوئی جس مسطح اور ہموار جگہ کا گرو دیو نے انتخاب کیا اس کے پیچھے، تا حد نگاہ، ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ جگہ عام طور پر بادلوں میں گھری رہتی ہے۔ یہاں ہر وقت ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ جا بجا پھل دار درختوں کے جھرمٹ ہیں اور چشمے ہیں۔ قصبے میں کوئی بازار نہیں ہے۔ بس دو تین دکانیں ہیں اور ایک ٹیلی فون بوتھ۔

نینی تال سے رام گڑھ کی دوری تقریباً بیس کلو میٹر ہے۔ بھوالی بارہ کلو میٹر کے فاصلے پر۔ مادھو راؤ سندھیا، والیِ گوالیار نے کئی سو ایکڑ علاقے میں سیب، آڑو، خوبانی، ناشپاتی، بگو گوشے اور آلو بخارے کے پیڑ لگوا دیے تھے۔ ایک وسیع و عریض عمارت، پھلوں کے لیے ایک اسٹور، عمارت بہت سے کمروں اور برآمدوں پر مشتمل۔ یہاں سے گرو دیو ٹیگور سے منسوب ٹیگور ٹاپ کی چوٹی نظر آتی ہے۔ ان کے بنوائے ہوئے مکانات کھنڈر بن چکے ہیں۔ لیکن وہ خوبصورت جگہ آج بھی فطرت سے ان کے والہانہ تعلق اور ان کے ہمہ جہتی شعور کی گواہی دیتی ہے۔

مہاتما گاندھی بین الاقوامی ہندی یونیورسٹی، واردھا نے مہاراجہ سندھیا کی عمارت عاریتاً لے رکھی تھی جہاں ہندوستان کے مختلف صوبوں تمل ناڈو، مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک، راجستھان، مدھیہ پردیش، پنجاب، ہریانہ، دلّی کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ جمع ہو گئے تھے۔ ایک ریفریشر کورس کا اہتمام تھا۔ ڈاکٹر اپوروانند اس کے کوآرڈی نیٹر تھے۔ عام روش کے برعکس یہاں ہندی پڑھانے والے اساتذہ کے لیے اردو ہندی کے تہذیبی اور لسانی رشتوں، امتیازات، اختلافات، ان زبانوں کے تاریخی سماجیاتی، فکری اور نظریاتی پس منظر پر اردو زبان و ادب، تاریخ، سیاسیات، لسانیات، ثقافت اور تہذیب سے متعلق لیکچرز کی منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ ان لیکچرز کے لیے مہادیوی ورما ہندی سنگر ہالیہ کے خوبصورت ہال کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مہادیوی ورما نے زندگی کا بیشتر حصہ الٰہ آباد میں بسر کیا، یہاں رام گڑھ میں ہمالہ پربت کے زیر سایہ انھوں نے ایک مکان اور ایک چھوٹا سا اسکول بنوالیا تھا جہاں وہ اپنی گرمیاں گزارتی تھیں۔ مکان اپنے قیام کے لیے، اسکول آس پاس کے دیہات میں رہنے والے بچوں کے لیے۔ کیسی

ستھری، شفاف، فطرت کے مظاہر سے مالا مال جگہ انھوں نے چنی تھی۔ سچ مچ زمین بہت خوبصورت ہے۔ انسان نے اس کے حسن کو غارت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مگر رام گڑھ پر ابھی انسان ضعیف البنیان کی مادی ہوس اور بدمذاقی کا جادو نہیں چلا ہے۔ یہاں آج بھی فطرت خود مختار اور مخیر دکھائی دیتی ہے۔

کس قدر پیاری زباں اور کتنی دکھاری زباں!

اردو کلچر، لسانی اور ادبی روایت، رسم الخط سے وابستہ مسئلوں پر ہندی کے اساتذہ سے بات چیت بہت دیانت دارانہ اور بےتپاک ماحول میں ہوئی۔ دونوں زبانوں کے بیچ ایک دوسرے سے بےخبری کی خلیج حائل ہے۔ جھوٹے پندار کی مداخلت کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے ہیں۔ پھر بھی، مجھے اپنے لیکچرز اور اساتذہ سے گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ اب بہت سے ہندی والے ہندوستان میں سیاست کی زبان اور زبان کی سیاست دونوں کا بھید سمجھنے لگے ہیں۔ سیاسی، تہذیبی، مذہبی، یہاں تک کہ لسانی فرقہ پرستی کے آشوب سے عاجز آچکے ہیں۔ ہٹ دھرموں کی بات اور ہے ورنہ ہندی والوں میں رفتہ رفتہ ایک ایسا حلقہ وسیع اور مستحکم ہو رہا ہے، جو اردو کو اس کے تشخص کے ساتھ قبول کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایک دوسرے سے استفادے کے بغیر نہ تو اردو کے حقوق ادا کیے جاسکتے ہیں نہ ہندی کے۔ اردو اور ہندی میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر ان میں سے کسی کی تکمیل ممکن نہیں۔ لیکن آزادی کے بعد سے مختلف کانگریسی اور غیر کانگریسی حکومتوں نے اردو کا جو حشر کیا ہے وہ سامنے ہے۔ بی جے پی کے اقتدار نے میڈیا سے اور تعلیمی اداروں سے اردو کو جس ہوشیاری کے ساتھ بے دخل کیا ہے اس کی ایک علاحدہ تفصیل ہے۔ کچھ اصحاب یہ فرماتے ہیں کہ بس رسم الخط بدل دو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہم صرف کھال کھینچیں گے باقی سب کچھ جوں کا توں رہے گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کی کسی اور زبان کو کنڑ، تمل، تیلگو، سندھی، گجراتی، بنگالی، پنجابی، کسی کو بھی قومی یک جہتی کے نام پر دیوناگری لپی اپنانے کا مشورہ نہیں دیتے۔ ایک زندہ، توانا، خوبصورت زبان کس طرح قتل کی جاتی ہے، یہ کوئی ہمارے سیاست دانوں سے سیکھے۔ ایسے لوگ جو اردو کے لیے موجودہ ماحول کو اور حکومت کی مالی امداد کو کافی اور شافی سمجھتے ہیں، شاید احمقوں کی

جنت میں رہتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام لوگوں میں اردو سے فاصلہ کم ہوا ہے اور صدیوں کے پالے پوسے تعصبات میں تخفیف ہوئی ہے۔ پھر بھی، اردو والوں کے لیے منصوبہ بند طریقے سے اردو کے تحفظ کا سامان مہیا کرنا اور عملی اور کارگر تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان صرف حکومت کی امداد اور دوسروں کی نیک اندیشی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی:

یہ گھڑی محشر کی ہے، ہم عرصۂ محشر میں ہیں!
ہمارے دفتر میں کچھ عمل بھی ہونا چاہیے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

دانش مند لوگ اور دنیا کا تجربہ رکھنے والے کہتے ہیں کہ جذباتی ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن زندگی میں کبھی کبھی ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں جذباتی نہ ہونا سیدھی صاف سنگ دلی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں ہماری اجتماعی زندگی میں یہ موڑ دو بچوں کے واسطے سے آیا۔ ان میں ڈھائی برس کی بچی تھی، نور فاطمہ۔ دوسرا ایک تیرہ سال کا بچہ منیر۔ نور فاطمہ اپنے والدین کے ساتھ سرحد پار سے ہندوستان آئی تھی۔ منیر اکیلا بھٹکتا پھرتا ہندوستان کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ ان دونوں بچوں پر یہاں محبت کی ایسی بارش ہوئی کہ ہماری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ کاش ہم صرف جذباتی ہی رہ جاتے۔ اس نام نہاد دانش مندی اور ہوشیاری سے اپنا دامن بچائے رکھتے جو دو پڑوسی ملکوں کے مابین صرف دوری اور مجبوری کا سبب بنتی ہے۔

آزادی ملے چھپن برس ہونے کو آئے اور ہمیں کیسی داغ دار، ڈراؤنی، بے چین رکھنے والی آزادی ملی ہے۔ اس دل دوز آزادی کے پیچھے ہمیں آزادی کے جو تماشے دکھائی دیتے ہیں ان میں سے کچھ اس طرح ہیں:

1۔ ہمارے سیاست دانوں کو اقتدار کے لالچ نے سیاست کے نام پر ہر طرح کے جوڑ توڑ، منافقت، سازش، مکاری کی آزادی دے رکھی ہے۔

2۔ ہمیں تاریخ کا حساب درست کرنے کے نام پر عبادت گاہیں ڈھانے، نفرت پھیلانے، اقلیتوں کے خلاف اشتعال دلانے، ترشول بانٹنے، فساد برپا کرنے، مارنے، زندہ جلانے اور دل دکھانے کی آزادی ہے۔

3 ہمارے تعلیمی اداروں کو کاروبار کا مرکز بنانے، طالب علموں کو ہڑبونگ مچانے، استادوں کو منہ چڑھانے اور طرح طرح کے دھندے چلانے کی آزادی ہے۔

4۔ ہماری حکومت کو ایسی تعلیمی پالیسی اپنانے کی آزادی ہے جو تہذیب، تاریخ، اخلاق اور اقدار کی سمت بدل کر رکھ دے۔ جو مستقبل کو ماضی بنانے کے درپے ہو اور وقت کے پہیے کو الٹی طرف چلانے پر مصر ہو۔

5۔ بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس کو جب اور جتنا بھی جی چاہے اول فول بکنے کی آزادی ہے۔

پچھلے چھپن برسوں میں ہم نے بہت کچھ کھو دیا۔ بے شک کچھ باتوں میں اور چیزوں میں بڑھوتری بھی آئی ہے۔ مثلاً—

☆ سیاست دانوں میں جھوٹ بولنے، کہہ کر مکر جانے، باتیں بنانے کا چلن بڑھا ہے۔

☆ غریبی اور امیری کا فرق بڑھا ہے۔

☆ بے حیائی اور بے شرمی بڑھی ہے۔

☆ ہوا، پانی، پیداوار اور فصلوں میں آلودگی بڑھی ہے۔

☆ ملاوٹ اور بے ایمانی بڑھی ہے۔

☆ ظلم و زیادتی اور شقاوت بڑھی ہے۔

لیکن بدی کی یہ تمام طاقتیں، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، نور فاطمہ اور منیر جیسے بچوں کے سامنے بھی بے بس اور کمزور نظر آتی ہیں۔ کسی نے کہا تھا، کھرا جذبہ اور کھری آگہی یا عقل مندی میں کوئی بیر نہیں، کوئی دوری نہیں۔ یہ چھوٹی سی بات گرہ میں باندھ لی جائے تو دور رس نتیجوں کا سبب بھی بن سکتی ہے!

مرے مکان سے دریا دکھائی دیتا ہے

دریا بلکہ اتھاہ، گہرے، نیلگوں پانی کی سطح سے سر اٹھائے، ہزاروں میل دور بحرِ ہند میں موریشس ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ بہت صاف شفاف، بہت پرسکون، بہت خوبصورت! موریشس میں ایک کہاوت مشہور ہے۔ اس کائنات کے خالق نے جب جنت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو فرشتوں سے کہا ''جاؤ موریشس نامی جزیرے کو دیکھو اور ویسی ہی ایک جگہ بنا دو!''

موریشس میں دھنک کے سات رنگوں کی زمین ہے۔ مشکل سے چالیس میل لمبا اور تیس

میل چوڑا جزیرہ جہاں ہندو، مسلمان، عیسائی، بودھ، ہندوستانی، انگریز، فرانسیسی، افریقی، چینی، ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ آباد ہیں۔ پانچ بڑی زبانوں، انگریزی، فرانسیسی، اردو، ہندی، مقامی زبان کریول کے علاوہ نصف درجن سے زائد بولیاں بولی جاتی ہیں۔ وہاں فوج نہیں ہے اور موریشس جیسے ننھے منے ملک کے ساٹھ پیسے ہمارے سو پیسوں کے برابر ہیں۔ اب سے بارہ برس پہلے موریشس میں پہلی عالمی اردو کانفرنس ہوئی تھی۔ اگست کے پہلے ہفتے میں دوسری عالمی اردو کانفرنس کا ہنگامہ رہا۔ ہمیں اتفاق سے ان دونوں تقریبات میں شرکت کا موقعہ ملا۔ اس لیے اردو اور اردو کی جنم بھومی ہندوستان کے حوالے سے ایک خاص بات جو سامنے آئی اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے۔

پہلی کانفرنس میں ہندوستان سے اردو ادیبوں کا ایک بہت بڑا اور نمائندہ وفد بھیجا گیا تھا اس کا نقشہ بھی خوب جما تھا اور ہندوستانی ہائی کمیشن ہر تقریب میں پیش پیش تھا۔ اس بار ہماری حکومت اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز نے اردو والوں کو بس ایک سہ رکنی وفد پر ٹرخا دیا۔ اس بھاری بھرکم وفد کے سربراہ گورنر کیرالہ، جناب سکندر بخت تھے! اسے موجودہ حکومت کے دور میں اردو کی بدبختی ہی کہنا چاہیے کہ اس سے زیادہ کچھ کرنے سے ہماری سرکار نے پلہ جھاڑ لیا۔ پہلی کانفرنس کانگریس کے دور اقتدار میں برپا ہوئی تھی۔ بقول ارندھتی رائے کانگریس شرما شرمی میں اگر کچھ کرتی نہ تھی تو کرنے کا سوانگ تو رچاتی تھی۔ مگر بی جے پی جو بھی کرنا چاہتی ہے ڈھٹائی کے ساتھ کرتی ہے۔ چنانچہ گورنر سکندر بخت صاحب دو اصحاب کا نمائندہ وفد لے کر چلے گئے۔ باقی اردو کے تمام ادیب اور اساتذہ جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے ان کے سفر کا کچھ بندوبست یا تو کانفرنس کے منتظمین نے کیا تھا، یا پھر خود ان اصحاب نے اپنی جیب سے یا ایسے متعلقہ اداروں کی مدد سے۔ کانفرنس میں روس، امریکہ، انگلستان، جرمنی، پاکستان کے مندوبین بھی تھے۔ ہندوستان کی سرکاری نمائندگی بہت پھس پھسی تھی اور بدقسمتی سے مذاق کا نشانہ بھی بنی۔ سکندر بخت صاحب دلی والے ہیں اور شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مگر کچھ تو ان کے حافظے کا قصور، کچھ ان کی افتتاحی تقریر کی بے موقعہ طوالت۔ وہ مصحفی، جگر، جوش کو ہم عصر بنا بیٹھے اور ایک قصے میں انھیں ایک ساتھ کھینچ لائے۔ نتیجہ ظاہر ہے!

پروفیسر سروپ سنگھ

دلی اپنے اس ہونہار، زندہ دل، انتہائی شائستہ اور شگفتہ مزاج فرزند سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔ پروفیسر سروپ سنگھ انگریزی کے پروفیسر، دلی یونیورسٹی کے مقبول خاص و عام وائس چانسلر اور دو ریاستوں کے گورنر رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی ایک حیثیت اردو سے محبت کرنے والے اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے ایک سرپرست کی بھی تھی۔ اردو زبان و ادب سے سچا شغف رکھتے تھے اور اردو والوں کو بہت محبوب تھے۔ ان میں اردو والوں کی شائستگی اور رواداری اور انگریزی روایات کے تربیت یافتہ بزرگ کی وسیع المشربی کے ساتھ ساتھ ایک عجیب وغریب دل نواز سادگی اور کھرا پن بھی تھا، شاید ہریانہ کی زرخیز اور ہری بھری سرزمین سے نسبت کے باعث۔ ہم شام کے اوقات میں جنوبی دلی کی فرینڈس کالونی اور مہارانی باغ کے بیچ سے گزرنے والی، دورویہ گھنے، پرانے درختوں کے سائے میں سانس لیتی ہوئی جس سڑک پر ٹہلتے ہیں، اکثر راہ چلتے پروفیسر سروپ سنگھ کا ساتھ ہو جاتا تھا۔ زندہ دلی کی باتیں کرتے تھے، بہت تیز چلتے تھے، دماغ بھی اتنا ہی تیز چلتا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا اور ان سے باتیں کرنا بھی ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ جامعہ ملیہ کے شعبۂ انگریزی میں برسوں پہلے ہر ہفتہ شیکسپیئر پر لیکچرز دینے کے لیے آتے تھے۔ ہم سب طالب علمانہ ان کے گرد حلقہ بنا لیتے۔ افسوس کہ ایسی باغ و بہار دل نواز شخصیت چیختی چنگھاڑتی اور مرجھاتی بسورتی دلی سے رخصت ہوگئی:

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں!

سانجھ بھئی چوندیس

چل خسرو گھر آپنے!

کیسی پرکشش، دلآویز اور رنگا رنگ شخصیت تھی۔ شمع محفل کی طرح ہر بزم کی رونق اور خاص و عام کے لیے مرکز نگاہ۔ پروفیسر علی محمد خسرو کی جیسی باکمال اور شیریں مقال ہستی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ وہ جب تک ہمارے درمیان تھے اس سے زیادہ اہم اب اس وقت نظر آتے ہیں جب کہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے ہیں۔ خسرو صاحب کے مزاج میں ان کی غیر

معمولی ذہنی صلاحیتوں کے باوجود ایک عجیب وغریب سادگی تھی۔ دوستوں میں ہوں یا اجنبیوں میں، خسرو صاحب بہت جلد لوگوں میں گھل مل جاتے تھے اور پل بھر کے لیے بھی کسی کو یہ احساس نہیں دلاتے تھے کہ وہ کتنی قیمتی اور کمیاب خوبیوں سے آراستہ شخصیت کے مالک ہیں۔

ہم نے سب سے پہلے انھیں علی گڑھ میں دیکھا، آج سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے جب وہ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر کی حیثیت سے اسٹاف کلب کے سبزہ زار میں اساتذہ کو خطاب کر رہے تھے۔ ان کی موہنی شخصیت، کھنکتی ہوئی پرشوق آواز، انگریزی اور اردو، دونوں زبانوں پر ان کی ماہرانہ گرفت اور ان کی گفتار کا جادو، سننے والے کسی مزاحمت کے بغیر مسحور ہو گئے۔ علی گڑھ جو بڑی سے بڑی سنگلاخ زمینوں کو ہموار کرنے کی ایک انوکھی صلاحیت رکھتا ہے، خسرو صاحب کا استقبال وہاں دل کھول کر کیا گیا۔ طلبا، اساتذہ، کارکن، مسلک و مذہب، قبیلے، گروہ اور عمر کی کسی تفریق کے بغیر خسرو صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ خسرو صاحب کو خوشبو کی طرح ہوا میں گھل جانے کا ہنر آتا تھا۔ انھیں ہزاروں لطیفے، قصے، اشعار یاد تھے۔ ان کی حاضر دماغی اور طباعی بے پناہ تھی۔ مشکل اور تناؤ سے بھرے ہوئے ماحول میں بھی وہ اپنی مکالمے کی طاقت، خوش کلامی اور ذہانت کی مدد سے قابو پا لیتے تھے۔ اس لیے خسرو صاحب جہاں بھی اور جس منصب پر بھی فائض رہے، نیک نام رہے۔ ایک معلم کی حیثیت سے انھوں نے جو شہرت پائی تھی، اقتدار کے مراکز سے قربت کے بعد بھی قائم رہی۔ خسرو صاحب سرکاری اداروں کی سربراہی سے لے کر اعلیٰ سطحی منصوبہ بندی اور سفارت کاری تک، ہر جگہ سرخرو اور کامیاب رہے۔ ان کے لیے ہر مشکل آسان تھی۔

خسرو صاحب کا تعلق ایک ایسے ممتاز گھرانے سے تھا جہاں دنیوی امتیازات، تصوف اور تعلیم کی روایات کو یکساں ترقی ملی۔ دربار سے لے کر بازار تک، خسرو صاحب کے لیے دنیا کا کوئی بھی گوشہ نامانوس نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ''منجملۂ خاصان میخانہ'' رہے، لیکن ان کے مزاج کی جمہوریت اور سادگی نے انھیں ہر حلقے میں مقبول و محبوب بنائے رکھا۔ جس سہولت کے ساتھ خسرو صاحب حکومت کے اعلیٰ ایوانوں میں اپنا وقت گزارتے تھے، اسی سہولت اور سادگی کے ساتھ بستی حضرت نظام الدین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرپیچ گلیوں میں بھی دکھائی دیتے تھے۔ ان کی شفاف اور کشادہ پیشانی ان کے ظرف کی وسعت کا پتہ بھی دیتی تھی۔

ہماری مجلسی اور تہذیبی زندگی مین خسرو صاحب کے مقام و مرتبے تک بہت کم لوگ پہنچے ہیں۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی اور جن آنکھوں نے خسرو صاحب کو دیکھا ہے ان میں خسرو صاحب کے پاکیزہ، متبسم اور روشن چہرے کا عکس ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

یہ کیسا رنگ منچ ہے؟

حبیب تنویر ہندوستان تھیٹر کی روایت میں آج ایک علامت اور ایک افسانوی حیثیت کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ برسوں پہلے، گریش کرناڈ کی سربراہی میں سنگیت ناٹک اکیڈمی نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے یادگار کھیلوں کا ایک سلسلۂ باز دید ترتیب دیا تھا۔ اندھا یگ، گھاسی رام کوتوال، آدھے ادھورے، چکر ویوہ، ہیاودن جیسے ناٹکوں کی اس رنگ مالا میں حبیب تنویر کے آگرہ بازار کی وساطت سے اردو تھیٹر کی نمائندگی کا اہتمام بھی ہوا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور سوانح پر مبنی یہ ڈراما ہماری جمہوری قدروں اور ہماری اجتماعی زندگی کو مستحکم کرنے والی روشن خیالی، رواداری اور وسیع المشربی کی روایتوں کا آئینہ بھی ہے۔ اپنے چھتیس گڑھی تھیٹر گروپ کے ساتھ حبیب تنویر نے ان روایتوں کو نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا بلکہ ہندوستان سے یورپ کے مختلف ملکوں تک حبیب تنویر اور ان کے ساتھیوں نے تھیٹر کے تماش بینوں سے داد بھی وصول کی۔ انھیں مشرق و مغرب ہر جگہ سراہا گیا۔ ایسے عوامی کلاکار جو اپنے دستخط تک نہیں کر سکتے، حبیب تنویر کی کوششوں سے اعلیٰ ترین اعزازات کے مستحق ٹھہرے۔ تھیٹر عوامی تجربوں، مسئلوں اور ضرورتوں کی ترجمانی کا بہت موثر وسیلہ ہے۔ حبیب تنویر نے اپنے ناٹکوں کے اس رول کو بھی ہمیشہ سامنے رکھا۔ ہر سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ کیا راجیہ سبھا کی رکنیت اور کیا قومی اعزازات اور انعامات، حبیب تنویر کی جہاں دیدہ و سرد و گرم چشیدہ شخصیت پر یہ ساری کامرانیاں سجتی ہیں۔ لیکن ادھر جب سے ہمارے دیس کا ثقافتی اور فکری ماحول بدلا ہے، روشن نظری اور رواداری کی کوئی قدر محفوظ نہیں رہ گئی۔ ونکیا نائیڈو کے اس ہدایت نامے کا پتہ آپ کو بھی ہوگا کہ اب ضرورت تمام سرکاری اداروں اور اکیڈمیوں میں بی جے پی کے ہم خیال دانشوروں کے آگے آنے کی ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کی کھلی چھوٹ کے نتیجے میں تعلیمی اداروں کے علاوہ بھی ہمارے مذہبی اور ثقافتی ادارے جس طرح برباد ہو رہے ہیں،

اس کا کوئی نہ کوئی تماشا آئے وہی سامنے آتا رہتا ہے۔حبیب تنویر کے نئے ناٹک ''پونگا پنڈت'' کو بہانہ بنا کر بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی ذیلی جماعتوں نے بھوپال میں جو طوفان بدتمیزی برپا کیا ہے، اس سے آنے والے دنوں کے لیے ایک سنگین خطرے کی نشاندہی ہوتی ہے۔حبیب تنویر نے جس بے خوفی کے ساتھ اپنے عزم کا اظہار کیا ہے، اس کی قدر کی جانی چاہیے اور اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے مثبت اور صحت مند خیالات رکھنے والے ہر شخص کو اپنی آواز بلند کرنی چاہیے۔ظلم و زیادتی کے لمحے میں چپ رہنا بدی کی طاقتوں کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔بقول ساحرلدھیانوی یہ سلسلہ اگر جاری رہا:

تو یوں سمجھو کہ اس خاکداں کی خیر نہیں!

منشی پریم چند کی آتما کیا کہتی ہوگی؟

کچھ دنوں پہلے منشی پریم چند کی ایک کتاب کو اسکولوں کے نصاب سے خارج کر کے ایک بی جے پی کارکن مردولا سنہا کی کتاب آگے بڑھادی گئی تھی۔ یہ ہنگامہ بہت شور شرابے کے بعد کسی طرح دبا دیا گیا لیکن وہ جو صاحب کردار ہونے کی ایک پہچان ہمارے نئے تعلیمی اور تہذیبی قائدین نے اپنے لیے قائم کرلی ہے، ہماری اجتماعی زندگی میں اس کا عمل دخل روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ادھر منشی پریم چند کے یوم پیدائش کو ساہتیہ دیوس کے طور پر منائے جانے کی تحریک اہل اقتدار نے مسترد کردی۔کہا یہ گیا کہ صرف ایک منشی پریم چند کے اعزاز سے بھارتیہ ساہتیہ کے کئی مہارتھیوں کی حق تلفی ہوگی۔مہاتما گاندھی سے لے کر منشی پریم چند تک، کس کی حرمت کتنی محفوظ رہے گی اس کا جواب ہماری وزارت تعلیم و ثقافت کے پاس ہے یا پھر اس نادرۂ روزگار کے پاس جو نریندر مودی کے طور پر جانا جاتا ہے اور آزادی کی ایک نئی تاریخ لکھنے کے درپے ہے۔دھن کا پورا ہے کام کا پکا۔

کتنے پت جھڑ ابھی باقی ہیں بہار آنے میں

(ایڈورڈ سعید کی یاد میں)

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے اس شخص میں کتنی شخصیتیں ایک ساتھ جمع ہوگئی تھیں۔ ایڈورڈ سعید ایک شخص کب تھے؟ وہ تو سوچنے اور زندہ رہنے کا ایک اسلوب بن چکے تھے۔ ایک سماجی مفکر، ایک موسیقار، دانشور، ادیب، پولیٹکل صحافی اور ایکٹی وسٹ۔ آج کی دنیا میں فلسطینیوں کے حقوق اور ایک آزاد فلسطین کے قیام کی خاطر ایڈورڈ سعید کی آواز شاید سب سے زیادہ موثر اور طاقت ور آواز تھی۔

اس نحیف، بیمار اور ہر لمحہ اپنی یقینی موت کی طرف بڑھتے ہوئے دبلے پتلے شخص کی روح میں کیسی بے مثال توانائی اور روشنی تھی۔ ایڈورڈ سعید پچھلے پندرہ برسوں سے خون کے سرطان میں مبتلا تھے۔ اپنا انجام انھیں معلوم تھا لیکن انھوں نے نہ تو اپنی جان لیوا بیماری سے ہار مانی نہ مغربی سامراج کی ان طاقتوں سے جو ان کے وطن فلسطین کی تباہی کے درپے تھیں۔ یہ طاقتیں حریت فکر کا سوانگ رچانے کے باوجود ایک مظلوم اور مقہور قوم کی آزادی کی تحریک کو دبانے میں سب سے زیادہ سرگرم تھیں۔ اسرائیل تاریخ کی ناجائز اولاد ہے اور امریکہ اس کا سب سے بڑا پاسبان۔ دونوں انسانی وقار اور اعتبار کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

ابھی پانچ برس پہلے راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کی دعوت پر ایڈورڈ سعید ہندوستان آئے تھے۔ فاؤنڈیشن میں اپنے یادگاری خطبے کے علاوہ بھی انھوں نے دلی میں کئی لیکچر دیے۔ موجودہ معاشرے میں دانشوروں کے رول پر ان کا ایک لیکچر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی ہوا۔ ان مواقع

پر علمی اور ادبی دنیا کی بہت سی بڑی شخصیتیں موجود دکھائی دیں۔ ایڈورڈ سعید سب سے مختلف اور ممتاز لگتے تھے۔ بظاہر بہت سادہ، بے ریا، کھلی ڈلی شخصیت، لیکن سراپا دماغ اور روشن بصیرتوں کا پیکر۔ ان کا ذہن اتنا مرتب، شفاف اور دور رس نظر آتا تھا گویا کہ علوم وافکار کی تمام دنیائیں ان کی تابع تھیں۔ ایڈورڈ سعید کے مطالعے کی وسعت اور ان کے ادراک کی حدود انتہا تک ہمارے زمانے کے بہت کم علما پہنچے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا امتیاز ان کے انسانی سروکار تھے اور ذہن وضمیر کی آزادی میں ان کا غیر متزلزل یقین! ایڈورڈ سعید کی کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت اور ینٹلزم (۱۹۷۸ء) کو ملی۔ اس کتاب میں سعید کا موقف یہ ہے کہ ثقافتی اقتدار سیاسی اقتدار ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور سیاسی اقتدار میں توسیع کی ہوس کا ناگزیر انجام ایک طرح کی ثقافتی دہشت گردی ہے۔ سعید کا خیال یہ تھا کہ مشرق کے بارے میں مغربی دنیا کا عام تصور بہیمانہ، کینہ توز، غیر دیانت دارانہ مقاصد پر مبنی ہے۔ مغرب نے مشرق کی ''ایجاد'' ہی اس لیے اور اس طرح کے خطوط پر کی ہے کہ ایک نئی بنائی نو آبادی کو مزید محکوم و مجبور بنایا جا سکے۔ جب تک مغربی سامراج باقی ہے، یہ سلسلہ رکنے کا نہیں۔

سعید کی دوسری مقبول و معروف کتاب کلچر اینڈ امپیریلزم (۱۹۹۳ء) ہے جس میں انھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے بعض ناول نگاروں، مثلاً جین آسٹن، ای ایم فوسٹر، جوزف کونریڈ اور رڈیارڈ کپلنگ کو اپنی تخلیقات کے ذریعے برطانوی سامراج کی بنیادوں کو نظریاتی استحکام بخشنے اور اس سامراج کا جواز مہیا کرنے کا قصوروار ٹھہرایا ہے۔ سعید کا خیال تھا کہ تقریباً تمام یورپی مشرقی دنیا کے معاملے میں متعصبانہ، نسل پرستانہ اور سامراجی مقاصد کے تابع ہیں۔ وہ مشرق کی تصویر کو ہمیشہ مسخ کر کے دکھاتے ہیں۔

اپنی کتاب کوَرنگ اسلام (۱۹۸۱) میں سعید نے یہ دکھایا ہے کہ مغربی علما کس طرح اسلام اور عرب دنیا کی ایک من مانی شبیہ دکھانے کی مسلسل سازش میں سرگرم ہیں۔ بعض مبصروں کا خیال ہے کہ اسلام اور عرب دنیا کی حقیقی صورت حال کا اتنا کھرا اور منصفانہ جائزہ پچھلے پچاس برسوں میں سامنے نہیں آیا۔

ایڈورڈ سعید کی موت سے ہماری فلاکت زدہ دنیا غریب تر ہو گئی ہے۔ اب ایک بھی ایسا شخص دور دور تک دکھائی نہیں دیتا جو مغرب میں رہتے ہوئے مغربی دنیا کے اخلاقی اور فکری

جرائم کا احاطہ ایڈورڈ سعید کی طرح کر سکے۔ سعید کی آواز سے مغربی اقتدار کے در و بام کانپ اٹھتے تھے اور دنیا بھر کے علمی اور ادبی حلقوں میں یہ آواز احترام اور توجہ کے ساتھ سنی جاتی تھی:

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے!

باتیں اس کی یاد رہیں!

(اسرائیل کا چیلنج: ایڈورڈ سعید کی ایک تحریر سے اقتباس)

"پہلا چیلنج یہ ہے کہ ہم اسرائیلیوں سے یہ تسلیم کروائیں کہ اس نے ہم لوگوں کے ساتھ کیا کیا اور دوسرے عربوں کے ساتھ کیا کیا جن کے بیٹوں اور بیٹیوں کو اسرائیل کی جنگوں میں فتوحات میں، فوجی قبضوں میں اور بستیاں بسانے میں قتل کیا گیا۔ ہم میں سے ہر شخص کا یہ اخلاقی فریضہ ہے کہ ہم اسے بھولیں نہیں بلکہ ہم ایک دوسرے کو اور پوری دنیا کو اپنے خلاف جاری ناانصافی سے آگاہ کر دیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس فرض میں ناکامی کے لیے تاریخ ہمیں کبھی معاف کرے گی۔"

"اسرائیل ہماری ناکامیوں اور نااہلیوں کا پیمانہ ہے۔ ہم نے برسوں تک کسی بڑے رہنما کا انتظار کیا لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔ ہم نے جنگ میں ایک بھاری بھرکم فتح کا انتظار کیا لیکن ہر بار ہمیں بھرپور شکست ہوئی۔ ہم نے بیرونی طاقتوں کا انتظار کیا۔ (امریکہ یا، اپنے وقت میں روس کا) لیکن کوئی ہماری مدد کو نہیں آیا۔ ایک چیز جس پر ہم نے پوری سنجیدگی کے ساتھ عمل کیا ہی نہیں، وہ ہے خود اپنے آپ پر بھروسا۔ جب تک ہم کامیابی کے لیے پوری قوت کے ساتھ خود پر بھروسا نہیں کریں گے۔ اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہم خود ارادیت اور جارحیت سے چھٹکارے کی جانب ایک قدم بھی آگے بڑھ سکیں۔" (ترجمہ: شاہ محی الحق فاروقی)

فلسطینی عرب سے علامہ اقبال کا خطاب

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

فرنگ کی رگ جاں پنجہ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے!

لا حرف عیہم

(ایک ترانہ فلسطینی مجاہدوں کے لیے)

فیض احمد فیض

ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے
ہم جیتیں گے

کیا خوف زیلغار اعدا
ہے سینہ سپر ہر غازی کا
کیا خوف زیورش جیش قضا
صف بستہ ہیں ارواح الشہدا

ڈر کاہے کا

ہم جیتیں گے
حقا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے
ہم جیتیں گے
ہر قطرۂ خوں اپنا پرچم
ہر کشتہ شجر ہے نخل ارم

ہر نعرۂ عدو کو صورِ عدم

دم دم دم دم
ہم جیتیں گے

قد جاء الحق وزہق الباطل

فرمودۂ ربِّ اکبر ہے

جنت ہے اپنے پاؤں تلے

اور سایۂ رحمت سر پر ہے

پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے
ہم جیتیں گے

اوروں کا ہو پیام اور، میرا پیام اور ہے

اکتوبر کا مہینہ ہر سال یوں آتا ہے کہ سرسید یاد آتے ہیں اور ایک بار پھر ہمیں بہت کچھ یاد دلا جاتے ہیں۔ ۱۷ اکتوبر کو یوم سرسید کی تقریب اب ایک رسم بن چکی ہے۔ دنیا بھر میں جہاں علی گڑھ برادری کے کچھ لوگ آباد ہیں، مل بیٹھتے ہیں۔ ہمیں ایک مرتبہ جدہ (سعودی عرب) سے یوم سرسید کے جشن میں شرکت کی دعوت ملی۔ وہی شائستگی، نظم وضبط اور ہم آہنگی کا ماحول جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تقریبات کا امتیاز ہے، جدہ کی ہر تقریب میں بھی نظر آیا۔ تقریریں ہوئیں، کچھ شعر وشاعری، ضیافتیں، اخیر میں علی گڑھ کا ترانہ جس کی دھن کا خیال آتے ہی رگ وپے میں خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

مجھے علی گڑھ چھوڑے ہوئے زمانہ گزرا، لیکن علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں سرسید کی یادوں سے آراستہ جلسے اور تقریبات اب بھی بہت یاد آتے ہیں۔ میرے والد، سرراس مسعود کے دور کے لا گریجویٹ تھے۔ انھیں اپنی زندگی کے آخری دنوں تک علی گڑھ کی یاد ہمیشہ بے چین کر دیتی تھی۔ شاید ہی کسی تعلیمی ادارے کے در و دیوار سے اس کے فرزندوں نے اس طرح ٹوٹ کر محبت کی ہو۔

اتفاقاً ایسا ہوا کہ اب کے یوم سرسید کی تقریبات کے دن میں اپنے ایم اے کے طلبا کے ساتھ سرسید ہی کی تحریروں کے بارے میں کچھ باتیں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں سرسید کی بعض ایسی تحریریں سامنے آئیں جنھیں عام طور پر یاد نہیں کیا جاتا۔ یہ تحریریں معیشت، تاریخ، مذہب، قومیت، سیکولرزم کے باب میں کئی ایسے حقائق کی نشاندہی کرتی ہیں جو سرسید کو انیسویں صدی کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے زمانے کے لیے بھی بامعنی بناتی ہیں۔

سرسید اپنے زمانے سے آگے بھی دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تبدیلی سے زندگی کی

پہچان ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ انسانی معاشرہ بھی حرکت میں رہتا ہے۔ ہماری سوچ بدلتی رہتی ہے۔ ہمارے عمل کی نوعیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہم پر لازم آتا ہے کہ اس تبدیلی کے حساب سے اپنے مسلکوں کا جائزہ لیتے رہیں۔ فکر اور عمل کی دنیا میں اجتہاد اور اپنے عقاید و ایقانات کی نئی تعبیر سے پریشان نہ ہوں۔ بےلوچ فکر انسان کے لیے تباہ کن بھی ہو سکتی ہے۔

سرسید کو صرف رسماً یاد کر لینا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ شیخ محمد اکرام نے، رودِ کوثر میں، بہت کھل کر یہ بات کہی ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی سرسید کے خوابوں کی معمولی سے تعبیر ہے۔ سرسید تو اپنی قوم کے لیے وقت اور تاریخ کا محور بدل دینا چاہتے تھے۔ ان کی حدِ پرواز نوجوانوں کے ڈگری یافتہ ہو جانے اور اچھی ملازمتیں حاصل کر لینے سے بہت آگے تک تھی۔ بےشک اعلیٰ تعلیم، زندگی اور زمانے کا حقیقت پسندانہ شعور، سماج میں عزت کی نظر سے دیکھے جانے والے مناصب کی حصولیابی بڑی چیز ہے۔ کامیابی اور ترقی کے اس درجے تک پہنچنے کی کوشش زندگی کے مجموعی نصب العین کا حصہ ہے۔ لیکن یہ مکمل زندگی نہیں ہے۔ بقول اقبال:

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

کوئی سال بھر پہلے مجھے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایک ہندی پروفیسر کی ایک دلچسپ کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کا موضوع تھا 'انیسویں صدی کی تہذیبی نشاۃ ثانیہ' اس کتاب کے مصنف (ڈاکٹر تلوار) کا خیال تھا کہ روشن خیالی اور عقلیت کے سائے میں جن مصلحوں نے ہندوستانی سماج کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا، اپنی روشن خیالی اور رواداری کے اعتبار سے ان سب میں سرسید کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ علی گڑھ تحریک (برہمو تحریک، آریہ سماج، رام کرشن مشن، پرارتھنا سماج کی بہ نسبت) کہیں زیادہ سیکولر تحریک تھی۔ اس تحریک کا سروکار کسی ایک قوم یا فرقے تک محدود نہ تھا۔ سرسید سیکولر تعلیم کے حامی تھے۔ علی گڑھ کالج کے دروازے انھوں نے تمام ہندوستانیوں کے لیے کھلے رکھے۔ ان کا قومیت کا تصور بہت وسیع تھا۔ اس سلسلے میں سرسید کی تقریروں سے کچھ اقتباس ایسے ہیں کہ انھیں بار بار دوہرایا جانا چاہیے۔ حضرت علی کا قول ہے کہ اچھی باتیں دوہرائی نہ جاتیں تو کب کی ختم ہوگئی ہوتیں۔ ان دنوں ہمارے چاروں طرف جس طرح کا ماحول ہے، فرقہ پرستی، تشدد، بےاعتباری، تنگ نظری اور تعصب کا جو بازار گرم ہے، اس میں سرسید کے یہ الفاظ ہمارے لیے آج پہلے سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ہندوستانی ایک قوم ہیں

سرسید نے کہا تھا:

''اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو؟ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو۔ تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے۔ ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اس ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں! (تقریر۔ گورداس پور، جنوری ۱۸۸۴ء)

اے عزیزو! ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کی مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی!''

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

ایک طرف سرسید کے یہ محبت بھرے بول ہیں، دوسری طرف اتر پردیش بی جے پی کے صدر ونے کٹیار کا یہ زہریلا بیان کہ اردو دہشت گردوں کی بھاشا ہے۔ جب سے ہمارے ملک میں فرقہ پرست تنظیموں کو بالا دستی حاصل ہوئی ہے ایک سے ایک زبان دراز، دریدہ دہن، فتنہ پرداز لیڈر سامنے آتا ہے اور اول فول بک کر چلا جاتا ہے۔ حکومت چپ چاپ یہ تماشا دیکھتی رہتی ہے۔ کسی پر کوئی لگام نہیں۔ آج (یہ سطریں ۱۷ اکتوبر کو لکھی جا رہی ہیں) اردو اخباروں کے ضمیمے سرسید کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ساری دنیا میں سرسید ڈے کا جشن برپا ہے اور آج

وشو ہندو پریشد کا سنکلپ دیوس بھی ہے۔ اجودھیا اور آس پاس کے علاقوں میں اسی طرح کا فتنہ پھر سر اٹھا رہا ہے جس نے ۶ ر دسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد دنیا بھر میں ہمیں شرمندگی اور ذلت کے احساس سے دو چار کیا۔ چند روز قبل ایک فقرہ یہ سنائی دیا کہ چین کے لوگ خلا میں گرم پرواز ہیں، اِدھر ہم ہیں کہ زمین کے اندر رام مندر کے آثار ڈھونڈ رہے ہیں۔!

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن پرمود مہاجن کہتے ہیں کہ علامہ اقبال کی یہ بات ان کے دل کو نہیں لگتی۔ یہ ترانہ پرمود مہاجن کے جذبوں کا ترجمان نہیں ہے۔ کیسی بلبلیں اور کہاں کا گلستان۔ اس ترانے کو بدل دینا چاہیے۔ کیسے بدلا جائے؟ اس کی وضاحت بھی پرمود مہاجن نے کر دی ہے۔ صاحب! جو چاہیے کہہ لیجیے۔ علامہ اقبال تو آپ کا جواب دینے سے رہے اور ہمارے پاس بھی آپ کی بات کا جواب صرف خاموشی ہے!

عزت اور ذلت میں فاصلہ ہی کتنا ہے

سوویت یونین کے مشہور زمانہ شاعر مایا کافسکی کی کسی بات پر چڑ کر ان کے ایک سامع نے کہا ''مایا کافسکی! تم جانتے ہو، عزت اور ذلت میں فاصلہ کتنا ہے؟'' مایا کافسکی نے اس جوان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ایک لمبا ڈگ بھر کر اس کے نزدیک گیا اور کہا ''صرف ایک قدم!'' اور چلتے چلتے یہ بھی سنتے چلیے کہ انیسویں صدی کے اس مرد دانا و فقیر، سرسید نے اس سلسلے میں کیا کہا تھا:

''ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو، کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو (Native) ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں، ہماری عزت نہیں ہو سکتی!''

(تقریر امرتسر، ۲۶ جنوری ۱۸۸۹ء)

ہم ہندوستانی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے عادی ہیں۔خود پسندی کی بیماری نے ہمارا حال کتنا خراب کر دیا ہے، اس کا اندازہ ایک اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم نے احمقوں اور شر پسندوں کے ہاتھوں میں اپنی اجتماعی زندگی کی لگام دے رکھی ہے اور وہ چاروں طرف اینڈ تے پھرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ یہاں صرف بدامنی، فرقہ پرستی، لاقانونیت کا راج ہے۔سرسید نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ قومی تعمیر اور فلاح کا راستہ صرف تعلیم اور تہذیب کا راستہ ہے جہاں سے سیاست اور سیاست دانوں کا گزر نہیں ہوتا۔

گرتی رہیں زمیں پہ اندھیرے کی پتیاں

دنیا دنیا دہشت ہے

ابھی حال میں ایک انتہائی ہولناک کتاب ہاتھ لگی۔کتاب کا موضوع تھا ''پاکستان کی جہادی تنظیمیں۔'' کتاب کے مصنف تھے محمد عامر رانا۔کتاب پاکستان کے ہی ایک ناشر نے شائع کی ہے۔اس کتاب میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والی ان تنظیموں کا کچا چٹھا بیان کیا گیا ہے جنھوں نے ''نیک مقاصد اور مذہبی ایقانات'' کے نام پر کہرام مچا رکھا ہے۔ہم اپنے یہاں پروین توگڑیا، اشوک سنگھل، گری راج کشور، ونے کٹیار اور سنگھ پریوار کے بے لگام لیڈروں کے بیانات سے کیا کم پریشان تھے کہ اب محمد عامر رانا کی اس کتاب کے واسطے سے ہماری اجتماعی زندگی کا ایک اور ڈراؤنا رخ سامنے آیا۔کیا قیامت ہے کہ پاکستان میں ان دنوں نہ مسجدیں محفوظ ہیں نہ امام باڑے۔سب ایک دوسرے کی جان کے درپے ہیں اور یہ سب ہو رہا ہے مذہب اور عقیدے کے نام پر۔مختلف تنظیموں کے قائدین جس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور جس دستورالعمل پر عمل پیرا ہیں اس کی تفصیل میں جائے بغیر بھی اس کی ہلاکت اور دہشت کا اندازہ ہم پاکستان کے روزانہ اخبارات کی سرخیوں سے کر سکتے ہیں۔ یہ زمانہ انفارمیشن ٹکنالوجی اور مطبوعہ لفظ کے سیلاب کا زمانہ ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ پرنٹ میڈیا نے بھی ایسی قیامت برپا کر رکھی ہے کہ خدا کی پناہ۔اطلاعات کے نام پر انسانی تاریخ کا سارا کوڑا کرکٹ ہمارے حواس اور اعصاب کی جھولی میں انڈیل دیا جاتا ہے۔قتل، اغوا، زنا، چوری، ڈکیتی،

گھوٹالے اور طرح طرح کے اخلاقی جرائم کی خبریں اخبار کے صفحوں پر بکھری دکھائی نہ دیں تو اخبار غیر دلچسپ لگتا ہے اور پڑھنے والوں کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

یہ کیسی بے حسی ہے اور کس حد کو پہنچا ہوا ڈی ہیومنائزیشن۔ سیاست اور زبان، عقیدے، مسلک، علاقے، تہذیب اور ثقافت کے ملبے سے رینگ کر نکلنے والے تعصبات نے، ان تعصبات سے غذا حاصل کرنے والی منافرت اور دیوانگی نے ہماری دنیا کا کباڑا کر کے رکھ دیا ہے۔ جارج بش کے احساسات اور صیہونیت کے پیچھے بھی ''نیک اور الوہی مقاصد'' کی تباہ کن طاقتیں چھپی ہوئی ہیں۔ بجرنگ دل، وشو ہندو پریشد سے لے کر محمد عامر رانا کے مطالعے کا موضوع بننے والی مذہبی تنظیموں تک، بربریت اور درندگی کی ایک عجیب وغریب داستان پھیلی ہوئی ہے:

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا

یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو کس کے طوفاں پھیلے ہوئے ہیں، اس کی پہچان کیا واقعی مشکل اور اس پر قابو پانا کیا واقعی ممکن نہیں ہے؟

کوئی کمرہ ہے جس کے طاق میں اک شمع جلتی ہے!

اسی عالم وحشت میں شیریں عبادی کے نوبیل انعام سے سرفراز کیے جانے کی خبر آئی اور گم ہوگئی۔ یہ معمولی بات نہیں کہ ایک روایت پرست معاشرے سے ابھرنے والی ایک مشرقی خاتون کو اس سال امن کے لیے نوبیل انعام پیش کیا گیا۔

شیریں عبادی کا تعلق ایران کے ایک روایتی گھرانے سے ہے۔ ۱۹۴۷ء ان کا سال ولادت ہے۔ تہران یونیورسٹی کی لا فیکلٹی سے انھوں نے ۱۹۶۹ء میں قانون کی سند حاصل کی۔ ایران کی تاریخ میں ان کا نام ایسی اولین جج خواتین میں شامل ہے جنھوں نے انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ۱۹۷۹ء میں انھیں ججی سے برطرف کر دیا گیا۔ برسر اقتدار علما کا خیال تھا کہ عورتیں اس منصب کی اہل نہیں ہو سکتیں۔ شیریں عبادی تنگ آ کر ۱۹۸۴ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوگئیں اور نجی حیثیت سے کام کرنے لگیں۔ انھوں نے ایک اٹارنی کے طور پر پریکٹس کرنے کا لائسنس حاصل کرلیا۔ بہت جلد ان کا شمار ایران میں حقوق انسانی کی تحریک کے سربراہوں میں کیا جانے لگا۔ شیریں عبادی نے ۱۹۹۴ء میں بچوں

کے حقوق کا تحفظ کرنے والی سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔انھوں نے مطلقہ عورتوں کے حقوق کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور بہت سی بے سہارا عورتوں کا سہارا بنیں۔ایسے مقدمات کی پیروی کی جنہیں حکومت کے ڈر سے لوگ ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔اپنے ان جرائم کی پاداش میں شیریں عبادی کو طرح طرح کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس وقت شیریں عبادی کو ایران میں جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر آواز اٹھانے والوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔اقتدار کی سیاست سے انھیں مطلق دلچسپی نہیں۔وہ تہران یونیورسٹی میں قانون کا درس دیتی ہیں۔کتابیں لکھتی ہیں اور عورتوں نیز بچوں کے حقوق کی جنگ میں اپنے آپ کو مصروف رکھتی ہیں۔نوبیل انعام کمیٹی نے اپنے سپاس نامے میں لکھا ہے کہ ''شیریں عبادی کی زندگی تعلیمی،سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کا نقطۂ اتصال ہے۔ انھوں نے اپنے عمل اور اپنی فکر دونوں کو حقوق انسانی اور جمہوری قدروں کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا ہے۔ایران کے ایوان بالا میں آج ۱۴ خواتین ہیں۔یہ نقشہ شیریں عبادی جیسی حوصلہ مند خواتین کے بغیر مرتب نہیں ہو سکتا تھا۔

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

پروفیسر نجمہ محمود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں انگریزی زبان وادب کا درس دیتی تھیں۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں، شعر کہے ہیں۔ ادبی اور تہذیبی موضوعات پر اردو اور انگریزی میں ان کے کئی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''سید حامد: کہ گم اس میں ہیں آفاق'' ان کا تازہ ترین تصنیفی کارنامہ ہے۔ اسے سید حامد صاحب کی سوانح سے زیادہ ان کی شخصیت کا مرقع کہنا چاہیے۔ حامد صاحب کی ادبی، تہذیبی، تعلیمی اور فکری سرگرمیوں کی روداد، اس کتاب میں مصنفہ نے بہت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی ہے۔ اپنے موضوع سے جذباتی اور ذہنی مناسبت کے باعث عقیدت کا رنگ کہیں کہیں گہرا ہوگیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کتاب سے ہمارے زمانے کی ایک انتہائی دلآویز اور معروف سماجی شخصیت کا خاکہ رونما ہوا ہے۔ حامد صاحب کی زندگی جن مقاصد کے لیے وقف رہی ہے۔ ان کا سب سے اہم پہلو حامد صاحب کی قومی دردمندی اور اپنی قوم کی اصلاح وترقی کا جذبہ رہا ہے۔ نجمہ محمود صاحبہ نے حامد صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لے کر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تک حامد صاحب کی سرگرمیوں کا میدان خاصا وسیع رہا ہے اور یہ کتاب بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کا احاطہ کرتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کچھ عرصہ پہلے A Hundred Encounters کے نام سے شام لال کی معروف تحریروں ''لائف اینڈ لیٹرز'' کا انتخاب شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کی پذیرائی تمام اعلیٰ علمی اور ادبی حلقوں میں کی گئی۔ اب ان کی دوسری کتاب "Indian Realities: in bits and pieces" کے نام

سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب بھی ان کے کالمز The Indian Scene کے انتخاب پر مشتمل ہے۔شام لال ان گنتی کے چند لوگوں میں ہیں جو جیتے جی افسانہ بن جاتے ہیں۔اس وقت شام لال کی عمر بانوے برس کی ہے۔ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۸ء تک وہ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر رہے۔ ہندوستان کی انگریزی صحافت میں ان کی شخصیت ایک دیوزاد اور ایک دبستاں کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کا کردار ایک آدرش بن چکا ہے۔گوشہ گیری اور خلوت نشینی کے ساتھ اپنے عہد اور اپنی دنیا کا ایسا ادراک، جو شام لال کو حاصل ہے،کہیں اور نظر نہیں آتا۔انھوں نے صرف ذہنی زندگی سے سروکار رکھا۔جلسے جلوس،بحث مباحثے،تام جھام سے ہمیشہ دور رہے۔سیاست دانوں سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھا۔دعوتوں ضیافتوں میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔نمود و نمائش اور نمائشی انداز رکھنے والوں کو کبھی منھ نہ لگایا۔لیکن ان کی تحریروں میں جو غیر معمولی بصیرت ملتی ہے اس سے ایک زمانے نے فیض اٹھایا ہے۔ان کے سروکاروں کی دنیا بے حد وسیع ہے۔اتنے گوناگوں موضوعات پر ایسی گہری نظر کے ساتھ آج کی دنیا کو بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔یہ دونوں کتابیں ایک سخت کوش ذہن،ایک بے ریا شخصیت،ایک بے مثال وجود،ایک سرگرم اور بے قرار بصیرت،ایک سچے کھرے دیانت دار اور انسان دوست صحافی کی فکری مہمات کے لازوال مرقعے ہیں۔ان کی پہچان سب سے الگ ہے۔

گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

بہت دن ہوئے۔ایک پاکستانی شاعر نے کہا تھا:

ہمارے یہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

یہ حال اس وقت صرف پاکستان اور ہندوستان کی سیاست کا نہیں، ساری دنیا کی سیاست کا حال یہی ہے۔انسان کے اجتماعی زوال کا تماشا بہت دنوں سے جاری ہے۔اس تماشے میں آج کی ملکی اور غیر ملکی، مقامی اور عالمی سیاست نے اب مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔سیاسی کلچر کا زوال آج کے دور میں زوال کی تمام علامتوں پر حاوی ہے۔ہمارے یہاں انتخابات کے ہنگاموں کے دوران ذہنی اور اخلاقی پستی کے کیسے کیسے تماشے سامنے آئے۔ایک وزیر رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔سارا منظر کیمرے کی آنکھ میں اتر آیا اور پھر دنیا بھر میں اس تماشے کی دھوم مچی۔لیکن حکمراں جماعت کا ایک بھی لیڈر اس زوال پر پریشان، پشیمان، حیران دکھائی نہ دیا۔سارا زور اس بات پر رہا کہ یہ پوری کہانی کیمرے میں قید کیسے کی گئی اور اس کے پیچھے کون ہے۔وہ جوانہی مونچھوں کے ساتھ کیمرے کے آگے آیا، پکڑے جانے کے باوجود آزاد ہے۔

اور جہاں تک اس واقعے پر ہمارے معاشرے کے ردعمل کا تعلق ہے تو ہم اس طرح کے ہر تماشے کو اب اپنے معمول کا حصہ سمجھتے ہیں۔''سب چلتا ہے۔''اس محاورے کی گردان ہر طرف جاری ہے۔اس گنہگار معاشرے میں اب کوئی آنکھ کسی انہونی پر حیران نہیں ہوتی۔کہیں کسی طرح کا غصہ یا پچھتاوا، ملامت اور مایوسی کا کوئی اظہار نہیں۔

اس وقت ہمارے معاشرے کی سب سے ناقابل اعتبار مخلوق ہمارے سیاست داں ہیں۔ ان کی کسی بات پر کوئی بھروسہ نہیں کرتا۔لیکن وہ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوری ڈھٹائی

کے ساتھ دن رات جھوٹ کا انبار لگاتے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب قومی حیثیت رکھنے والے رہنما اپنے قول وعمل میں ایک حد کے پابند ہوتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب کسی نے کبھی اسمبلی انتخابات میں کسی وزیر اعظم کو اپنی پارٹی کے لیے کنویسنگ کرتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اب کیا ہو رہا ہے۔ آج کھلے عام الزام تراشیاں ہی نہیں، جوتم پیزار کا ماحول بھی ہے۔ زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چل جاتا ہے۔ استغفر اللہ! اس اندھیرے میں کہیں کوئی چراغ جلتا دکھائی دے تو کیسی ڈھارس بندھتی ہے!

جارج ڈبلیو بش اور جمہوریت کی قصیدہ خوانی

اس وقت صورت حال دنیا کے سب سے متمول، ترقی یافتہ اور طاقتور ملک میں بھی اتنی ہی تشویشناک ہے۔ یاد کیجیے۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر بڑے بش کے بیٹے چھوٹے بش کی تقریر دل پذیر۔ جمہوریت، انصاف، امن، آزادی کے لفظ ان کے ہونٹوں سے نکلتے ہی اپنے معنی بدل دیتے ہیں۔ انھوں نے اس وقت ساری دنیا کے امن انصاف، آزادی اور جمہوریت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ابھی چند روز قبل چپ چپاتے عراق بھی ہو آئے۔ ہمارے سیاست دانوں کی طرح وہ بھی شعبدوں کے سہارے اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ جشن جمہوریت کی تقریب میں اپنی تقریر کے دوران وہ کھلے بندوں جھوٹ بولتے رہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں جنوب ایشیائی زبانوں اور تہذیبوں کے شعبے سے وابستہ پروفیسر سی ایم نعیم جو ان دنوں وہاں پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت رکھتے ہیں، جارج بش کی اس تقریر کے خلاف انھوں نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا اور امریکی اقتدار اور جارج بش کے ماضی اور حال کی کئی ایسی تفصیلات سے پردہ اٹھایا جو انصاف، آزادی اور جمہوریت کے دعووں کی سچائی سامنے لاتی ہیں۔ چودھری نعیم کے مضمون کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے کہ "ہم میں سے بہتوں کے لیے صدر بش کی تقریر خالی خولی لفظوں کا پلندہ ہے۔" اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سیاست دانوں کی طرح بش کے بھی قول اور فعل میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ امریکی سیاست جدید دنیا کے بدترین انسانی جرائم اور ناانصافیوں کی قصوروار رہی ہے۔ ویت نام، انگولا، عراق، ایران، فلسطین، ہر جگہ امریکی سیاست کا مہیب سایہ منڈلاتا پھرتا ہے اور یہ سایہ اب شام کی طرف لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جاتا ہے۔ کون جانے کس گھڑی یہ اندیشہ سچ ثابت

ہو جائے! امریکی کانگریس نے شام کے خلاف تادیبی کارروائی کے بل کو منظوری دے ہی دی ہے۔ اقتدار میں اکثریت کے بل پر رات کو دن اور دن کو رات کہہ لیجیے۔ کوئی کیا کرے گا۔

مگر جب اندھیرا ہر طرف پھیل رہا ہو تو کسی کو چراغ جلانے کی فکر بھی ہونی ہی چاہیے۔ ایسا ہی ایک چراغ ہندی کے نامور افسانہ نگار گیان رنجن کا رسالہ پہل بھی ہے جو جبل پور (مدھیہ پردیش) سے شائع ہوتا ہے۔ گیان رنجن بظاہر دھان پان سے آدمی ہیں لیکن ایک توانا حوصلہ مند روح کے مالک۔ پہل کے ذریعہ انھوں نے برسوں سے جہالت، فرقہ پرستی، ظلمت پسندی اور ناانصافی کے خلاف فکری اور اخلاقی جہاد چھیڑ رکھا ہے۔ احمد آباد کے مسلم کش فسادات کی گھناؤنی اور زہریلی فضا میں ہندی اور انگریزی صحافت سے وابستہ جو آوازیں حق کی حمایت اور حفاظت کے لیے بلند ہوئیں ان میں گیان رنجن کی آواز الگ سے پہچانی جاتی ہے۔ وہ ہر طرح کے مذہبی جنون اور فرقہ واریت کے مخالف رہے ہیں۔ پہل کے تقریباً تمام شماروں میں ہماری اجتماعی زندگی کو درپیش مسئلوں سے متعلق تحریریں چھپتی رہی ہیں۔ ولی کے مزار کی تعمیر نو کے لیے گیان رنجن نے ایک ملک گیر تحریک بھی چلائی ہے۔ ان کے رسالے پہل کا تازہ شمارہ ولی دکنی کے لیے وقف ہے۔ اس میں احمد آباد کے فسادات، ولی کے مزار کی بے حرمتی، ولی کے اشعار اور افکار سے متعلق کئی اچھی تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں۔ انہی تحریروں میں ولی پر چندر کانت پاٹل، راجیش جوشی اور دیوی پرساد مشر کی کویتائیں بھی شامل ہیں۔

ایک نظم کے کچھ اقتباسات

بات یوں تو اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے شروعاتی دنوں کی ہے
بہیمیت اور پاگل پن کا ایک نیا باب شروع ہو رہا تھا
کئی ریاستوں اور کئی قسم کی سیاستوں والے ایک ملک میں گجرات نام کا ایک صوبہ تھا
جہاں اپنے ہندو ہونے کے غرور اور حماقت میں ڈوبے کچھ ان گھڑ لوگوں نے
جو صوبے کی سرکار اور نریندر مودی نامی اس کے مکھیہ منتری کی پوری حفاظت میں ہزاروں لوگوں کے قتل کر چکے تھے

اور زنا کی گنتی تو ان کی یادداشت کی حد پار کر چکی تھی
ایک شاعر جس کا نام ولی دکنی تھا، اس کا مزار توڑ ڈالا
وہ ہندی اور اردو کی مشترکہ وراثت کا شاعر تھا جو تقریباً چار صدی پہلے ہوا تھا اور پیار سے جسے بابا آدم بھی کہا جاتا تھا
کئی برے کارناموں کے بھی کبھی کبھی کچھ دلچسپ نتیجے سامنے آتے ہیں
سو اس کا بھی ایک دلچسپ انجام سامنے آیا
اور وہ شاعر جو برسوں سے اپنے مزار میں چپ چاپ سو رہا تھا
باہر آ گیا اور ہواؤں میں پھیل گیا
اکیسویں صدی کے ان شروعاتی دنوں میں
ایک دوسرے شاعر نے جو مزار کو توڑنے والوں کے سخت خلاف تھا
تیسرے شاعر سے کہا کہ میں
دنگائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں
پھر تیسرے شاعر نے چوتھے شاعر سے بھی یہی بات کہی
پھر چوتھے نے پانچویں سے بھی ۔۔۔۔
کہ میں دنگائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں
کہ انھوں نے ولی کے مزار کی مٹی کو
سارے ملک کی مٹی، ہوا اور پانی کا حصہ بنا دیا

راجیش جوشی، ولی دکنی
پہل اور گیان رنجن کا پتہ یہ ہے
اور رام نگر
ادھار تال
جبل پور۔ ۴۸۲۰۰۴

اردو ہندی تنازعہ
ایک نئے مکالمے کی ضرورت

اردو زبان اور رسم الخط کا مسئلہ تقریباً اتنا ہی الجھا ہوا ہے جتنا کہ بابری مسجد کا مسئلہ۔ اس سلسلے میں ایک طرح کی جارحانہ جذباتیت کا اظہار اردو رسم الخط کے حامیوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور اس کے مخالفوں کی طرف سے بھی۔ اردو رسم الخط کو پتہ نہیں جان بوجھ کر یا انجانے میں، کچھ لوگ فارسی رسم خط کہنے لگے ہیں۔ گویا کہ بات شروع اس نکتے سے کی جاتی ہے کہ اردو زبان چاہے دیسی ہو، اس کا رسم خط بہر حال بدیسی ہے۔ راجندر یادو نے کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے مسئلے پر جو معروف اداریہ ''ہنس'' میں لکھا تھا اس میں اردو کا تذکرہ بھی تھا۔ اس طرح اردو کی فرقہ وارانہ حیثیت کی بالواسطہ طور پر تائید ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ موقف بھی درست نہ تھا، اسی لیے اس کے خلاف ردعمل بھی شدید ہوا۔ راجندر یادو کا کہنا یہ تھا کہ اس وقت سوال اردو بھاشا کو بچانے کا ہے یا اردو کے رسم خط کو۔ اب ہم اس سلسلے میں ہزار سچائیوں کو نظر انداز کر دیں پھر بھی ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے لیے جو رسم خط ہمارے ملک میں اختیار کیا جائے گا اسے دنیا بھر کے اردو والے اپنالیں گے؟ تو کیا ہمارے ملک میں پروان چڑھنے والی اردو صرف ہمارے لیے ہوگی؟

اس ضمن میں ایک اور بات جو مجھے پریشان کرتی ہے، یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ مطالبہ صرف اردو ہی سے کیوں کیا جاتا ہے کہ وہ دیوناگری رسم خط اپنالے، اپنے بچاؤ کی خاطر۔ تو کیا صرف جان بچائی جاتی ہے، پہچان نہیں؟ تاج محل کا حسن اور دلآویزی کیا صرف اس کی بنائے تعمیر میں ہے، اس کی بناوٹ میں نہیں ہے؟ کیا کسی زبان کا وجود صرف اس کے مواد میں ہوتا ہے؟ اس کے بیرونی اسٹرکچر، اس کے روپ رنگ کا تصور کیا بے معنی ہے؟ رشید احمد

صدیقی نے جب یہ کہا تھا کہ مغلوں نے ہندوستان کو تین تحفے دیے، اردو زبان، تاج محل اور دیوان غالب، تو کیا ان کے اس قول میں یہ رمز بھی شامل ہے کہ ان تینوں کی حقیقت کا ان کی ہیئت سے، ان کے بیرونی شناس نامے سے کچھ بھی تعلق نہیں؟ کیا کسی انسان کے وجود کی حفاظت اس کی کھال کھینچنے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے؟

ظاہر ہے کہ رسم خط کی حیثیت کرتے پاجامے کی نہیں ہوتی کہ جب چاہا اسے اتار پھینکا اور جس طرح چاہا اسے تبدیل کر لیا۔ The Loom of Language کے مصنف Bodmer کا یہ خیال اپنی جگہ درست سہی کہ ''کوئی خاص رسم خط کسی زبان کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا اور یہ کہ وسط ایشیا سے لے کر مغربی ملکوں تک جتنے بھی رسوم خط رائج ہیں، ان کی اصل ایک ہے۔'' لیکن صدیوں کا تعلق کسی ایک رسم خط کو ایک زبان سے اس طرح جوڑ بھی دیتا ہے کہ اسے الگ کرنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اس سلسلے میں ترکی کی مثال سامنے ہے۔ رومن رسم خط کو اختیار کرنے سے بے شک کچھ فائدے بھی ہوئے لیکن ایک بہت بڑا نقصان اس تجربے سے یہ پہنچا کہ لڑکوں کی نئی نسل اپنے کلاسیکی سرمائے کی قدر و قیمت سے ناواقف اور اپنی ثقافت کے طویل اور عریض پس منظر سے بیگانہ ہوتی گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ دیوناگری لپی میں کھڑی بولی ہندی کی علمی اور ادبی روایت سے متعلق کتنے مخطوطے انیسویں صدی سے پہلے کے ہیں۔ لیکن جہاں تک اردو رسم خط میں اردو کے ادبی اور علمی سرمائے کا تعلق ہے تو اس کی شہادتیں اتنی ہی قدیم ہیں جتنی کہ اردو زبان۔ اردو رسم خط دنیا کے سب سے خوبصورت رسوم خط میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک منفرد جمالیات ہے۔ ایک مخصوص فنی اور ثقافتی روایت ہے، فن تعمیر، فن مصوری اور سنگ تراشی کی طرح۔ اسے روح کی اقلیدس Geometry of Soul سے جو تعبیر کیا گیا ہے تو صرف اسی لیے کہ یہ ایک رسم خط ہی نہیں بلکہ تخلیقی اور فنی اظہار کا ایک اسلوب بھی ہے۔

کھڑی بولی ہندی کی اولین شکل کے لحاظ سے اردو کے امتیازات اور اردو کی لسانی تاریخ کے سلسلے میں پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی نے ڈاکٹر دھیریندر ورما کے جواب میں ناگزیر قیل و قال کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا تھا (انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۰) جس میں اردو پر عام اعتراضات کی روشنی میں اردو کے مقدمے کی وضاحت کی گئی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کی روشنی میں ہمارے لسانی نقشے نے پچھلے ڈیڑھ دو سو برسوں میں خاصی پیچیدہ صورت

اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہندی تنازعے اور اردو رسم خط کے مسئلے کو جذبات سے الگ ہو کر تاریخی شہادتوں اور سچائیوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور اپنی اجتماعی ضرورتوں کے مطابق اس مسئلے کا منصفانہ حل تلاش کیا جائے۔ سید سجاد ظہیر نے اردو، ہندی ہندوستانی کے عنوان سے حصول آزادی کے ٹھیک مہینے بھر بعد (ستمبر ۱۹۴۷) ایک رسالہ چھپوایا تھا (کتب پبلشرز، بمبئی)۔ ان کی اس تاریخی دستاویز کے بعض نکات حسب ذیل ہیں:

شروعات انھوں نے اس طرح کی ہے کہ ''غالباً اس وقت ہمارے ملک میں کوئی تہذیبی مسئلہ اس قدر الجھا ہوا نہیں ہے جتنا کہ اردو، ہندی اور ہندوستانی کا مسئلہ ہے۔ اردو اور ہندی کے حامیوں میں ان دونوں زبانوں کی اصل، ان کی ترقی و فروغ، ان کی موجودہ حالت و کیفیت اور مستقبل میں ان کے ارتقا کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اردو کے بعض طرفدار ہندی کے اور ہندی کے بعض جوشیلے مدعی اردو کے وجود سے ہی انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے ملک کی یہ بڑی بڑی زبانیں تنگ نظری، ضد اور شرارت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ترقی کر رہی ہیں۔

مثلاً آنجہانی پنڈت رام چندر شکل، جنھوں نے ہندی ادب کی نہایت عالمانہ تاریخ لکھی ہے، اردو کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ کھڑی بولی کا کرترم روپ، یعنی بگڑا ہوا نقلی روپ ہے، اس کا اصلی روپ ہندی ہے۔

ڈاکٹر دھیریندر ورما، الٰہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ ہندی کے صدر لکھتے ہیں: ''چونکہ ہمارے حاکم اب بدل گئے ہیں (یعنی مسلمانوں کی جگہ انگریز ہندوستان کے حکمراں ہیں) اس لیے پہلے کے مقابلہ میں اب اردو کا مستقبل اتنا روشن نہیں رہا۔''

میاں بشیر احمد (ایڈیٹر ہمایوں)، مولوی عبدالحق اور سر تیج بہادر سپرو کے نزدیک ''جدید ہندی، ہندو تعصب اور فرقہ پرستی کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔''

اس پس منظر کے بعد سجاد ظہیر نے اردو اور ہندی کے مقابلے میں ہندوستانی کے موقف پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے: ''گاندھی جی نے حال میں ایک درمیانی صورت نکالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن خود کانگریس کے تمام لوگ اس معاملے میں گاندھی جی سے متفق نہیں ہیں۔ ایک طرف بابو پرشوتم داس ٹنڈن، سمپورنانند جی اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی اکثریت ہے۔ اس گروہ کا کہنا

ہے کہ: ''ہمیں ڈر ہے کہ ہندوستانی کا مبہم نام دے کر ملک پر کہیں اردو نہ ٹھونس دی جائے۔''
دوسری طرف جمعیت علما اور اکثر مسلمان کانگریسی ہیں جو گاندھی جی سے اس معاملہ میں اتفاق نہیں کرتے۔انھیں یہ ڈر ہے کہ ہندوستانی کے نام پر کہیں ہندی کا پرچار نہ شروع ہو جائے۔

ان دونوں گروہوں کے درمیان گاندھی جی اور ان کے حمایتی کھڑے ہیں۔اردو کی حمایت کرنے والوں کی اکثریت بھی گاندھی جی کے تصور والی ہندوستانی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

دونوں فریق صرف اپنے کو سچائی پر سمجھتے ہیں۔دوسری طرف انھیں صرف جھوٹ اور ضد اور تعصب نظر آتا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر وہ سب کچھ ٹھیک ہے جو اردو والے ہندی کے متعلق اور ہندی والے اردو کے متعلق سوچتے ہیں اور اگر ان دونوں زبانوں کی بنیاد مصنوعی اور غیر فطری ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ ان دونوں زبانوں کی دن بہ دن ترقی ہو رہی ہے اور ان کی مقبولیت عوام میں بڑھ رہی ہے؟''

اس وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا حلقۂ اثر پھیل رہا ہے،اس فرق کے ساتھ کہ اردو کے لیے خود اپنے وطن کی زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے،حکومت کے رویے کی وجہ سے اور سرکاری مشینری کے طریق کار اور تنگ نظری کے باعث۔لیکن مشرق و مغرب کے دوسرے ملکوں میں دونوں زبانوں کی رفتار ترقی تقریباً یکساں ہے۔ہندوستان میں اردو کو جو صورت حال درپیش ہے،تعلیمی اور سرکاری اداروں کی سطح پر،اس کے نتائج خراب ہی نہیں،ہولناک کہے جا سکتے ہیں۔ابھی حال میں سید ہاشم علی اختر صاحب مرحوم،سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شخصیت پر جناب رام پرکاش کپور کا ایک تعزیتی مضمون شائع ہوا ہے۔ہاشم علی اختر صاحب اردو کے لیے دو زائد رسوم خط،دیوناگری اور رومن کے زبردست حامی تھے۔ان کا موقف اس سلسلے میں کیا تھا،خود انھی کے لفظوں میں دیکھیے:

''گزشتہ ۲۴ سال سے میں زائد رسم خط کی بات کر رہا ہوں اور اردو والے اسے رسم خط کی تبدیلی سمجھ کر اخباروں میں میری مخالفت کرتے رہے ہیں۔میری ساری تعلیم ایم ایس سی تک اردو میں ہوئی ہے۔میں نے دفتری کام اور فیصلے اردو میں لکھنے شروع کیے جو آزادی کے بعد

انگریزی میں لکھنے پڑے۔ میرے خاندان کے پچاس سال سے کم عمر کے کسی شخص کو اردو نہیں آتی! عثمانیہ اور علی گڑھ میں اردو لکھنے پڑھنے والے طلبا کی تعداد بہت ہی کم ہے اور یہ سب تاریخ کا جبر ہے۔ تنگ نظری دونوں طرف سے ہوئی ہے، لیکن ملک کی قومی زبان ایسی ہونی چاہیے کہ اس میں تمام ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کو جہاں تک ممکن ہو سکے، شامل کیا جا سکے، تا کہ ہر لسانی گروہ کو Sense of Belonging ہو۔۔۔۔۔! میری رائے میں ایک وسیع آغوش، فراخ دل اور بے تعصب ہندی ہے، جس کو مولوی عبدالحق صاحب ہندی کی سب سے آخری اور شائستہ شکل اور پنڈت نہرو A Variation of Hindi اور مہاتما گاندھی صرف رسم خط کا فرق سمجھتے تھے۔ جب اردو کے تمام لکھنے والوں کو ہندی والے شوق سے پڑھ رہے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔ (صرف रूपान्तर (بدل دینا) کافی ہوگا۔)

اردو بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ گزشتہ چالیس برسوں میں اردو لکھنے والوں کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔ اس طرح اردو اب ''آنکھوں کی زبان نہیں'' بلکہ ''کانوں کی زبان'' بن کر رہ گئی ہے۔۔۔۔۔! اس وقت ہندوستان میں اردو کی بقا کا اور ترقی کا مسئلہ ہے اور مغرب میں ''ترویج'' کا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔!

دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

آج دسمبر ۲۰۰۳ء کی آخری صبح ہے۔ کس قیامت کی ٹھنڈ پڑی کہ شمالی ہندوستان کی ساری خلقت پناہ مانگنے لگی۔ اس برفیلے موسم میں اردو والوں کی تہذیبی زندگی میں کچھ گرمی آئی تو غالب کے واسطے سے۔ ۲۷ دسمبر ان کی سال گرہ کا دن ہے۔ اس تقریب کی مناسبت سے ہر سال کی طرح اب کے برس بھی خاصے بڑے پیمانے پر ایوان غالب، دہلی نے غالب سمینار کا اہتمام کیا۔ تین روز کے اس مذاکرے میں ملک اور بیرون ملک کے شاعر، ادیب، دانشور یکجا ہوئے۔ مذاکرے کا موضوع تھا 'عہد غالب کا فکری، ثقافتی اور علمی و ادبی ماحول'۔ کئی اچھے مقالے پڑھے گئے اور بحثیں ہوئیں۔ غالب کا عہد یعنی کہ انیسویں صدی بھی کیسی پر پیچ اور عظیم الشان صدی تھی۔ ایک طرف عہد وسطیٰ کی تہذیب کا چراغ گل ہو رہا تھا، دوسری طرف انگریزوں کے توسط سے ایک نئی تہذیب کی آمد آمد تھی۔ غالب کے یہاں ڈھلتی ہوئی تہذیب کا نوحہ بھی ہے اور نئے علوم و افکار کا خیر مقدم بھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ انگریزی اقتدار کے ساتھ عقلیت، سائنس اور ٹکنالوجی کی جو سوغات ہندوستان پہنچی تھی، اس کے بدلے میں انگریزوں نے بھی ہندوستان بلکہ پورے مشرق سے کچھ کم تر سرمایہ نہیں سمیٹا۔ مشرقی فنون، مغلیہ تہذیب کے آثار اور سنسکرت، فارسی، اردو کے ادبی سرمایے کی عظمت سے مغرب نے انیسویں صدی کے دوران ہی واقفیت حاصل کی۔ حافظ، سعدی، رومی اور خیام کا جادو تو ایسا تھا کہ مغربیوں نے ان کے شعری اسلوب تک کی پیروی شروع کر دی۔ علامہ اقبال نے پیام مشرق کے دیباچے میں ایسے کئی جرمن شاعروں کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے فارسی کے تخلص اختیار کر لیے تھے اور غزلیں کہنے لگے تھے۔

غالب اور ان کے مغربی معاصرین

۲۷ دسمبر کی شام کو غالب اکادمی نے بھی حسب روایت ایک یادگاری خطبے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ خطبہ ''غالب اور ان کے مغربی معاصرین'' کے عنوان سے ہندی کے نامور ادیب، صحافی اور دانشور وشنو کھرے صاحب نے پیش کیا۔ جلسے کی صدارت دلی یونیورسٹی میں شعبۂ انگریزی کے صدر، پروفیسر ہریش ترویدی نے کی۔ پروفیسر ہریش ترویدی ہندوستانی ادبیات اور انگریزی کے ممتاز عالم ہیں۔ مشرقی اور مغربی شعریات پر ان کی گہری نظر ہے۔ غالب اور عہد غالب سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ وشنو کھرے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی اور انگریزی کے معروف صحافی بھی ہیں۔ برسوں دلی یونیورسٹی میں انگریزی پڑھائی۔ پھر ساہتیہ اکیڈمی میں ایک بڑے منصب پر فائز رہے۔ وہاں سے بھی جی اکتایا تو ٹائمس آف انڈیا، اس کے بعد 'نو بھارت ٹائمس' کے مدیر ہو گئے۔ مشرق و مغرب کی آدھی درجن سے زیادہ زبانوں میں لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ نہایت کھلا ذہن رکھتے ہیں۔ انھوں نے یورپ اور امریکہ کے ان تمام معروف شاعروں پر نظر ڈالی جو غالب کے ہم عصر تھے۔ پھر غالب کی بصیرت کا ان سب کی بصیرت سے موازنہ کیا اور اس نتیجے تک پہنچے کہ غالب انیسویں صدی میں ہندوستان بلکہ پورے مشرق کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اس عہد کی دنیا کے پانچ سات بڑے شاعروں میں بھی اپنا امتیاز رکھتے تھے۔ مغلیہ تہذیب نے جاتے جاتے بھی کیسی لازوال دولت اس ملک کو دی ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی، اردو، تاج محل اور دیوان غالب، یہ تینوں تحفے انہی کی طرف سے ہیں اور ہماری اجتماعی تاریخ کی ملکیت، ایک مشترکہ وراثت۔

بغداد سے جارج بش اور بام تک

ایک زلزلہ آیا اور بام (ایران) کے دو ہزار سالہ تاریخی آثار اپنے تیس ہزار مکینوں کے ساتھ ڈھے گئے۔ کیسی دل دوز تباہی ہے، فطرت کے ہاتھوں۔ دنیا کانپ اٹھی۔ سچ مچ انسان بے بس ہے۔ لیکن یہ کیسا ستم خود انسان کے ہاتھوں انسان پر۔ بربادی کی ایک نئی تاریخ لکھی جا رہی ہے، اجتماعی سطح پر۔ امریکی صدر جارج بش دنیا کی تاریخ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ دنیا کی

سب سے پرانی تہذیب ان کے جبر، جور وستم اور جہالت کی زد پر ہے۔ پچھلے ہفتے 'دنیا زاد' کراچی کے لائق و فائق مدیر آصف فرخی کی طرف سے 'دنیا زاد' کا خاص نمبر ''میں بغداد ہوں''، موصول ہوا۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحوں کی اس غیر معمولی اور خصوصی اشاعت کے ہر صفحے پر ہمارے زمانے کے ایک بہت بڑے انسانی المیے اور امریکی سیاست کے سامنے انسانی بے بسی کی ہولناک داستان بکھری پڑی ہے۔ جہاں تہاں سے کچھ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

امریکہ پاگل ہوگیا ہے

اس عنوان کا مضمون جان لی کیرے نے لکھا ہے۔ ترجمہ آصف فرخی نے کیا ہے۔ کچھ جملے یوں ہیں کہ ''امریکہ اپنے تاریخی پاگل پن کے ادوار میں سے ایک دور میں داخل ہوگیا ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے یہ ان میں سے بدترین ہے۔ میکارتھی ازم سے بدتر، بے آف پگز سے بدتر اور طویل میعاد میں، یہ امکانی طور پر ویت نام کی جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ امریکی عوام کو محض گمراہ نہیں کیا جارہا ہے۔ اسے دھمکایا جارہا ہے اور لاعلمی اور خوف کی حالت میں رکھا جارہا ہے۔ بڑی احتیاط کے ساتھ مرتب کیا ہوا یہ اعصابی خلل بش اور ان کے رفیق کارسازشیوں کو بڑے مزے سے اگلے الیکشن تک لے جائے گا۔ جو چیز داؤ پر لگی ہے وہ ''شر کا مداز'' نہیں ہے بلکہ تیل ہے اور پیسہ اور لوگوں کی زندگیاں۔ صدام کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخیرے پر براجمان ہیں۔ بش کو یہی درکار ہے اور اسے حاصل کرنے میں جو ان کی مدد کرے گا، اسے بھی لوٹ کے مال میں حصہ مل جائے گا اور جو مدد نہیں کرے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔

اس سب معاملے میں ٹونی بلیئر کا جو کردار ہے اس کی سب سے زیادہ رحم دل تشریح یہ ہوگی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ شیر کی سواری گانٹھنے سے وہ اس شیر کو اپنی مرضی سے چلا بھی سکیں گے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ بہت ہنسی کی بات ہے کہ ایسے وقت میں جب بلیئر زبانی جمع خرچ میں پھنس چکے ہیں تو برطانیہ کی حزب اختلاف کا کوئی رہنما ان پر ہاتھ نہیں رکھ سکا۔ مگر یہ برطانیہ کا المیہ ہے جس طرح سے امریکہ کا بھی ہے: ہماری حکومتیں گردش میں آتی ہیں، جھوٹ بولتی ہیں، اپنا اعتبار کھوتی ہیں تو رائے دہندگان بس کندھے اچکا کر منھ پھیر لیتے ہیں۔''

مصطفی ارباب کی دو نظمیں

مہذب لوگ

وہ نئے رنگ
نئی روشنیوں
اور
تعمیرنو کے لیے
ترتیب اور توازن کے ساتھ
اس دنیا کو
تباہ کر رہے ہیں۔

آتش بازی

انھیں
آگ اچھی لگتی ہے
چاہے کہیں بھی لگے۔
آتش بازی
ان کا مشغلہ ہے
کثرت استعمال سے
بارود پر لاگت بڑھ گئی ہے
اب وہ
آگ اور آتش بازی کے لیے
ہمارے دل جلاتے ہیں۔

اختتامیہ (جارج بش کے ہم وطن شاعر فرلنگیٹی کی ایک نظم سے)

عراق کے بارے میں بولو
اور ایک دیوانگی پورے ملک میں
اور جڑواں ٹاور پر حملے کو امریکا
تیسری عالمی جنگ کے آغاز میں تبدیل کر رہا ہے
تیسری دنیا سے جنگ
اور واشنگٹن کے دہشت گرد
سارے نوجوانوں کو بھرتی کر رہے ہیں
اور کوئی نہیں بولتا
اور وہ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں
سارے عمامے، پگڑی والوں کو
سارے عجیب تارکین وطن کو
اور وہ سارے نوجوانوں کو
موت کے کھیتوں میں دوبارہ بھیج رہے ہیں
اور کوئی نہیں بولتا
تم سب کہ آزادی کے متوالے ہو
تم سب کہ تلاش مسرت کے متوالے ہو
تم سب کہ محبت کرنے اور سونے والے ہو
اپنے ذاتی خوابوں کی گہری نیند میں
یہی وقت ہے کہ بولو
اے خاموش اکثریت
اس سے پہلے کہ وہ تم کو پکڑنے آجائیں۔

(ترجمہ: آصف فرخی)

کتابی سلسلہ دنیازاد، پتہ: شہرزاد، بی 155، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی (پاکستان)

یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین
یہ شہر تو مجھے جلتا دکھائی دیتا ہے

بغداد کو میں نے پہلے پہل جب دیکھا تھا، اس وقت افق سے صبح کی سفیدی پھوٹ رہی تھی۔ ابھی میں نے اپنے ہوٹل المردیان فلسطین (جہاں حالیہ امریکی جارحیت کے دوران زبردست دھماکے ہوئے) کے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ فجر کی اذان سنائی دی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، سب سے پہلے ایک میناروالی اس مسجد پر نظر پڑی جو ٹیلی ویژن کے پردے پر بغداد شہر کی پہچان بن گئی ہے۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی اور دنیا کی سب سے قدیم تہذیب کے سحر میں ڈوبا ہوا یہ شہر بہت پرسکون، پاکیزہ اور پرعظمت دکھائی دیتا تھا۔

بغداد کے قیام میں جن شہروں اور علاقوں سے بھی گزر ہوا۔۔۔۔ حلہ، نینوا، بابل، کوفہ، فلوجہ، نصیریہ، بصرہ، ریگستان اور ویرانے، بستیاں اور بازار، تاریخی عمارتیں اور زیارت گاہیں۔۔۔۔۔ دو سخت گیر آنکھوں اور تپے ہوئے طاقتور چہرے والے ایک وجیہہ اور بارعب انسان کی موجودگی کا احساس ہر جگہ ہوتا تھا۔ کسی کسی وقت یہ دیکھ کر وحشت بھی ہوتی تھی۔ صدام حسین کا سایہ سرزمین عراق سے کم وسیع و عریض نہیں ہے۔ ہر طرف صدام حسین کی شبیہیں، کٹ آؤٹ، مجسمے، ہر طرف صدام حسین کے پوسٹر، ہر طرف صدام سے منسوب اشعار، نعروں اور نغموں کی گونج۔ جارج آرول کے مطلق العنان Big Brother سے تعارف کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ صدام حسین کے اقتدار کی کمند سے کوئی شے، کوئی شخص، کوئی منظر آزاد نظر نہیں آتا تھا۔

یہاں تک کہ فرشتوں جیسی شکل وصورت والے بھولے بھالے بچے اور بچیاں تک صدام کی عظمت کے راگ الاپتے تھے۔ حمورابی کے شہر بابل کی اس ہزاروں برس پرانی شاہراہ پر، جہاں سے کبھی شاہی جلوس گزرتا تھا اور ہر طرف قدیم زمانوں کے آثار تھے، ہر پتھر، ہر اینٹ پر

صدام کا نام کندہ ہے۔صدام نے پرانے عراق کی بنیادوں پر ایک نئے عراق کی تعمیر کی ہے۔ بغداد کو دنیا کے سب سے پرشکوہ اور خوبصورت شہروں کا ہم پلہ بنادیا تھا اور عراقیوں کے معیار زندگی کو متمدن اور متمول مغربیوں کی سطح تک پہنچادیا تھا۔

بڑے بش کی کمان میں پچھلی خلیجی جنگ کے بعد سے عراق کو سختیوں اور اقتصادی پابندیوں کے جن مراحل سے گزرنا پڑا، ان کی وجہ سے اس مغرور اور شاندار ملک کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔لیکن چھوٹے بش کی تھوپی ہوئی حالیہ جنگ سے پہلے عراقی ٹوٹ تو گئے تھے مگر جھکے نہیں تھے۔ چنانچہ اپنی خستہ حالی کے باوجود مطمئن اور مسرور دکھائی دیتے تھے۔صدام حسین کی بے مثال اور لائق قیادت نے انھیں پریشانیوں میں بھی وقار کے ساتھ رہنا سکھادیا تھا۔عراقی دنیا کی سب سے جاندار قوموں میں شمار کیے جاتے ہیں. فلسطینیوں کی طرح!

ایک طرف عراق کی یہ تصویر ہے، دوسری طرف عراقیوں پر آمرانہ حکومت کرنے والے اس نیم معذور شخص کی تصویر جو امریکی فوجوں کی حراست میں آنے کے بعد صدام کی تصویر ہے۔ بکھرے ہوئے بال، بڑھی ہوئی داڑھی، ماتھے پر گہری سلوٹیں، آنکھوں میں بسی ہوئی تھکن سے پیدا ہونے والی وحشت ۔۔۔۔۔ راضی بہ رضا۔جارج بش کے کارندے صدام حسین کی ایسی شبیہ دنیا کو دکھانا چاہتے تھے کہ امریکی اقتدار کا رعب قائم ہو اور صدام حسین کی بے بسی کا تاثر اتنا شدید ہو کہ آئندہ کسی کو امریکہ کے خلاف سر اٹھانے کا خیال بھی نہ آئے۔لیکن کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ دنیا بھر کے سیاسی تجزیہ کار یہی کہتے ہیں کہ امریکہ کے سامنے راستہ بہت طویل اور کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ عراق کے کوچہ و بازار بھی اسی سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔بقول اقبال: پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

شیخ بھی ہے آدمی کردار کا

مرکز کی کھچڑی سرکار نے یہ دعویٰ بار بار کیا کہ اس نے موجودہ حالات کے پیش نظر بی جے پی کا ایجنڈا فی الحال سرد خانے میں ڈال دیا ہے اور جس ایجنڈے کے مطابق سرکار کام کر رہی ہے اسے تمام حلیف جماعتوں کی تائید حاصل ہے۔حقیقت کیا ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ ہر فرقہ پرست گروہ کی طرح بھاجپائیوں کی نظر بھی سب سے زیادہ ہمارے ثقافتی اور تعلیمی اداروں پر رہی

ہے۔ دوررس تبدیلیاں لانے کے لیے عوام کے شعور کی جہتیں بدلنا ضروری ہے۔ چنانچہ ماضی بھی نرغے میں ہے اور مستقبل بھی۔ تہذیبی اور فکری کامرانی کا کوئی بھی ایسا نشان سلامت نہیں رہنا چاہیے جو ہندو، ہندی، ہندوستان کے دائرے سے باہر ہو۔ تاریخ مسخ کی جارہی ہے۔ آثار مسخ کیے جارہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی بے جان قبریں بھی محفوظ نہیں رہیں جن میں ایک مشترکہ اور روشن ماضی کی یادیں دفن ہیں۔

اس طرز فکر کے سب سے سرگرم نمائندوں میں ہمارے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی بھی شامل ہیں۔ ان کی سربراہی میں اب ایک نیا گل کھلا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے پیشہ ورانہ کورسز میں ایک مشترکہ داخلہ جاتی امتحان کا شوشہ چھوڑا ہے۔ یونیورسٹیاں خودمختار سمجھی جاتی ہیں۔ اب علی گڑھ، جامعہ اور جامعہ ہمدرد اپنی خودمختاری کی خیر منائیں۔ اپنے مداحوں کے ایک حلقے میں مرد آہن اور "اردو کے ماتھے کا تلک" کہے جانے والے پروفیسر جوشی کے ان الطافِ بے پایاں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یو جی سی کی نئی پالیسی کے نفاذ کا انجام سمجھنے کے لیے نجومی ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس پالیسی کی تہہ میں جو ذہن بلکہ ذہنیت کام کر رہی ہے اس کی پہچان کے لیے معمولی سوجھ بوجھ بھی کافی ہے۔

ہونٹ جب تک ہیں سوالات کی زنجیر کہاں کٹتی ہے

یہ مصرعہ وحید اختر کی ایک نظم کا ہے۔ آج سے آٹھ برس قبل پہلے اسی موسم درد (دسمبر ۱۹۹۵ء) میں وحید اختر ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ اپنے ہم عصروں میں وہ کئی لحاظ سے ممتاز تھے۔ ایک خوش فکر شاعر، انتہائی ذہین نقاد، مقرر، خطیب، دنیا کے مسئلوں پر بہت منظم انداز سے سوچنے والے۔ وحید اختر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتے تھے۔ ان کا جدید علوم وافکار کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خواجہ میر درد کے تصوف اور شاعری پر ان کی تحقیقی کتاب کے علاوہ "فلسفہ اور ادبی تنقید" کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ، ان کی غزلوں، نظموں اور مرثیوں کی کتابیں، بیسویں صدی کے نصف آخر میں شائع ہونے والے اہم ادبی جریدوں میں ان کے مضامین ان کی یادگار ہیں۔ مزاجاً وحید اختر تعلقات بنانے والے یا پبلک ریلیشننگ کے آدمی نہیں تھے۔

انھوں نے نہ تو اپنا کوئی حلقہ بنایا، نہ ایسوں سے تعلق قائم کرنے کے روادار ہوئے جو ان

کے لیے شہرت اور منفعت کا ذریعہ بن سکتے تھے۔ اچھے اچھوں کو بھی وہ خاطر میں کم ہی لاتے تھے۔ چہ جائے کہ چوہا دوڑ کی موجودہ سرگرمی سے شغف رکھنے والی مخلوق جو صرف دنیوی کامیابی اور کامرانی سے سروکار رکھتی ہے، چاہے اس کے لیے جو بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ وحید اختر نے ایک وقیع اور بلند مرتبت ذہنی زندگی گزاری۔ عملی سطح پر یہ زندگی مایوسیوں، ناکامیوں اور پریشانیوں کا مرقع تھی۔ لیکن انہی نے یہ بھی تو کہا تھا کہ:

ہے فکر کے شعلوں میں جہنم کی عقوبت
دنیا ہی میں جنت ہے اگر سر میں خلا ہے

تذکرہ خان صاحب اور خواجہ صاحب کا

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

موجودہ دور میں رشید حسن خاں ہمارے سب سے ممتاز اور معروف محقق ہیں۔ لیکن لفظ محقق کے ساتھ ہمارے ذہن میں وہ جو روکھی پھیکی سی ایک شبیہ ابھرتی ہے خان صاحب بظاہر اس سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ جب تک دلی میں رہے، ان کی شامیں بالعموم کناٹ پیلس کے کافی ہاؤس میں گزرتی تھیں۔ ہاکی، فٹ بال کے میچ شوق سے دیکھتے تھے۔ مغربی وضع کے کپڑے پہنتے تھے۔ رہن سہن کا انداز جدید تھا۔ دلی یونیورسٹی کے گوائر ہال میں انھوں نے برسوں قیام کیا۔ جس سلیقے اور ترتیب و تنظیم کے ساتھ وہ اپنی کتابیں رکھتے تھے، وہی نظم و ضبط ان کی طبیعت میں بھی تھا۔ انھیں کبھی بھی کسی نے اپنا یا دوسروں کا وقت ضائع کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دلی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور چلے گئے۔ ان دنوں وہی رہتے ہیں اور جو لوگ شاہجہاں پور میں انھیں دیکھ چکے ہیں، بتاتے ہیں کہ خان صاحب کا انداز اور ادائیں اب بھی وہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر، گرتی ہوئی صحت، ماحول کی سختی اور زندگی کے مطالبات کی درشتی انھیں ذرا بھی پسپا نہیں کرسکی۔ دن رات اپنی کتابوں کے ساتھ اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے روایتی رکھ رکھاؤ، وقار اور خاموشی کے ساتھ دنیا کے دکھ سہتے ہیں۔ مگر کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی تقاضہ نہیں، سوائے اس کے کہ ان کی خلوت گزینی اور گوشہ نشینی میں خلل نہ پڑے۔

اسی اصول پسندی اور اپنے آپ پر عاید کردہ تنہائی کے فیض سے خان صاحب نے دلی چھوڑنے کے بعد سے چند برسوں کے اندر جو غیر معمولی علمی کارنامے انجام دیے اس کے لیے

ایک عمر چاہیے۔ اور وہ بھی کس قدر مشکل حالات میں۔ خان صاحب نے کلاسیکی متنوں کی ترتیب و تدوین کا جو سلسلہ برسوں پہلے شروع کیا تھا، اس میں ادھر پہلے سے زیادہ تیزی آئی ہے۔ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنویات شوق، گلزار نسیم کے بعد، ادھر سحر البیان، مصطلحات ٹھگی، کلاسیکی ادب کی فرہنگ اور زٹل نامہ کے نام سے خان صاحب کی تحقیق و تدوین کے جو کارنامے شائع ہوئے ہیں، ان سے اردو زبان و ادب کی دنیا میں ایک نیا معیار قائم ہوا ہے۔ ان کتابوں کا کمال صرف یہی نہیں کہ ان سے ہمارے زمانے کے ایک برگزیدہ اور بے مثال محقق کی انتھک محنت اور علمی لگن کا خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ خان صاحب کی اس سرگرمی نے ایک معنی خیز تاریخی رول بھی ادا کیا ہے۔ ہمارے زمانے کے المیوں میں ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ لوگ اپنے ماضی کو بھولتے جا رہے ہیں۔ حال کا چکر پانو میں ہے اور اپنا اپنا مستقبل بنانے کی ایسی فکر کہ کسی کو اپنے تہذیبی ورثے اور روایت کو سنبھالنے کا خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن زبان و ادب کے نئے طالب علموں میں خان صاحب کی ان کتابوں کی اشاعت سے ایک نیا شوق اور حوصلہ جاگا ہے۔ اپنے کلاسیکی سرمائے کی قدر و قیمت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا ہے۔ یہ کتابیں نوجوانوں میں بھی مقبول ہوئی ہیں اور اعلیٰ درجات کی سطح پر اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس میں بھی ان کتابوں کی اشاعت سے آسانیاں پیدا ہوئی ہیں۔

خان صاحب کی بیشتر کتابیں اپنے حجم کے لحاظ سے بھی بہت وقیع اور بھاری بھرکم ہیں۔ اس سلسلے میں لامحالہ ہمارا ذہن عہد حاضر میں اردو کتابوں کی اشاعت اور کھپت کے مسئلوں کی طرف بھی جاتا ہے۔ اردو کے زیادہ تر ناشر صرف ایسی کتابوں کو ہاتھ لگاتے ہیں جو عام دلچسپی کی ہوں۔ روکھی سوکھی علمی کتابوں کا چھپنا اور بکنا آسان نہیں ہے۔ ہم سب کو انجمن ترقی اردو کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے خان صاحب کی کتابوں کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھایا، چنانچہ یہ تمام کتابیں انجمن نے شائع کی ہیں اور انتہائی توجہ اور خوش مذاقی کے ساتھ ان کی طباعت کا اہتمام کیا ہے۔

ابھی حال میں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی طرف سے خان صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں راجہ رام موہن رائے اعزاز دیا گیا ہے۔ یہ بجائے خود اس ادارے کا اعزاز بھی ہے۔ اردو دنیا پر خان صاحب کا قرض اس سے کہیں زیادہ ہے۔

آخر تمھیں صدمہ کیا پہنچا کیا سوچ کے خود آزار ہوئے؟

کراچی سے خبر آئی ہے کہ مشفق خواجہ صاحب بیمار ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے جب مشفق خواجہ صاحب کی برسوں کی تلاش و تحقیق کا حاصل، ان کی مرتبہ ''کلیات یگانہ'' سامنے آئی تھی۔ خواجہ صاحب ہمارے زمانے کے سب سے مقبول کالم نویس ہیں اور ہمارے سب سے بڑے محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی ظرافت طبع کا اظہار ان کے کالموں میں ہوا ہے، ان کے علمی ظرف اور ذہانت کا اظہار تحقیقی کتابوں اور مقالات میں، ان کے علمی کارناموں میں تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا''، ''جائزہ مخطوطات اردو''، ''غالب اور صفیر بلگرامی'' کو ہمارے علمی معاشرے میں غیر معمولی قبولیت ملی۔ تخلیقی ادب کے مدیر و مرتب ایک خوش فکر غزل گو اور (خامہ بگوش کے قلمی نام سے) ادبی کالم نویس کی حیثیت سے بھی مشفق خواجہ صاحب کی شہرت اور پذیرائی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لیکن ''کلیات یگانہ'' کی تدوین و ترتیب میں تو انھوں نے جس حیرت انگیز دیدہ ریزی، تفحص اور جاں کاہی کا ثبوت دیا ہے، اسے ایک بہت بڑی علمی مہم کے سر کرنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحوں کی اس کتاب کے ہر صفحے پر مشفق خواجہ کے عالمانہ تجسس اور انہماک کی مہر ثبت ہے۔ دیباچۂ مرتب کے طور پر کتاب کے شروع میں خواجہ صاحب کی جو تحریر شامل ہے، اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

''میں نے پہلے تو کلیات کے تمام الفاظ و محاورات جمع کیے اور پھر ان کا انتخاب کیا اور متعدد مستند لغات سے استفادہ کر کے معانی لکھے۔ فرہنگ کا مسودہ میں نے اردو کے ممتاز محقق اور زباں داں جناب رشید حسن خاں کی خدمت میں رہنمائی کے لیے ارسال کیا۔ انھوں نے فرہنگ کے الفاظ میں مزید کمی کی اور میرے تحریر کردہ معانی کو اغلاط سے پاک کیا۔ یہی نہیں جن الفاظ کے معانی مجھے لغات میں نہیں ملے تھے، خان صاحب نے ان کے معانی متعین کیے۔ یہی وجہ ہے کہ فرہنگ میں متعدد مقامات پر خان صاحب کے حوالے سے اور انھیں کے الفاظ میں معانی درج کیے گئے ہیں۔''

خواجہ صاحب نے ایسے کئی دوستوں اور بزرگوں کا ذکر اپنے دیباچے میں کیا ہے، جن سے انھوں نے کلیات یگانہ کی تدوین کے دوران کچھ مدد لی تھی، لیکن خود انھوں نے جس مشقت اور

دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی تفصیلات خواجہ صاحب نے بہت انکسار کے ساتھ بیان کی ہیں۔ ایسی کشادہ قلبی اور اعلیٰ ظرفی ہمارے علمی معاشرے میں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

یوں بھی خواجہ صاحب بہت شرمیلے اور اپنے آپ میں گم رہنے والے انسان ہیں۔ ان کے گھر میں گیارہ کمرے ہیں۔ دس کمروں میں خواجہ صاحب کی کتابیں رہتی ہیں۔ بس ایک کمرہ ان کے ذاتی استعمال کے لیے ہے۔ کتابوں کا ایسا نجی ذخیرہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ خواجہ صاحب نے ان کی دیکھ بھال کے لیے پانچ چھ ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ جلسے جلوس سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ طالب علموں کی مدد کے لیے ہمیشہ آمادہ۔ اپنی شاعری کی طرف بھی ان کا رویہ بے نیازی کا ہے۔ بہت عمدہ شعر کہتے ہیں لیکن نہ کسی کو سناتے ہیں نہ بالعموم چھپواتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا مجموعہ ابیات برسوں پہلے چھپ گیا تھا اس کے بعد سے خاموشی ہے۔ خود اپنے آپ سے انھوں نے ایک سوال پوچھا:

کیوں راستہ چھوڑ کے چلتے ہو۔ کیوں لوگوں سے کتراتے ہو۔ کیوں چلتے پھرتے اپنے لیے تم آپ ہی اک دیوار ہوئے۔

اس سیدھے سادے سوال کا ایک جواب خواجہ صاحب کی علمی فتوحات بھی ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہوں اور ان کا علمی سفر اسی عالمانہ شان، تمکنت اور وقار کے ساتھ مدتوں جاری رہے۔ ہمارے ادبی معاشرے میں زمانہ سازوں اور مصلحت نوازوں نے دھوم مچا رکھی ہے۔ ان کی وجہ سے علم و ادب کے وقار کو جو صدمے پہنچے ہیں ان میں خان صاحب اور خواجہ صاحب جیسے منتخبات کے وجود سے ہی کچھ کمی آ سکتی ہے۔

چہرے، مکان، راہ کے پتھر بدل گئے

فضیل جعفری کے شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔۔۔جھپکی جو آنکھ شہر کے منظر بدل گئے۔واقعی سوچیں تو حیرانی ہوتی ہے۔یقین نہیں آتا۔میڈیا دن رات چیختا رہتا ہے شائننگ انڈیا۔شائننگ انڈیا۔لیکن ہمارے شہروں میں، قصبوں میں، گاؤں میں یہ چمک کہیں نظر نہیں آتی۔دل ویسے ہی بجھے ہوئے۔سیاست داں اسی طرح اقتدار کی کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس کے سبب بلکان۔عام انسان جتنا پریشان کل تھا، آج بھی ہے۔البتہ ایک بڑی تبدیلی ادھر پاکستان کی طرف ہمارے رویے میں آئی ہے۔اب ''دشمن ملک'' کی بات کم ہوتی ہے، دوستی کا تذکرہ زیادہ ہوتا ہے۔یہ صورت اگر آنے والے انتخابات کے بعد بھی باقی رہے تب ہے۔ورنہ تو سیاست دانوں کے کسی قول فعل کا کیا بھروسہ!

لیکن غیر سرکاری اداروں نے کچھ ٹھوس قدم بھی اس سلسلے میں اٹھائے ہیں۔پچھلے اکتوبر میں ہندوستانی ادیبوں کا ایک وفد پنجابی زبان کی معروف ادیبہ اور اکیڈمی آف فائن آرٹس اینڈ لٹریچر کی سربراہ اجیت کور کی قیادت میں پاکستان گیا تھا۔لوٹ کر آنے والوں کا تاثر یہ تھا کہ دونوں ملکوں کے عوام پچاس پچپن برس کی کھینچ تان سے عاجز آچکے ہیں۔مل جل کر رہنا چاہتے ہیں۔بیچ کی دوریوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔یہ ایک خوش آئند بات ہے۔لیکن اس کے لیے ضروری ہے سیاست کی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے کو سمجھنا۔ادبی، تہذیبی، اقتصادی، سماجی لحاظ سے ہندوستان اور پاکستان میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ ایک دوسرے سے لڑائی اور دشمنی کا جذبہ غیر فطری لگتا ہے۔گویا کہ ایک دوسرے سے لڑنا دراصل اپنے آپ سے لڑنا ہے۔اگر یہ رمز نفرت اور اقتدار کی سیاست کا چکر چلانے والوں کی سمجھ میں بھی آجائے تو دونوں ملکوں کی اجتماعی زندگی میں سچ مچ ایک سنہرا، چمک دار انقلاب آسکتا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز کی اکیڈمی نے اس سمت میں بہت موثر قدم اٹھائے ہیں۔ان دنوں اس اکیڈمی کے ڈائریکٹر ہیں معروف مورخ اور دانشور پروفیسر مشیر الحسن۔مشیر صاحب کی قیادت میں یہ اکیڈمی اب ایک وسیع ،عالم گیر سطح پر توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔عراق، فلسطین، دہشت گردی ،سارک ممالک سے متعلق علمی مذاکرات اور مطالعات کا ایک مستقل سلسلہ سامنے ہے۔کئی نامور علما اور اساتذہ اکیڈمی سے وابستہ ہیں۔پچھلے دنوں اس اکیڈمی کے تحت پاکستان اسٹڈیز پروگرام کی شروعات ہوئی۔اندر کمار گجرال صاحب (سابق وزیر اعظم) نے پروگرام کا افتتاح کیا۔اس جلسے میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب منور سعید بھی شریک تھے۔انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں اکیڈمی نے دو روزہ مذاکرے کا اہتمام بھی کیا۔ہندوستان اور پاکستان کے روابط کا اور پاکستانی معاشرے کو درپیش مسئلوں کا جائزہ کئی زاویوں سے لیا گیا۔ان میں ایک زاویہ ادب کا بھی تھا۔کیا ادب کو پاکستانی معاشرے کی تفہیم وتعبیر کے ایک وسیلے یا ایک ماخذ کے طور پر برتا جا سکتا ہے؟ پاکستان سے آئے ہوئے کچھ ادیب بھی ان بحثوں مین شریک ہوئے۔بہت سی باتوں کے ساتھ ساتھ ایک سچائی جو کھل کر سامنے آئی ،یہ تھی کہ دونوں ملکوں کے عوام شک و شبہ اور بے اعتباری کی فضا سے تنگ آ چکے ہیں۔اب انھیں دوستی، مفاہمت اور باہمی تعاون کے ماحول کی جستجو ہے۔نفرتوں کی طویل مشق کے بعد محبت کا ایک چھوٹا سا تجربہ بھی کیا برا ہے؟

اصل میں ادب کسی بھی معاشرے کا رفتار پیما ہوتا ہے،اس معاشرے کی ذہنی اور جذباتی صورت حال کو سمجھنے کا سب سے معتبر وسیلہ ہوتا ہے۔ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ صرف سیاسی یا اقتصادی مسئلہ نہیں ہے،اس مسئلے کا انسانی پہلو سیاسی اور سماجی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے،چنانچہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی سطح پر ہی دونوں ملکوں کے مشترکہ مسائل کا جائزہ لیا جائے۔اس سلسلے میں ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ ادبی روایتیں،فنون اور ثقافتیں مطالعے کا بہت وسیع میدان سامنے لاتی ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز اس سمت میں ایک نہایت مفید اور موثر پیش رفت کی نشاندہی کرتی ہے۔

برائے درس اب اطفالِ شہر آتے ہیں

تقریباً ہر روز کسی کھلاڑی، کسی اداکار، کسی سیاسی بہروپیے کے بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہونے کی خبر سنی جاتی ہے۔ خاص طور پر فلمی اداکاروں میں برسر اقتدار پارٹی کی مقبولیت یہ بتاتی ہے کہ یہ اپنے سے بڑے اداکاروں کی طرف محض شوقیہ تو آتے نہیں، ضرور ان کے ہنر کا لوہا مانتے ہیں اور ان سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ اس پارٹی کے پیشواؤں نے جب سے رواداری، سیکولرزم، سماجی انصاف کی مالا جپنی شروع کی ہے، بڑے سے بڑا اداکار بھی ہمت ہار بیٹھا ہے اور جاگتی آنکھوں سے یہ خواب تماشا دیکھ رہا ہے کہ نہرو جی اور مولانا آزاد جیسے مہارتھیوں کے سائے میں اگنے والے نحیف و نزار پودے بھی چھتنار بننے کی طلب میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ اپنے خاندانوں کا ناموس، اپنا شخصی وقار اور اپنا رہا سہا اعتبار، سب کچھ داؤں پر لگا بیٹھے ہیں۔ مقام عبرت ہے کہ ان میں اپنے دین ایمان تک کو مذاق بنانے والے بھی کشاں کشاں کھنچے آ رہے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو کم سے کم انھیں گجرات کے مظلوموں کا خیال تو آنا ہی چاہیے کہ یہ قصہ سنی سنائی ہی نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی اور جیتی جاگتی سچائیوں پر مبنی ہے۔ یہ اصحاب اور خواتین (خاتون!) ضمیر کے مجرم تو ہونے سے رہے کیونکہ ضمیر جیسی کوئی چیز ہوتی تو ایسا ہوتا ہی کیوں؟ لیکن کم سے کم انھیں اپنی قوم کا، انسانیت کا مجرم تو کہا ہی جا سکتا ہے۔ مسلمان تو خیر ایک ستم رسیدہ اور پسماندہ قوم ہے، جسے فاشزم کا تجربہ کرنے والی جماعت کے اشاروں پر ناچنے گانے والے مداری بھی اب خاطر میں نہیں لاتے۔ بعضے تو اپنی ریش دراز اور جبہ و دستار کے ساتھ اینڈتے ہوئے بی جے پی کی طرف جاتے ہیں لیکن ذرا ان روشن خیال، انسان دوست، باضمیر غیر مسلموں کے بارے میں بھی تو سوچیے جو فرقہ پرستی کے خلاف جنگ میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں اور مسلمانوں کی ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ ہندی اور انگریزی اخبارات میں ان کے بیانات آئے دن چھپتے رہتے ہیں۔

بی جے پی نواز "اہل اسلام" کو ان کے آئینے میں بھی اپنا چہرہ کبھی دیکھ لینا چاہیے۔ یہ جاہ طلب، حریص اور طالع آزما مسلمان جو بی جے پی کے خیمے میں جمع ہو رہے ہیں، ان کی وجہ سے ہم اپنے ساتھ ساتھ اپنے ان غیر مسلم دوستوں اور مددگاروں کی نظر میں بھی سبک ہو رہے ہیں۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی!

فاشزم کی تجربہ گاہ، بھوپال

پچھلے ہفتے ایک شام حبیب تنویر سے ملاقات ہوئی۔ بہت دکھی تھے، مدھیہ پردیش کی بھاجپا سرکار اس وقت ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ سادھوی اوما بھارتی کی ترجیحات اب کھل کر سامنے آگئی ہیں۔ بجلی، سڑک، پانی کے مسئلے پیچھے جا پڑے ہیں۔ گائے، گوبر، گئو موتر کی گونج مدھیہ پردیش کے زمین و آسمان پر غالب آگئی ہے۔ انتخابات کے ساتھ بی جے پی کا جو خوابنامہ (وژن ڈاکیومنٹ) سامنے آیا اس میں یہ بھی کہا گیا کہ گھروں کی بیرونی دیواریں اگر گائے کے گوبر سے لیپ دی جائیں تو نیوکلیئر حملے یا ریڈیئشن کے نقصانات سے اپنے آپ کو بچایا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے پہیے کو الٹا گھمانے کی یہ کوشش فاشزم کا پہلا اصول ہے۔ کہتے ہیں کہ فاشسٹوں کو سب سے برا لفظ جو لگتا ہے وہ "کلچر" یا "ثقافت" ہے۔ ہندوستان کی عظیم الشان ثقافت، باہمی میل جول اور رواداری کی ایک لمبی روایت بھی رکھتی ہے۔ اسی لیے تو ثقافت کے معنی بدلنے اور تاریخ کو نئے سرے سے لکھنے کی مشق جاری ہے۔ معاصر ہفتہ وار "تہلکہ" میں حبیب تنویر اور ہندی کے ممتاز شاعر راجیش جوشی کے حالیہ بیانات شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے بیانات سے کچھ اقتباس حسب ذیل ہیں۔

حبیب تنویر

"آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد ہماری ثقافت کے محافظ بن بیٹھے ہیں۔ انھوں نے تشدد آمیز طریقے سے ہمارے ناٹک (پونگا پنڈت) پر روک لگا دی۔ وہ تو اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ یہ ناٹک میرا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ تو صرف دلت عوامی روایت سے ماخوذ ہے، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک جمعدارنی کسی پونگے پنڈت کی مدد سے بھگوان تک پہنچنے سے انکار کر دیتی ہے۔

بھگوان کو براہ راست خطاب کرنا ہندو روایت کا حصہ رہا ہے۔ ہماری عوامی روایت میں ادب میں ایسے کردار آتے رہے ہیں جو پنڈوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ بہت سے شاہ کاروں میں مورکھ پنڈوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔

میں نے پونگا پنڈت کے سینکڑوں شو کیے ہیں، ہندو سماج کے سامنے، اور سب نے ان کا لطف لیا ہے۔ (اوما بھارتی سرکار نے) بھوپال ریلوے اسٹیشن کے آس پاس سے خوانچہ فروشوں اور ٹھیلے والوں کو بھگا دیا ہے۔ ان میں مسلمان پھل فروش تھے جو اپنے ہم پیشہ ہندوؤں کے ساتھ اطمینان سے اپنا کام کرتے تھے۔ اس وقت حکومت آر ایس ایس چلا رہی ہے۔ ذرا سوچیے تو... واجپئی جی (اس سب کے ہوتے ہوئے بھی) مسلمانوں سے ووٹ مانگنے کا حوصلہ رکھتے ہیں! مدھیہ پردیش گجرات کے بعد دوسری تجربہ گاہ بننے والا ہے اور ہندوستان چمک رہا ہے!!!

راجیش جوشی

"...بجلی، پانی، سڑک کے مسئلوں سے نمٹنے کے بجائے اوما بھارتی سرکار نے اس میدان میں دخل اندازی شروع کر دی ہے، جو اس کا نہیں ہے۔ سب سے پہلے اس نے کلچر کی طرف اپنے پنجے بڑھائے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اور بھارت بھون کے دو سینئر عہدیداروں کو آر ایس ایس مخالف لٹریچر فروخت کرنے کے جرم میں برطرف کر دیا گیا ہے۔ پردھان منتری جی کے بھانجے انوپ مشرا نے جو کلچر کے وزیر ہیں، ان کے علم و آگہی کی حد یہ ہے کہ استاد علاؤ الدین خاں کو بنگلہ دیشی کہتے ہیں اور ان کے نام سے وابستہ کلا اکیڈمی کا نام بدل دیا ہے۔ استاد علاء الدین خان نے اپنی پوری زندگی یہیں (مدھیہ پردیش میں) گزاری تھی۔ اس فیصلے کے خلاف احتجاج نے زور پکڑا تو فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ اب کے برس رمیش چندر شاہ کو پدم شری دیا گیا تھا۔ اب مدھیہ پردیش حکومت کہتی ہے کہ وہ تو کوئی ادیب ہی نہیں ہے۔

تو کیا اب سرکار یہ بتائے گی کہ ادب کیا ہے؟ ہماری بدبختی یہ ہے کہ مدھیہ پردیش سرکار کے ان اقدامات کے خلاف اس وقت کوئی سیاسی محاذ نہیں ہے۔ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود آج بھی کانگریس یہ محاذ قائم کر سکتی ہے، لیکن یہ اس لیے نہیں ہو رہا ہے کہ کوئی آگے آنے کے لیے تیار

نہیں۔ آر ایس ایس کو اسی لیے کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔"

پہنچی وہیں پہ خاک

مدھیہ پردیش کے سابق بھاجپائی وزیر عارف بیگ نے ایک عمر بی جے پی کے سایۂ عاطفت میں گزارنے کے بعد توبہ کرلی تھی اور بی جے پی سے دست برداری کا اعلان کھل کر کیا تھا۔ لیکن کہیں اور قدم جم نہیں سکے۔ سو دوبارہ بی جے پی میں واپس جا رہے ہیں۔ کلیان سنگھ بھی صبح کے بھولے شام ہوتے ہی لوٹ گئے۔ بی جے پی کے مسلمان رہنماؤں میں مختار عباس نقوی اور شاہ نواز حسین کی بس صورت دیکھیے اور باتیں سنیے۔ ان کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ اب اس کے نئے سالاروں میں عارف محمد خاں اور نجمہ ہبت اللہ کی آمد آمد کا شور ہے۔ انھیں کون بتائے کہ انسانی تاریخ کا ایک کوڑے دان بھی ہوتا ہے۔ اس کوڑے دان کو زمانے کی آنکھ نے کبھی خالی نہیں دیکھا۔

عشرت علی صدیقی اور سعید سہروردی کو مبارکباد

جارج آرول نے کہا تھا کہ جنگ (اور اجتماعی جدوجہد) کے زمانے کا ادب صحافت ہوتی ہے۔ اردو صحافت نے اپنے مجاہدانہ رول کی ادائیگی ہمیشہ غیر معمولی ذمے داری کے ساتھ کی ہے۔ اردو صحافت کی موجودہ ابتری ہماری اجتماعی زندگی کے زوال کی ہی ایک شکل ہے۔ لیکن اس خستہ وخراب صورت حال کے باوجود ذمے دارانہ صحافت کا چراغ روشن ہے۔ جناب عشرت علی صدیقی ہمارے بزرگ ترین صحافیوں میں شامل ہیں۔ قومی آواز کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے انھوں نے اردو صحافت کا جو معیار قائم کیا تھا، نئے صحافیوں کے لیے اس کی حیثیت چراغ راہ کی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب کے برس دلی اردو اکادمی نے اپنے اعلیٰ ترین اعزاز کے لیے عشرت علی صدیقی صاحب کا انتخاب کیا جب کہ صحافت کا ایوارڈ اس بار جناب سعید سہروردی کو ملا ہے۔

سعید سہروردی صاحب ادب کے راستے سے صحافت میں آئے، صحافت کی سطح روشن اپنی

بصیرت اور اپنے اسلوب سے ہوتی ہے۔ اردو صحافت کی موجودہ صورت حال کو بدلنے اور بہتر بنانے کا ایک موثر طریقہ یہ ہوگا کہ اچھے لکھنے والے صحافت کے میدان میں اتریں۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو صحافت کا ماضی جو اتنا روشن رہا تو اسی لیے کہ اسے ترقی دینے والوں میں مختلف زمانوں کے بہت سے اچھے لکھنے والے پیش پیش تھے۔ بہر حال، ہم اکادمی کو اس فیصلے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ برے ادب کی بہ نسبت اچھی صحافت کو ترقی دینا اردو کے حق میں یقیناً سود مند ہوگا۔

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(پہلی قسط)

زمین کے اس چھوٹے سے قطعے میں جسے بس پانچ سات منٹ کے اندر اندر پار کیا جا سکتا تھا، کتنی دل دوز کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ قطعہ No Man's Land کا تھا۔ یعنی کہ واگہہ سرحد کے مقام پر ہندوستان اور پاکستان کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والا۔ امرتسر سے اس جگہ تک پہنچنے میں مشکل سے چالیس منٹ لگے تھے۔ امیگریشن اور کسٹم کی کارروائیاں رعایتاً بہت جلد پوری کرلی گئیں۔ ہندوستانی پنجاب کے قلیوں نے ہمارا سامان کانٹے دار تاروں والی بڑھ، جس میں چوبیس گھنٹے بجلی دوڑتی رہتی ہے، اس سے آگے دو ملکوں کے بٹوارے کی لکیر تک پہنچایا۔ دوسری طرف سے پاکستانی پنجاب کے قلی دوڑتے ہوئے آئے اور ہمارا سامان اٹھا کر باب آزادی کی طرف چل پڑے۔ اس مہیب گیٹ کے اس پار پاکستان تھا۔

بٹوارے کی لکیر سے آگے جاتے وقت میں نے مڑ کر ہندوستان کو الگ کرنے والے مہیب گیٹ کی طرف دیکھا۔ ایک جیسے لوگ، ایک زمین، ایک آسمان، ایک موسم، ایک سی مہک، لیکن۔۔۔ اس قربت میں دوریوں کی کیسی عجیب داستانیں چھپی ہوئی تھیں۔

کل ملا کر ہم نو افراد تھے۔ معروف ہندی ادیب اور دانشور پروفیسر نامور سنگھ، ہندی کے ممتاز شاعر کنور نارائن اور اشوک باجپئی، کہانی کار کملیشور، ملیالم کے ڈاکٹر اشوک کوشی، پنجابی شاعر بلبیر مادھو پوری، انڈین ایکسپریس کی سینئر ایڈیٹر رینو کا نارائین، اردو کے ادیب اور علی گڑھ میں شعبۂ اردو کے پروفیسر قاضی افضال حسین۔

پنجابی ادیبہ اجیت کور کی سربراہی میں ہم سارک ممالک کے ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور جارہے تھے۔ یہ اس طرح کی دسویں کانفرنس تھی۔ اس سے پہلے نویں

کانفرنس دہلی میں دو سال پہلے ۱۳ دسمبر کی اس صبح کو منعقد ہوئی تھی، جب ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ ہوا تھا۔ اس صبح کا سارا منظر اس وقت آنکھوں میں ہے۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے آڈیٹوریم میں اندر کمار گجرال صاحب، وشوناتھ پرتاپ سنگھ، خوشونت سنگھ کی تقریروں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ صدر جمہوریہ شری نارائنن کے کانوں میں ان کے حفاظتی دستے کے ایک کارکن نے کچھ کہا۔ لمحے بھر کے لیے ان کے چہرے کا رنگ بدلا۔ پھر جلسے کی کارروائی تو جاری رہی لیکن وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد دونوں ملکوں میں تقسیم کی لکیر ہمیشہ سے زیادہ گہری ہو گئی۔ پروازیں بند، سمجھوتہ ایکسپریس ختم۔ آنے جانے پر مکمل پابندی۔ یہاں تک کہ دونوں ملکوں کے سفارتی رشتے بھی ٹوٹ گئے۔ لیکن سیاست کے رنگ موسموں کے رنگوں کی بہ نسبت زیادہ تیزی سے بدلتے ہیں۔ ادھر اچانک دونوں ملکوں کے رویے دھیرے دھیرے تبدیل ہوئے۔ جہاں "آر پار کی لڑائی" کا نعرہ لگایا جا رہا تھا۔ اب دوستی، اعتماد اور ایک دوسرے کے مفادات کی باتیں کی جانے لگیں۔ صحافیوں، ادیبوں، سماجی کارکنوں، عام شہریوں، کھلاڑیوں، تاجروں، سیاست دانوں کے جتھے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آنے جانے لگے۔ "ایک آیا۔ گیا۔ دوسرا آئے گا۔ دیر سے میں کھڑا دیکھتا ہوں۔ یونہی۔ رات اس کی گزر جائے گی۔"

لیکن میراجی کی نظم جاتری اس وقت اچانک کیوں یاد آ گئی؟ سیاست کے کھیل سب سے نرالے ہوتے ہیں۔ تمام آدرشوں، اصولوں، قدروں کو آن کی آن میں تہس نہس کر دینے والے۔ بقول ژید: ہر شے پست اور ذلیل ہو جاتی ہے، جب سیاست اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ انسانی رشتے، دوستی، رواداری اور ایک دوسرے کے لیے ایثار و قربانی کی باتیں۔ کسی کا کچھ اعتبار باقی نہیں رہ جاتا۔ عام انسان، اپنے دکھ سکھ، نامرادیوں اور امیدوں کے ساتھ اسی طرح بے بس اور ہلکان ہوتا رہتا ہے۔ سیاست داں اپنی ضرورت، مصلحت اور من کی موج کے حساب سے جب چاہتے ہیں تعلقات کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ یہ کیسا عجیب و غریب کھیل ہے۔ مداری پن، کٹھ پتلی کا تماشا، مگر ڈور کس کے ہاتھوں میں ہے؟

پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے وقت ہم سب شاید جذباتی ہو رہے تھے۔ ہم سب نے بار بار مڑ کر دیکھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے لوہے کے مہیب پھاٹک،

بوجھل تھکی ہوئی پلکوں کی طرح بند تھے. کھلتے تھے، پھر بند ہو جاتے تھے. مگر اس آنکھ مچولی کے کھیل کے پیچھے کیا تھا۔ بے اعتباری کا ایک سلسلہ۔ صدیوں کی جہالت کے پروردہ تعصبات۔ سیاسی نٹوں کی کرتب بازی کا ایک لمبا تماشا. ادھر ہندوستانی قلی اور پاکستانی قلی دونوں ملکوں کے پھاٹکوں کے درمیان ایک سی کسرت میں لگے ہوئے تھے۔ سوائے اس کے کہ ان کی وردیوں کے رنگ الگ الگ تھے. ان میں کسی اور بھید بھاؤ کا نشان نظر نہ آتا تھا۔

اور لگ بھگ یہی صورت حال تو ان تمام لوگوں کی تھی جو ہندوستانی پھاٹک اور پاکستانی پھاٹک کے پار دوسری طرف دکھائی دیتے تھے۔ دونوں طرف پنجابی بولنے والوں کی اکثریت تھی۔ پاکستانی سرحد کو عبور کرنے سے پہلے ہمارے پاسپورٹوں کی جانچ کرتے کرتے ایک صاحب اچانک اپنی سیٹ سے اٹھے۔ پاس آئے۔ مصافحہ کیا۔ بولے: ''میرا نام سرفراز سید ہے۔ شعر کہتا ہوں۔ سرکاری نوکری اور ذمے داری کا کام تو سمجھیے کہ پورا ہوا۔ آپ کے ساتھ ایک تصویر!'' سو تصویریں کھینچی جانے لگیں۔ ہمیں بے چینی اپنے دور کھڑے دوستوں کو دیکھ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ کشور ناہید تو کسی طرح اندر آ گئی تھیں اور کسٹم والوں کو تاکید کر رہی تھیں کہ کام میں خواہ مخواہ کی دیر نہ ہو۔ اُدھر پاکستان کے باب آزادی کے دوسری طرف جو بے تحاشا بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی. اس میں انتظار حسین. منو بھائی. جاوید شاہین. تبسم کاشمیری. فوزیہ سعید. ایکشن ایڈ تنظیم کے پرجوش اور چاق و چوبند نوجوان لڑکے لڑکیاں دور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہم نے جس لمحے میں پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا. سب کے سب جذباتی انداز میں چیختے ہوئے پھولوں کی پنکھڑیاں مٹھی بھر بھر کے اچھالنے لگے۔ نعرے. نغمے. دوستی اور محبت سے چھلکتی ہوئی خوشیوں کے والہانہ رقص — سفید سرمئی کبوتر حجابوں سے نکال کر ہمیں دیے جانے لگے کہ انھیں آزاد کیا جائے۔ ہم کبھی زمین کی طرف دیکھتے. کبھی آسمان کی طرف اور اپنے اپنے کبوتر فضا میں اچھال دیتے۔ کہیں کوئی دیوار. کوئی سرحد نہیں تھی!

لیکن. ایک بات جو اس ہنگامے میں بھی ذہن سے چپک کر رہ گئی۔ یہ تھی کہ ہمارے کبوتر کچھ دیر آسمان کی طرف اڑتے. چکراتے پھر تھک کر نیم اور شیشم کی کسی ڈال پر بیٹھ جاتے۔ انھیں اپنے اپنے ٹھکانے کی خوب پہچان تھی اور انھیں تقسیم کے سمجھوتے اور اپنے اپنے ملک کے قانون کی پابندی کی اب عادت ہو چکی تھی۔

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(دوستوں کے درمیان شام)

(دوسری قسط)

کبوتر اپنے ٹھکانوں پر جا بیٹھے تو ہمارا قافلہ واگہہ سرحد سے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ بھی ویسا ہی مانوس جیسا امرتسر سے واگہہ سرحد کی طرف آتے وقت نظر آیا تھا۔ مگر ایک فرق رہ رہ کر دل میں چبھ رہا تھا۔ ہندوستان ایک سیکولر جمہوریت ہے لیکن اپنی سرحد پر No Man's Land سے ذرا پہلے ایک چھوٹا سا مندر بھی اس نے تعمیر کر رکھا تھا۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے لیکن اس حصے کی طرف ایسی کوئی علامت نہیں تھی! باقی راستے کے پیڑ، مکان، دکانیں، لوگ، سب ایک جیسے دکھائی دیتے۔ "سب کچھ ایک جیسا ہے۔" پروفیسر نامور سنگھ نے کہا۔ "یہ 'دشمنوں' کے درمیان ہماری پہلی شام تھی!

ہمارے قیام کا انتظام لبرٹی ایریا کے ہوٹل سن فورٹ میں تھا۔ ابھی ہم نے سواریوں سے اتر کر زمین پر قدم رکھا ہی تھا کہ فضا میں ڈھولک کی تھاپ پر سازوں کی گونج ابھری۔ لوک کلاکاروں کا ایک جتھا یہاں بھی موجود تھا اور ہندوستانی مہمانوں کی آمد پر خیر مقدمی گیت گا رہا تھا، ایک کورس کی شکل میں۔ آوازوں کا رخ بدلتے ہی ساری فضا بدل جاتی ہے۔ ہر طرف صرف محبت اور یگانگت کا ماحول تھا۔

انتظار صاحب ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ابھی ڈیڑھ دو مہینے پہلے عالیہ بھابی کا انتقال ہوا تھا۔ غم زدگی کا غبار تو انتظار صاحب کے چہرے پر اس وقت بھی دکھائی دیتا تھا لیکن اپنے آپ کو وہ اب تک سنبھال چکے تھے۔ اداسی سے سمجھوتہ کر لینے والے اتنے حساس چہرے میں نے بہت کم

دیکھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان سے تعزیت کیونکر کی جائے۔ کچھ لمحے ہم دونوں نے چپ چاپ گزارے۔ پھر لاہور کے ان دوستوں کا ذکر چل نکلا جو پچھلے دنوں ہماری بزم سے رخصت ہوئے تھے۔ سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، صفدر میر، شہرت بخاری، صلاح الدین محمود، مظفر علی سید، سلیم شاہد...

اب خاک سے کیا پوچھیں کہ اے لئیم!

"تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے؟"

سلیم شاہد کچھ برس پہلے دلی کی ایک پنجابی تنظیم کی دعوت پر ہندوستان آئے تھے۔ قیام اشوکا ہوٹل میں تھا۔ فون آیا کہ "لاہور سے انتظار صاحب کا خط لے کر آیا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد وہ ہمارے گھر آپہنچے۔ دہقانیوں جیسا بھولا بھالا چہرہ، بے تکلفی کا انداز۔ انھوں نے تحفتاً اپنا ایک ناول "آنند" اور ایک شعری مجموعہ عنایت فرمایا۔ مجموعے کا پہلا شعر تھا:

قید میرے جسم کے اندر کوئی وحشی نہ ہو
سانس لیتا ہوں تو آتی ہے صدا زنجیر کی

تو اب وہ زنجیر بکھر چکی تھی اور فضا میں بچھڑ جانے والی روحوں کی گنگناہٹ تھی۔ کشور ناہید نے بتایا کہ سلیم شاہد کا ایک شعر سننے کے بعد فیض صاحب نے، جو اس وقت تک سلیم شاہد سے متعارف نہیں تھے، ان سے ملنے خواہش ظاہر کی تھی۔ شعر تھا:

باہر جو میں نکلوں تو برہنہ نظر آؤں
بیٹھا ہوں میں گھر میں در و دیوار پہن کر

سجاد باقر رضوی اعظم گڑھ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ پچھلے سفر میں ملاقات کے دوران کئی بار انھوں نے اپنی اس آرزومندی کا ذکر کیا کہ "کبھی دلی آئیں، پھر ہم ایک ساتھ اعظم گڑھ کا سفر کریں۔" اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے مراسم میں کتنے خراب اور بے مہر موڑ آئے ہیں اور سیاست کے ہاتھوں ہم بے بس، مجبور انسانوں نے کیا کیا ستم اٹھائے ہیں۔ سوچیں تو رگ و پے میں آگ سی دوڑنے لگتی ہے۔ ہوٹل سن فورٹ کے اس آرام دہ، آراستہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے ہم نے بہت سی تکلیف دہ یادوں میں سفر کیا اور ہلکان ہوئے۔ فرقہ پرستی اور نفرت کی سیاست کا کاروبار دونوں طرف خوب چلا۔ ادھر ذرا مندی آئی ہے، کیا پتہ

ہفتے دو ہفتے بعد پھر ایک نئے عزم کے ساتھ دونوں ملکوں کے جیالے اٹھ کھڑے ہوں اور پھر ہماری سرحدوں پر فوجیوں کی صفیں اپنا اپنا مورچہ سنبھال لیں۔ پچپن برسوں کی باہمی بے اعتباری نے سارے بھروسے چھین لیے ہیں۔

ذرا دیر بعد منتظمین کی طرف سے باہر نکلنے کا اشارہ ملا۔ ہم سب، مختلف سارک ممالک سے آئے ہوئے مندوبین، اب تک ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔ سری لنکا، بھوٹان، نیپال، بنگلہ دیش، مالدیپ۔۔۔ تاریخیں الگ الگ سہی، مگر اس وقت جغرافیے نے سب کو ایک کر دیا تھا۔ ہمارے قافلے کا رخ اب لاہور کی پرانی انارکلی کی طرف تھا۔

پرانی انارکلی کی فوڈ اسٹریٹ برقی قمقموں کی تیز روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ پھول مالائیں، بینرز۔ کہنے کو تو یہ سارک ملکوں کی کانفرنس تھی مگر دو ملک اور ان کے مشترکہ فتنہ وفساد کی کڑوی کہانی نے اس شام کو دو پڑوسیوں ہندوستان اور پاکستان کے لیے ملاپ اور تجدید وفا کی تماشا گاہ بنا دیا تھا۔ کنور نارائن، اشوک واجپئی، نامور سنگھ، اشوک کوشی، بلبیر مادھو پوری، اجیت کور، کملیشور، وشنو مہا پاتر، احمد فراز، افتخار عارف، منو بھائی، جاوید شاہین، ایکشن ایڈ تنظیم کے والینٹرز شانے سے شانہ ملائے یوں چہل قدمی کر رہے تھے جیسے یہ لاہور کی فورڈ اسٹریٹ نہیں جامع مسجد کا اردو بازار ہو۔

بازار کاہے کو تھا، یہ تو ایک طویل وعریض دسترخوان تھا، اپنی قسم کا ایک انوکھا ضیافت کدہ۔ فضا میں ہندی فلموں کے نغمے گونج رہے تھے۔ زیادہ تر پرانے ملن کے گیت۔ ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن، نوشاد، او پی نیر کے ترتیب دیے ہوئے اور لتا، رفیع، منا ڈے، مکیش، گیتا دت، آشا بھونسلے کی آوازیں۔ بار بار ہم بھول جاتے تھے کہ ہم دلی میں نہیں ہیں۔

دوسری طرف فٹ پاتھ پر حلقہ بنائے ہوئے پاکستان کے مشہور لوک گایک محمد علی بیلا اور حاجی ظہور مع اپنے سازندوں کے۔ ان کی آوازوں کا جادو الگ تھا۔ بلھے شاہ، حسین شاہ کی کافیاں ''شہد میں ڈوبے سریلے شبد اور حواس واعصاب پر چھا جانے والے، دل کی انتہائی گہرائیوں میں اتر جانے والے نغمے۔ جاوید شاہین، احمد فراز، منو بھائی، قاضی جاوید، نامور سنگھ، کملیشور، اشوک باجپئی دف اور ڈھولک کی تھاپ پر والہانہ رقص کر رہے تھے۔ کنور نارائن کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی تھی، شاید نمی بھی۔

میرے لیے یہ سارا تماشا ایک کھرا سچا روحانی تجربہ تھا، جیسے کھوئی ہوئی محبتوں کی دریافت نے دلوں پر جمی ہوئی ساری گرد دھو ڈالی ہو، ہر طرف حد نگاہ تک، ساری فضا طاہر ہو، شفاف اور منزہ۔ اس فضا میں کہیں بھی جنرل پرویز مشرف اور باجپئی جی کے چہروں کا نقش و نشان نہیں تھا۔

اچانک ایک سرو رواں کی طرح آصف فرخی آتے دکھائی دیے۔ وہ ابھی ابھی کراچی سے لاہور پہنچے تھے۔ آنکھوں میں محبت کی وہی روشنی اور چہرے پر انسیت کی پرانی چمک لیے ہوئے۔ آصف کو دیکھ کر پہلا احساس یہی ہوا کہ ہم اپنے منقسم کنبے کے دور افتادہ عزیزوں میں آ پہنچے ہیں۔ تو ہمارا لاہور آنا صرف گھر سے گھر تک کا سفر تھا۔

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(تیسری قسط)

لاہور پہنچنے کے اگلے دن، ۱۲ مارچ کی صبح کو لاہور آرٹس کونسل کی الحمرا آرٹ گیلری میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس شروع ہوا۔ کتنے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ مستنصر حسین تارڑ، مسعود اشعر، یونس جاوید، انور سجاد، اصغر ندیم سید، نسرین انجم بھٹی، سائرہ ہاشمی، شعیب اور سلیمیٰ ہاشمی، غلام حسین ساجد، سید رفیع الدین ہاشمی، تحسین فراقی، مرزا حامد بیگ، قدوس مرزا۔ ہر طرف مانوس چہرے، جانے پہچانے لوگ۔ لاہور میں بزم آرائی کی روایت بہت مستحکم ہے۔ اصولی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود لوگ دوستوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر سبھا سجاتے ہیں۔ اچانک آصف فرخی نے دھیرے سے کہا۔۔۔ ''شاہد حمید صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ادھر، پچھلی صف میں۔ میرے لیے یہ نام محبت کے ساتھ ساتھ عقیدت اور احترام کا حوالہ بھی تھا۔ جین آسٹن، ٹالسٹائی، دستوئیفسکی، بورس پاسٹرناک اور مغربی ادب کی بہت سی شاہکار کتابوں کے معروف مترجم۔ پچھلے چند برسوں میں شاہد حمید صاحب نے تن تنہا جس پائے کے ترجمے اردو میں کیے ہیں وہ ایک اچھی بھلی ٹیم کے بس کی بات بھی شاید نہیں ہے۔ تمام اعزازات سے بے پروا، صلے اور ستائش کی ہر تمنا سے یکسر عاری، شاہد حمید صاحب کو دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہے کہ ہزاروں صفحوں پر پھیلا ہوا یہ غیر معمولی کام ایک اکیلی ذات کا کرشمہ ہے۔ شخصیت بھی انتہائی سادہ اور بے لوث، بناوٹ کا نام نہیں۔ اپنے ''کارناموں'' کی قدر و قیمت کا ذرا بھی احساس نہیں۔ تعریفی کلمات سن کر شرمائے۔ پھر تو لاہور کے قیام کا ہر دن ان سے ملاقات کے بغیر مکمل نہ ہوا۔

کشور ناہید نے دور سے آواز دی، ''تم ابھی تک جاوید اقبال صاحب سے نہیں ملے۔''

میرے لیے یہ صرف ایک نام تھا کہ برقی رو۔۔۔جاوید نامہ، جاوید کے نام:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

کلام اقبال کے بغیر ہمارے شعور کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے نہ اس کا خاکہ۔ جسٹس جاوید اقبال ایک واسطہ بن گئے اس داستانی وجود، اس دیوزاد تک رسائی کے جو اس وقت تک ہمارے لیے صرف ایک خیال تھا۔ جاوید اقبال کی شکل و شباہت میں ہمارے علامہ اقبال اتنے جھلکتے ہیں کہ جتنی دیر تک ہم ان سے مصافحہ، معانقہ اور باتیں کرتے رہے، ہمارا دھیان اسی نقطے پر مرکوز رہا۔

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اسٹیج سے خطاب کرنے والوں میں ڈاکٹر مبشر حسین، ڈاکٹر فوزیہ سعید، جو اس اجلاس کی نظامت بھی کر رہی تھیں۔ احمد ندیم قاسمی جو اپنی علالت کے سبب آ تو نہیں سکے لیکن اسپتال سے اپنا ریکارڈ کیا ہوا پیغام بھجوایا، اور ڈاکٹر جاوید اقبال، سب نے اس بات پر زور دیا کہ سارک ملکوں کو گلوبلائزیشن کے گمراہ کن اور فیشن ایبل نعرے کی گونج میں اپنی پہچان بہر حال بنائے رکھنی ہے۔ فوزیہ سعید نے کہا کہ سارک ممالک کو اپنی منفرد اور علاحدہ پہچان کے ساتھ ساتھ بحیثیت ایک گروہ کے بھی اپنا تشخص قائم کرنا ہوگا۔ یہ تشخص مذہبی نہیں ہوگا اور اس کا زور مسائل کے اشتراک اور گہرے باہمی رشتوں پر ہوگا۔ سری لنکا کے مندوب تنا ابھے شیکھر نے کہا کہ سارک سیاسی صداقت سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی صداقت کا علامیہ ہے لیکن ثقافت کے نام پر تمام سارک ملکوں کو احیا پرستی، ماضی پرستی، فرقہ پرستی، مذہبی ادعائیت اور تہذیبی تعصبات سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا ہے۔ ڈاکٹر مبشر حسین نے اس مسئلے کی نشاندہی کی کہ قومیت اور اندھی قوم پرستی

کے نام پر فرقہ پرست اور فاشسٹ رجحان رکھنے والی جماعتوں نے اب ایک مذہب پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح تنگ نظری اور منافرت کی ایک نئی فصل اگائی جارہی ہے۔ یہ کیسی قومیت ہے جو دوسری قومیتوں کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتی اور اختلافات کو دشمنی سے تعبیر کرتی ہے۔ جاوید اقبال نے کہا کہ قومی احساسات پر مبنی معاشرے دلوں کی دھرتی پر اگتے ہیں۔ سیاستداں اس سنہری فصل کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ سارک ملکوں کا سب سے بڑا مسئلہ غریبی اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا ہے۔ ہندوستان اس علاقے کا سب سے بڑا بھائی ہے، اس لیے سب سے زیادہ قربانی دینے کے لیے بھی اس کو تیار ہونا پڑے گا۔ اجیت کور کا اصرار اس بات پر تھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں غریبی کے علاوہ ایٹم بم بھی مشترک ہے۔ جنگیں حکومتوں کے ذریعہ جیتی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں ناگزیر طور پر ہارنے والے تو عام انسان ہی ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں غریبی اور ایٹم بم کی طرح پانی، ہوا، جغرافیہ اور تاریخ بھی مشترک ہے۔

مجھے یاد آیا کہ علامہ اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ ہی پہلے ایک ریڈیائی تقریر کے دوران بہت کھل کر یہ بات کہی تھی کہ اصل وحدت نہ قوم کی پابند ہوتی ہے، نہ وطن کی، نہ مسلک و ملت کی۔ اصل وحدت بنی نوع انسان کی وحدت ہے اور اسی کی فلاح کو ذہن میں رکھ کر ہم سب کو آگے بڑھنا ہے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت فیڈرل وزیر تعلیم محترمہ زبیدہ جلال نے کی۔ خوش قامت، دلآویز خدوخال کی مالک اور اعتماد اور حوصلے سے بھری ہوئی۔۔۔ ان کے واسطے سے پاکستانی عورت کی ایک ایسی تصویر سامنے آئی جس سے ہندوستان کی اکثریت بے خبر ہے۔ ان کی تقریر سنتے ہوئے مجھے بار بار اپنے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا خیال آیا جو طبیعیات کے پروفیسر ہونے کے باوجود جیوتش اور نجوم کی تعلیم پر زور دیتے ہیں، جو تاریخ کا غلط اور گمراہ کن سبق پڑھائے جانے کے درپے ہیں، جنھوں نے علمی، تعلیمی اور تہذیبی اداروں کو فرقہ پرستی، جہالت، تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے مراکز کی شکل دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی۔ جن کے لیے علم، ادب، ثقافت، سب کے سب تعصب اور علاحدگی پسندی کے پرچار کا ذریعہ ہیں۔

اس اجلاس کے مقرروں میں احمد فراز نے ایڈورڈ سعید کا قول یاد دلایا کہ "ادیب کا فرض

اقتدار کے سامنے سچ بولنا ہے۔ کمزوروں کے سامنے حق گوئی آسان ہوتی ہے۔ امتحان کی گھڑی تو اس وقت آتی ہے جب طاقتور کے منھ پر سچ بات کہی جائے۔ "لفظ صرف لفظ نہیں ہوتے لفظ نور کے پیکر اور پتھر بھی بن جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو اقتدار کی ہوس میں مبتلا خفیف الحرکات سیاست دانوں کے دل میں" سچے لفظوں" سے اتنی گھبراہٹ کیوں پیدا ہوتی۔ ان کے گرد اسی لیے تو تخلیقی لفظوں" کی حرمت کا احترام کرنے والوں کے بجائے ہمیشہ مسخروں، طالع آزماؤں اور مدح خوانوں کی بھیڑ یکجا دکھائی دیتی ہے۔

افتتاحی اجلاس کے خاتمے پر نوجوانوں کے ایک تھیٹر گروپ (محمد وسیم گروپ) کی طرف سے ہندوستان اور پاکستان کی آپسی کھینچ تان کے موضوع پر آنخہ منٹ کا ایک ڈراما اسٹیج کیا گیا۔ ان دو ملکوں کے تعلقات کا بھاری سایہ سارک کے پورے ماحول پر پھیلا ہوا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے آنخہ منٹ کے اس کھیل میں اپنا سندیسہ اچھی طرح لوگوں تک پہنچا دیا۔ یہ کہ ہمیں اب اس راستے پر جانا ہوگا جو کشمیر اور کارگل سے الگ ہمارے مشترکہ غموں اور امنگوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(چوتھی قسط)

سارک ملکوں کے ادیبوں کی اس کانفرنس میں جو بنیادی مسئلے زیرِ بحث آئے، ان کی نشاندہی یوں کی جاسکتی ہے۔

(۱) سارک کے علاقے کی ثقافتی جڑیں، ادب میں ان کی عکاسی۔

(۲) تانیثی ادب کی روایت، احتجاج اور مزاحمت کا رویہ۔

(۳) ۹ ستمبر کے بعد کی جنگوں کے اثرات اور ایک نئی حقیقت پسندی کا میلان

(۴) سارک ملکوں کی زمینی سچائی اور نثر و نظم پر اس کے اثرات۔

(۵) تاریخ اور ادب

(۶) کلاسیکی اور معاصر ادب میں حکائی اسلوب کا چلن۔

(۷) گلوبلائزیشن، انفرمیشن ٹیکنالوجی اور ادب۔

یہ بحثیں کانفرنس کی مختلف نشستوں میں تین روز تک چلتی رہیں۔ پروفیسر نامور سنگھ نے اپنی تقریر میں بھکتی اور تصوف کی روایت اور برصغیر کے ثقافتی منظر نامے پر اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا۔ انسانی عناصر کی جو چہل پہل اس منظر نامے کو ہمارے لیے بامعنی بناتی ہے، اسے ایک بار پھر سے سمجھنے اور اس کا مفہوم عام کرنے کی ضرورت ہے۔ کنور نارائن نے برصغیر کی تاریخ اور ثقافت کے وسط ایشیائی حوالے اور اس کی فکری اساس پر روشنی ڈالی۔ زاہدہ حنا نے برصغیر کے ادب میں تانیثی تجربے اور طرزِ احساس کا رشتہ میرا بائی کی قائم کردہ روایت سے جوڑا۔ انور سجاد نے ہمارے دونوں ملکوں میں تاریخ کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے کیے جانے

والے مذاق کے خطروں پر روشنی ڈالی۔ یہ سوال بھی اٹھایا کہ اس وقت ہم ایک طرح کی اقتصادی دہشت گردی سے دو چار ہیں اور طرح طرح کی تہذیبی، ذہنی، سیاسی، معاشی پابندیوں میں گھرے ہوئے، اپنی اجتماعی نجات کا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ آصف فرخی نے اس بات پر زور دیا کہ تاریخی حقیقتوں کے بدل جانے سے ادیبوں کا رول نہیں بدل جاتا۔ سماجی ذمے داری کے شعور سے عاری ہو کر ہم بامعنی ادب کی تخلیق کر ہی نہیں سکتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارا زمانہ تہذیبوں کے تصادم کا نہیں بلکہ تہذیبوں کے زوال کا ہے۔ شمیم حنفی نے تاریخ کے تشدد اور برصغیر کی مختلف زبانوں کے ادب سے رونما ہونے والی اجتماعی حسیت کا جائزہ لیا۔ انتظار حسین نے اپنے کلیدی خطبے میں قصہ کہانی کی حکائی روایت اور اس کے تہذیبی مضمرات سے بحث کی۔ قاضی افضال حسین کا موضوع گلوبلائزیشن کے سیاق میں ادب کے تیزی سے بدلتے ہوئے روپ اور رول کا مسئلہ تھا۔ اشوک باجپئی نے نو ستمبر کے بعد کی دنیا میں بالخصوص سارک ممالک کے ادب اور ادیبوں کو درپیش مسئلوں اور ذمہ داریوں پر گفتگو کی۔ غرض کہ سوچنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے لیے کانفرنس کے ہر اجلاس میں ایک ساتھ بہت سے بہانے سامنے آئے۔ پاکستان کے بیشتر اہل قلم اور سامعین کو ہندوستانی ادب کے ترجمانوں کی باتیں خالص اردو ادیبوں کے عام مسائل اور موضوعات کی ڈگر سے الگ دکھائی دیں اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کی بابت بعضوں نے اپنے تجسس کا اظہار بھی کیا۔ اِدھر ہندوستان سے پہلی بار لاہور جانے والوں کے لیے بھی پاکستان کی سرزمین ادبی اور فکری اعتبار سے ایک علاقہ مرموز کی حیثیت رکھتی تھی۔ اشوک باجپئی کتابوں کی دکانیں دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ خریداری نامور سنگھ کو بھی کرنی تھی۔ مرزا حامد بیگ ہمارے لیے خضر راہ ثابت ہوئے اور دوسرے اجلاس کے بعد چائے کے وقفے میں ہمیں اپنی گاڑی میں ساتھ بٹھا کر انارکلی کی طرف چل پڑے۔ کچھ کتابیں خریدی گئیں۔ کچھ موسیقی کے کیسیٹ، خاص کر پاکستانی لوک سنگیت کے۔ عالم لوہار، پٹھانے خان، محمد جمن، ریشماں کے نام تو ہمارے لیے جانے پہچانے تھے۔ معلوم ہوا کہ اب نغمہ سرایوں کی ایک نئی کھیپ بھی پیدا ہو چکی ہے۔ ہم نے سندھی، پنجابی، پشتو فوک کے نمائندوں میں سے اپنے لیے کچھ چیزیں چن لیں۔

انارکلی بازار کا ہر دکاندار جس سے ہمارا سابقہ پڑا مہمان نوازی پر مصر تھا۔ ہر چیز کے دام

ہندوستانی مہمانوں کے لیے پہلے سے کم کر دیے جاتے تھے۔ مول بھاؤ کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ واقعی محبت میں تجارت نہیں کی جاتی!

کانفرنس کے پہلے دن لنچ کا اہتمام سماجی بہبود کی وزیر صغرا امام صاحبہ کی طرف سے تھا۔ لنچ سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہماری میزبان، جو اپنی عمر اور چہرے بشرے سے کالج کی طالبہ دکھائی دیتی تھیں، اپنی خیر مقدمی تقریر کے دوران انھوں نے بھی ایک نئے پیمانِ وفا کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندوستان کے حالیہ انتخابات میں سچن پائلٹ، سندھیا، راہل گاندھی، سندیپ دیکشت اور دیورا کی شکل میں نوجوانوں کی ایک نئی صف سامنے آئی ہے۔ اس نسل کے سر پر تقسیم کی تلخیوں کا کوئی سایہ نہیں ہے۔ یہی حال پاکستان کی نئی نسل کا ہے۔ اب سب کا رخ ایک نئے مستقبل کی طرف ہے۔

عشائیہ گورنر ہاؤس میں تھا۔ ہماری بی جے پی سرکار نے اس کانفرنس کے سلسلے میں اپنے ہاتھ ایک دم جھاڑ لیے تھے اور ذرا سی ذمہ داری بھی اپنے سر نہیں لی تھی۔ لیکن پاکستانی حکومت کا رویہ بہت پرتپاک اور شریفانہ تھا۔ گورنر ہاؤس کے عشائیے میں میری نشست کے دائیں طرف سکریٹری ثقافت کے لیے جگہ مخصوص تھی۔ بائیں ہاتھ کو زاہدہ حنا کے لیے۔ کسی وجہ سے وہ نہیں آئیں تو انور سجاد وہاں بیٹھ گئے۔ انور سجاد نہایت جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں۔ اداکار، رقاص، مصور، ڈراما نویس، افسانہ نگار، تھیٹر آرٹسٹ، ڈاکٹر، خطیب، گویا کہ اپنے آپ میں بہ قول انتظار حسین "ایک ثقافتی وفد" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری بات چیت میں سکریٹری وزارت ثقافت بھی شریک ہو گئے تھے۔ باتوں کا تار اس وقت ٹوٹا جب ہمارے میزبان گورنر پنجاب سمیت تمام مہمان ہال سے باہر جا چکے تھے۔ اب جو ہم باہر نکل کر چاروں طرف دیکھتے ہیں تو دور دور تک سناٹا۔ میرے ساتھ نامور سنگھ بھی اتفاقاً پیچھے رہ گئے تھے۔ ہم پارکنگ ایریا تک پہنچے تو نہ کوئی گاڑی، نہ ڈرائیور، سب جا چکے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے مرزا احمد بیگ کا جنھوں نے ہمیں دور سے دیکھ لیا اور بہت بھٹک بھٹکا کر، بعد از تلاش بسیار ہمیں ہماری قیام گاہ تک چھوڑ آئے۔ ہوٹل کا نام اور پتہ اس وقت نہ ہمیں یاد آیا، نہ نامور سنگھ کو۔ برسوں پہلے ایک رات دلی میں کسی عشائیے سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے عصمت آپا (عصمت چغتائی) کو ان کی قیام گاہ تک پہنچانے کی پیش کش کی تو مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ انھیں بھی گھر محلے کا کچھ اتا پتہ نہیں تھا۔ سوائے اس

کے کہ انھیں جہاں جانا ہے اس گھر کے آگے نیم کا ایک پرانا پیڑ ہے۔ چنانچہ رات کے کوئی دو بجے تک شمس الرحمن فاروقی کی رہبری میں ہم قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور عصمت چغتائی سمیت نیم کے اس پیڑ کو ڈھونڈتے رہے تھے جس کے سائے میں عصمت آپا کی میزبان کا گھر آباد تھا۔ لاہور میں اگلی صبح ناشتے کی میز پر اشوک باجپئی نے شاید درست ہی کہا کہ آپ دونوں کا یہ حال لاہور میں ہوا تھا تو بھلا نیویارک یا پیرس میں کس کس خرابی سے دو چار ہوئے ہوتے۔ بہر نوع ہمیں اپنی منزل کا سراغ نیم کے ایک پیڑ ہی کی مدد سے ملا۔ خدا کرے یہ ہمیشہ ہرے بھرے رہیں!

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(پانچویں قسط)

لاہور کی جیل روڈ سے ملحق اس کشادہ گلی میں بھی نیم کا ایک قد آور، ہریالا پیڑ ہے جس کے سامنے انتظار حسین رہتے ہیں۔ اس گھر سے ہمارا ایک نجی رشتہ ہے۔ بلند و بالا پورٹیکو، ہوادار کشادہ کمرے، سامنے چھوٹا سا لان، ہارسنگھار، گڑہل، موتیا، بیلے کے پھولوں سے مہکتا ہوا، مدھو مالتی، بیگم بیلیا (بوگن ویلا) کی لتائیں پورٹیکو کے ستون اور لان کی بیرونی دیوار سے جھولتی ہوئی۔ اب سے تقریباً اٹھارہ برس پہلے اس گھر میں ہم نے پہلی بار قدم رکھا تو ایسا لگا کہ گھوم پھر کر اپنے ہی گھر میں ہیں۔ اس مکان کے چپے چپے پر اپنے مکینوں کی مہر ثبت تھی۔ عالیہ بھابی گھر کو ہمیشہ بہت مرتب اور ستھرا رکھتی تھیں۔ یہی سادگی اور نفاست اس گھر کی سجاوٹ تھی۔ یہی اس گھر کی پہچان بھی تھی۔ مملکت خداداد پاکستان کے دوسرے بیشتر گھروں سے مختلف۔ صارفی کلچر کا زور پاکستان میں ہمارے ملک سے کہیں زیادہ ہے۔ متوسط طبقہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ انتظار صاحب صبح سویرے پرندوں کی پہلی آواز پر اٹھ بیٹھتے۔ ایک کرسی کھینچ کر لان کے ایک گوشے میں جا بیٹھتے۔ عالیہ بھابی اپنی خاموش ہستی کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف ہو جاتیں۔ خادمائیں آجاتیں تو اپنی نگرانی میں ایک ایک چیز جھڑواتیں۔ گھر کے انتظام میں انتظار صاحب کا دخل نہ تھا۔ اب کے ہم پہنچے تو یہ گھر ہمیشہ کے لیے ان کے مہربان اور محبتی وجود سے محروم ہو چکا تھا۔ کانفرنس کے ہنگاموں سے ایک شام ذرا خالی دکھائی دی تو شاہد حمید کے ساتھ میں نے جیل روڈ کی راہ لی۔ قاضی افضال حسین، منیر نیازی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ منیر نیازی لاہور کے مضافات میں رہتے ہیں:

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

اٹھارہ برسوں میں انتظار صاحب کا گھر ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا۔ ایک گہری وضعداری اس کے ہاؤ بھاؤ میں تھی۔ تذکرہ، میں اس گھر کا کچھ نقشہ انتظار حسین نے کھینچا ہے۔ مگر عالیہ بھابی کے بغیر اس شام کو یہ گھر بہت سونا لگا۔ وہ بھی تو ایک شام تھی جب اٹھارہ برس پہلے لاہور کے بہت سے ادیب یہاں جمع ہو گئے تھے۔ بیگم حجاب امتیاز علی، عبدالعزیز خالد، ڈاکٹر سہیل احمد خاں، صلاح الدین محمود، جمیلہ ہاشمی، نثار عزیز بٹ، اصغر بٹ، جیلانی کامران، شہرت بخاری، فرخندہ بخاری جن پر ایک ہوائی جہاز ہائی جیک کرنے کا الزام عاید ہوا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی، مظفر علی سید، سجاد باقر رضوی، وقار انبالوی۔ ان سب کے چہرے میرے حافظے کی تختی پر اسی گھر کے پس منظر میں ابھرتے ہیں۔ عالیہ بھابی نے کیسی بھری پری ضیافت کا اہتمام کیا تھا:

ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

لاہور کے دوستوں میں مصور ظہور الاخلاق اور اعجاز حسین بٹالوی کی یاد بھی انتظار صاحب اور شاہد حمید کے ساتھ بیٹھے بیٹھے ایک لہر کی صورت آئی اور اداس کر گئی۔ اعجاز حسین بٹالوی اردو انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت ایک جیسی رکھتے تھے۔ بٹالوی بھائیوں میں آغا بابر کا تفصیلی تذکرہ دی ایس نائپال نے اپنی کتاب Among the Believers میں کیا ہے۔ اپنے مرحوم بھائی کے سوانح کی ادھوری کتاب اعجاز حسین بٹالوی نے مکمل کی۔ اٹھارہ برس پہلے کی ملاقات اس عالم میں ہوئی تھی، جمیلہ ہاشمی کے گھر پر کہ اعجاز صاحب سے لاہور کے زیادہ تر ادیب ناراض تھے۔ بھٹو صاحب کے خلاف جو مقدمہ جنرل ضیا نے قائم کیا تھا اس کی پیروی کرنے والوں میں اعجاز صاحب بھی تھے۔ ان کی ایک حیثیت بڑے نامی گرامی بیرسٹر کی بھی تھی۔ وہ عینی آپا (قرۃ العین حیدر) کے قریبی دوستوں میں تھے۔ اب کے لاہور جانے سے پہلے ایک روز عینی آپا سے دیر تک ان کا ذکر رہا۔ ہم لاہور پہنچے تو وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکے تھے:

اس خرابے میں انھیں اب ڈھونڈنے جاؤں کہاں؟

ظہور الاخلاق پاکستان کی پہلی صف کے مصوروں میں تھے۔ ان کی بیگم شہر زاد نہایت معروف ظروف ساز، چاک پر مٹی سے کیا کیا جادو جگاتی تھیں۔ بنجارنوں جیسی وضع قطع۔ دونوں

میاں بیوی ایک میوزیم جیسے وسیع و عریض گھر میں رہتے تھے جو ان کا اسٹوڈیو بھی تھا۔ ایک روز اخبار میں پڑھا کہ ظہور الاخلاق کسی بدمعاش کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ دلی آئیں اور منڈی ہاؤس کے اطراف کسی گیلری میں ان کی نمائش کا اہتمام ہو۔ دلی سے پہلے ان کے سفر میں موت آگئی۔ تعصب اور جہالت تہذیب کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اور پاکستان کی ثقافت کے گرد ایک دائرہ بنیاد پرستی کا بھی ہے۔ سنا ہے کہ ظہور الاخلاق کے خاندان کے گرد یہ دائرہ بہت تنگ ہوگیا تھا۔ اوما بھارتی، توگڑیا، سنگل، جوشی اور۔۔۔ اور اڈوانی، واجپئی افراد نہیں رویے ہیں، ایک کیفیت مزاج جو زمان و مکاں کے کسی بھی گوشے میں کسی اور نام سے بھی نمودار ہو سکتی ہے۔

محرومی اور دل گرفتگی کا کچھ ایسا ہی احساس ہمیں اس سفر کے دوران اس گھنی گنجان سہ پہر کو بھی ہوا جب ہم لاہور کے بہت سے افسانہ نگاروں کے علاوہ انتظار صاحب، کملیشور، آصف فرخی، اجیت کور کے ساتھ شیزان کے بالائی ہال میں بیٹھے تھے۔ لاہور کے ادیبوں نے محبتوں کی ایسی بارش کی کہ ہم حیران رہ گئے۔ کچھ پشیمان بھی ہوئے۔ آصف فرخی نے ہماری ایک کتاب کے اجرا کی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ بہرحال، یہ قصہ آگے آئے گا۔ اس وقت تو ہمیں ان ہرے بھرے پتوں کا خیال آیا جو وقت کی آندھی کے ساتھ اڑ گئے تھے۔ لاہور کے گلی کوچے ان کی یادوں سے اب بھی آباد ہیں۔ دوستوں میں جو لوگ لاہور میں ابھی بھی موجود ہیں، مگر کانفرنس کی بے تحاشا سرگرمی نے ان سے ملاقات کا موقعہ آنے ہی نہ دیا، ان میں انیس ناگی بھی ہیں۔ بقول ظفر اقبال ان کا حال کچھ یہ ہے کہ:

سب دوستوں سے میری لڑائی ہے ان دنوں
مجھ کو تو آج شہر کے باہر اتار دے

پچھلے سفر میں ان سے ملاقات ان کے اپنے گھر کے علاوہ پاک ٹی ہاؤس میں بھی ہوگئی تھی۔ اس مرتبہ ٹی ہاؤس میں بھی انیس ناگی ہاتھ نہ آئے۔ میں انتظار صاحب کے ساتھ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو بس زاہد ڈار اور ابرار احمد دکھائی دیے۔ زاہد ڈار کے ساتھ ہمیشہ ایک کتاب رہتی ہے اور ٹی ہاؤس میں ہمیشہ اپنا ایک زاہد ڈار مل جاتا ہے۔ انتظار حسین نے "چراغوں کا دھواں" میں وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے ادبی اور ثقافتی منظر نامے کے خاموش انقلاب کی

روداد بھی بیان کی ہے۔ پرانی محفلیں یاد آرہی ہیں! کوکا کولا کے دور میں قہوہ خانوں پر بھی نئی افتاد پڑی۔ لذت کام و دہن اور دسترخوان کا رشتہ تہذیب سے خاصا گہرا اور پیچیدہ ہے۔

شاہراہ قائد اعظم پر سنگ میل پبلی کیشنز کے دفاتر ہیں۔ نیاز احمد صاحب نے دن کے کھانے پر کچھ اور دوستوں کو بھی بلالیا تھا۔ ذوالفقار تابش، محمد اکرام چغتائی، زاہد ڈار، انتظار حسین کا ساتھ رہا۔ کچھ عرصہ پہلے نیاز صاحب کے جوان جہان بیٹے کا اچانک انتقال ہوگیا۔ کچھ لوگ تو نہ بیمار پڑتے ہیں، نہ کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ بس ایک دن اچانک چھپ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی یہی ہوا۔ نیاز صاحب اندر سے ٹوٹے ہوئے۔ بظاہر پتھر جیسے خاموش نظر آئے۔ اس سانحے نے ان کی زندہ دلی چھین لی ہے۔ ہم جتنی دیر وہاں رہے ایک بے نام سا سایہ بھی سنگ میل کے دفتر میں منڈلاتا رہا۔ موت کی دیوار کے اس پار وہ آنے والی ہزاروں رتوں کا سنگار دیکھیے۔ (رگ وید)!

محمد سلیم الرحمن اور سویرا والے ریاض چودھری سے بس فون پر بات ہوسکی۔ محمد سلیم الرحمن، شاعر، افسانہ نگار، مترجم، انگریزی اور اردو کے کالم نویس، لغات اور داستانوں کے عالم، ادب کی مشرقی اور مغربی روایتوں سے یکساں شغف رکھنے والے۔ ہفتے میں شاید صرف ایک مرتبہ لاہور آتے ہیں۔ ان منتخبات روزگار میں ہیں جن کے لیے ادب اور علم کی لگن دنیاداری کے عام قصوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اپنی گوشہ گیری میں خوش۔ اور کیسے کیسے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ یونانی ادب، جہاں گرد کی واپسی۔ یہ کلچر اب رخصت ہوا چاہتا ہے:

چراغوں کا دھواں اب دیکھا نہ جائے!

اب کچھ حال احوال شیزان والی محفل کا۔ لاہور کے افسانہ نگاروں نے وہ بزم کس محبت سے سجائی تھی۔ ان سے ملنا اچھا لگا۔ ہم ممنون بھی ہوئے۔ شیزان کی بالائی منزل کے اسی کمرے میں جہاں اب سے اٹھارہ برس پہلے اشفاق احمد کی صدارت میں جلسہ ہوا تھا اور نئے پرانے بہت سے معروف ادیبوں کے ساتھ بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، صفدر میر، احمد بشیر، ظہیر کاشمیری سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اب کے ان میں سے کوئی نہ تھا۔ کچھ بیمار۔ کچھ رخصت ہو چکے۔ یکے بعد دیگرے کوئی دس بارہ افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیاں پڑھیں۔ جدید افسانے سننے کے بجائے ان سے اگر بات چیت کا کچھ موقع مل جاتا تو شاید ان کے اور ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔ ادھر اپنا

یہ حال کہ ایک تو کانفرنس کے انتہائی مصروف پروگرام کی تھکن، دوسرے یہ کہ جب سے کہانی سننے سنانے کے پھیر سے نکل کر تحریری لفظ کی اقلیم اور قلم کے اقتدار کی تابع ہوئی ہے، اسے سن کر لطف اندوز ہونے کا جوہر ہم جیسوں میں باقی نہیں رہا۔ انتظار صاحب جلسے کی صدارت کر رہے تھے۔ وہ بھی نڈھال۔ سامنے کی صف میں خواتین افسانہ نگاروں کے ساتھ بس ایک نیلم بشیر تھیں جو بشاش دکھائی دیتی تھیں۔ ان کی کتاب ''نو گیارہ'' 9/11 میں نے دلی واپس آنے کے بعد پڑھی۔ امریکی وقار اور اقتدار کو لگنے والی چپت کا آنکھوں دیکھا حال۔ مگر اصل کہانی تو ٹریڈ ٹاورز کی تباہی کے بعد شروع ہوئی ہے۔ شرارت جس نے بھی کی ہو، سزا بھگتی غیور افغانیوں نے اور اب کربلا، کوفہ، نجف، بصرہ، بغداد کی گلیوں محلوں میں ایک بار پھر بربادی کا کھیل جاری ہے—

حسینؑ دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں!

وحید اختر: شہر ہوس کی شہید صدائیں

چھٹے دریا کو پار کرتے ہوئے

(آخری قسط)

امریکہ میں ہندوستان کے سابق سفیر، راجیو گاندھی فاؤنڈیشن کے سابق نائب سربراہ ڈاکٹر عابد حسین ہمارے لاہور پہنچنے کے اگلے روز کانفرنس میں شرکت کے لیے دلی سے آئے تھے۔ لیکن ادیبوں کی اس محفل میں ان کی تقریر ایک خاص معنویت رکھتی تھی۔ گردوپیش کی دنیا کے حالات ایک حد سے زیادہ خراب ہو جائیں تو خالی خولی ادب کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ یوں بھی ہمارے زمانے کی اجتماعی زندگی جتنی الجھی ہوئی اور خستہ و خراب ہے، اس کے پیش نظر، یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ فن کار اور ادیب آرٹ اور ادب سے آگے بڑھ کر بھی اپنا ایک رول نبھائیں۔ سارک ادیبوں کے اس اجتماع میں ہر بحث کی تان اسی سچائی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ کیا واقعی ادب ہمارے موجودہ معاشرے میں ایک فالتو سرگرمی بن چکا ہے اور ادیب ہونے کا کچھ بھی مفہوم اب باقی نہیں رہ گیا ہے؟ تو کیا تمام انسانی معاملات بے کردار، حریص، تعصبات کی پوٹ بنے ہوئے سیاست دانوں کے حوالے کر دیے جائیں؟ عبداللہ حسین نے بھی ڈاکٹر عابد حسین کی طرح اپنی تقریر نہایت رواں دواں اور خوبصورت انگریزی میں کی۔ البتہ ان کی باتیں ضرورت سے زیادہ کڑوی تھیں اور وہ غالباً اپنا توازن کھو بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے کانفرنس کی طرف سے دعوت نامے کے ساتھ موصول ہونے والے سرکلر کی زبان و بیان پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ ہم قدرے حیران اس لیے بھی تھے کہ یہ صورت حال لکھنے والوں سے اپنی ترجیحات کے ازسرنو تعین کا تقاضا کرتی ہے۔ سو، جن حالات میں اور جس ذہنی و جذباتی موسم میں یہ کانفرنس منعقد کی جا رہی تھی اس کے مطالبات کو ذہن میں رکھ کر گفتگو کی جانی چاہیے تھی لیکن کہاں کا پانی

کہاں مرتا ہے اور کس کا غصہ کہاں اترتا ہے؟ اس واقعے کی کچھ نشاندہی پاکستان میں ارندھتی رائے کی بے حساب پذیرائی پر عبداللہ حسین کے اس ردعمل سے بھی ہوتی ہے جس کا اظہار انھوں نے ذہن جدید، دہلی میں اپنے ایک خط (بنام مدیر) کے ذریعے کیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ عبداللہ حسین کا غم وغصہ اپنی ایک الگ تاریخ، ایک الگ پس منظر بھی رکھتا ہے۔ انھیں یہ بات، بہت اچھی نہیں لگی تھی کہ صرف ایک ناول لکھ کر دنیا بھر میں شہرت اور مقبولیت کے عروج تک جا پہنچنے والی ہندوستانی مصنفہ ارندھتی رائے کی پذیرائی پاکستان میں اس غیر معمولی طریقے سے کیوں ہوئی؟ خیر، انھیں یا ہمیں یہ بات بہر حال یاد رہنی چاہیے کہ ارندھتی رائے صرف ایک نازک اندام، نوعمر ادیبہ ہی نہیں، انتہائی مستحکم شعور اور شخصیت رکھنے والی ایک ایسی سماجی کارکن بھی ہے جس نے ہمارے زمانے کے ضمیر کی حیثیت اختیار کر لی ہے، سچائی کی ایک جیتی جاگتی عہد آفریں علامت، ایک رویہ، ایک اسلوبِ زیست، آزادی کے ساتھ سوچنے اور اپنی سرگرمیوں کا راستہ طے کرنے والی ایک حیران کن شخصیت۔ گجرات کے فسادات سے لے کر بھاجپا کی نامسعود پالیسیوں اور انسانیت سوز حرکتوں تک ہندوستان کے تمام لکھنے والوں میں ارندھتی رائے کی آواز سب سے زیادہ اونچی تھی اور دنیا بھر میں توجہ سے سنی گئی۔ یہ محض اتفاقاً یا بے سبب تو نہیں تھا۔ عبداللہ حسین نے اپنی ساری منطق کا زور اسی بات پر صرف کیا کہ سارک علاقے کے ادیبوں کا کچھ بھی سماجی وقار اور اعتبار اب باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ان کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ پہلے اپنی حیثیت کو بحال کر لیں، اس کے بعد سماجی اور سیاسی معاملات میں اپنی زبان کھولیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی اس بات سے بھلا کسی کو بھی کیا اختلاف ہو سکتا تھا!

شاہد حمید نے کہا— ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے جس اجلاس میں اپنا پرچہ پڑھا اس کی نظامت ثمینہ رحمن کر رہی تھیں۔'' خود ہمارے لیے یہ بات، بہت خوش آئند تھی۔ کسی بھی مذاکرے یا محفل کی نظامت کے دوران اگر ناظم جلسہ اپنی حد کا احساس چھوڑ بیٹھے تو ساری فضا بگڑ جاتی ہے۔ ہمارے مشاعروں اور ادبی جلسوں میں نظامت کا معیار بالعموم پست اور مضحک ہوتا ہے۔ ثمینہ رحمن ایک نہایت شائستہ ذہن، پرکشش اور مرتب شخصیت کی خاتون ہیں۔ اردو کے نامور ادیب اور انگریزی کے معروف استاد خواجہ منظور حسین مرحوم کی بیٹی ہیں۔ خواجہ صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرانے، یادگارِ زمانہ پروفیسروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور تقریباً نصف صدی

سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود انھیں علی گڑھ والے اب بھی بہت محبت سے یاد کرتے ہیں۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میرے والد مرحوم بھی خواجہ صاحب کے تمام شاگردوں کی طرح انھیں ہمیشہ یاد کرتے تھے اور یہ کہ علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ہمارا گھر خواجہ صاحب کی کوٹھی کے پاس ہی آباد تھا تو وہ کسی قدر جذباتی انداز میں علی گڑھ کو یاد کرنے لگیں۔ کانفرنس کے ہندوستانی شرکا میں علی گڑھ سے براہ راست تعلق رکھنے والے ہمارے ساتھ پروفیسر قاضی افضال حسین بھی تھے۔ لاہور سے ہندوستان واپسی کے پہلے والی شام کو میں اور افضال رات گئے پی سی فورٹ ہوٹل پہنچے تو ریسپشن والوں نے دو بڑے بڑے پیکٹ ہمارے سپرد کیے۔ یہ قیمتی تحفے تھے ہم دونوں کے لیے ثمینہ رحمن اور ان کے بڑے بھائی خواجہ شاہد حسین کی طرف سے جو انگلستان میں مقیم ہیں مگر ان دنوں لاہور آئے ہوئے تھے۔

کانفرنس کے دوران سارک ممالک کی ادبی روایت، ثقافت، سیاسی اور معاشرتی مسئلوں پر گفتگو کی سطح ذہین بصیرتوں سے بھری ہوئی تھی۔ کشور ناہید اور ڈاکٹر فوزیہ سعید نے مباحث کی تقسیم اور مختلف نشستوں کا خاکہ بہت سلیقے سے ترتیب دیا تھا۔ نظامت کرنے والوں میں، کشور ناہید سے لے کر شعیب ہاشمی، مسعود اشعر، سلیمہ ہاشمی، انور سجاد، مسعود اشعر، مستنصر حسین تارڑ، ثمینہ رحمن اور یاسمین حمید تک، سب کے سب متعلقہ موضوع کے مضمرات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے مباحث کو بھی پٹری سے اترنے نہ دیا۔ کانفرنس کے آخری دن، لنچ کے وقفے میں ایک نوجوان جوڑے سے ملاقات ہوئی، دونوں بات چیت سے ذہین اور جاذب نظر۔ یہ معاصر اردو غزل کے سب سے ممتاز اور مشہور شاعر ظفر اقبال کے بیٹے اور بہو تھے۔ ہم پی سی فورٹ پہنچے تو ظفر اقبال کا فون موصول ہوا۔ افسوس کر رہے تھے کہ ملاقات نہ ہو سکی۔ فالج کے حملے نے ان کے لیے کہیں آنے جانے میں مشکلیں پیدا کر دی ہیں۔ اور اگلی صبح ہمیں لاہور سے رخصت ہو جانا ہے۔

ایسے کئی دوستوں اور عزیزوں کا خیال آیا جو دل سے بہت قریب، مگر آنکھوں سے دور رہے۔ افضال صاحب اپنے ماموں کی عیادت کے لیے تھوڑا سا وقت کانفرنس سے چرا کر اسلام آباد ہو آئے۔ ادھر ہم تھے کہ بس دل مسوس کر رہ گئے۔ مشفق خواجہ صاحب کراچی میں تھے، ڈاکٹر آفتاب احمد اسلام آباد میں۔ دونوں سفر کرنے سے معذور، اور ہمارے راستے میں وقت کی تنگی حائل تھی۔ آفتاب صاحب ہمارے ان بزرگ اہل قلم میں ہیں جن کی نظر کے محمد حسن عسکری بھی

قائل تھے۔ غالب پر انھوں نے کس پایے کی تنقید لکھی ہے۔ مشفق خواجہ ادھر بہت بیمار رہے۔ وہ تو کہیے کہ مجلس ترقی ادب تک کسی طرح جانے کا موقعہ ہمیں مل گیا۔ (احمد ندیم) قاسمی صاحب اسپتال سے چھٹ کر گھر آگئے تھے اور اب دفتر جانے لگے تھے۔ سو، کشور ناہید، کملیشور اور اجیت کور کے ساتھ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں صحت یاب دیکھ کر اطمینان ہوا۔ پندرہ بیس منٹ ان کے ساتھ گزار کر پھر اسی چکر میں لوٹ آئے جو اس کانفرنس نے ہم پر مسلط کر دیا تھا۔

اچانک سن فورٹ کی راہداری میں نیپال کے نوجوان مندوب تھاپا اور پشتو کی شاعرہ حسینہ گل ساتھ آتے دکھائی دیے۔ حسب معمول تھاپا کے چہرے پر بچوں جیسی شرمیلی مسکراہٹ تھی اور شاعرہ گل کی آنکھوں میں اپنے اس نئے دوست کے لیے بڑی شفقت آمیز نرمی۔ کانفرنس کے تمام ہنگاموں کے دوران ہمیشہ سائے کی طرح تھاپا اس دراز قامت اور چغتائی کی تصویروں جیسے نرم نفیس خد و خال رکھنے والی پشتو شاعرہ کے ساتھ رہا۔ کچھ تو اپنی نوعمری کے باعث، کچھ اپنے بوٹے سے قد کی وجہ سے، وہ ہنستے ہوئے گوتم سدھارتھ (Laughing Buddha) کی تمثیل لگتا تھا۔ لوگ ان دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھنے کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک کسی وقت اکیلا ہوتا تو ادھورا نظر آتا۔ کسی نے پوچھا "یہ قصہ کیا ہے؟"

حسینہ گل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مجھے یہ اپنا بیٹا لگتا ہے۔"

"لیکن تھاپا تو تمھیں اپنی ماں نہیں سمجھتا!" آصف فرخی نے گرہ لگائی۔

کانفرنس کے مشترکہ پروگراموں میں ہماری آخری شام "کوئل کے گھونسلے" کے لیے مخصوص تھی۔

یہ گھونسلہ لاہور کے مشہور شاہی محلے کی ایک بلند چار منزلہ حویلی میں واقع ہے۔ اس حویلی کے مالک معروف پاکستانی مصور پروفیسر اقبال حسین ہیں۔ لاہور کے مشہور زمانہ آرٹس کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اقبال صاحب نے اپنی اس آبائی حویلی میں ایک ریستوراں کھول لیا ہے۔ شاہی محلہ، رحمن مذنب اور منٹو کی کہانیوں میں ہیرا منڈی کے نام سے بھی زیر بیان آیا ہے۔ یہاں لاہور کی روایتی طوائفوں، دلالوں، نائیکاؤں کے خاندان آباد ہیں۔ اس بستی کے زمانے اور فسانے عام انسانی بستیوں سے الگ ہیں۔ یہاں زندگی سورج ڈھلنے کے بعد راتوں کے اندھیرے میں جاگتی ہے۔ دن کے اجالے میں اس بستی کے مکان اور مکین، گلی

کوچے اور دکانیں اونگھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال صاحب سے ملاقات کانفرنس کی آخری شام سے برسوں پہلے کالج آف آرٹس کے کمپاؤنڈ میں، پھر (فیض احمد فیض کی صاحبزادی) سلیمہ ہاشمی کے ساتھ مشہور مصور ظہور الاخلاق مرحوم کے گھر پر ہو چکی تھی۔ ظہور الاخلاق کا تذکرہ اس روداد میں پہلے آچکا ہے۔

اب اسے بھی اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ اقبال صاحب، ہیرا منڈی یا شاہی محلے سے اب کے سفر میں ہمارے براہِ راست تعارف کا ذریعہ "کوئل کے گھونسلے" میں اجتماعی عشائیے کے علاوہ ایک کتاب بھی بن گئی۔

اس کتاب کا نام "کلنک" ہے۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کی طرف سے چھپنے والی ایک انگریزی کتاب "TABOO: The Hidden Culture of a Red Light Area" کا اردو ترجمہ۔ یہ ترجمہ فہمیدہ ریاض نے کیا ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ وہی ڈاکٹر فوزیہ سعید ہیں جو سارک ادیبوں کی کانفرنس کے میزبانوں میں شامل تھیں۔ اس کتاب کے فلیپ پر ان کے بارے میں کتاب کے ناشر کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اس کے مطابق "فوزیہ سعید نے یونیورسٹی آف منی سوٹا سے شعبۂ تعلیم میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہ گزشتہ چودہ برسوں سے مختلف اداروں جیسے لوک ورثہ، آغا خان فاؤنڈیشن اور یونائیٹڈ نیشنز ڈیولپمنٹ پروگرام میں مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے پاکستان میں معاشرتی تبدیلی لانے کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر سرکاری سطح پر ہونے والی ان کوششوں میں بھی شریک ہیں جن کے توسط سے پاکستان میں صنفی ناانصافی کے خاتمے کے امکانات کو واضح کیا جا سکے۔ فوزیہ غیر سرکاری تنظیم 'بیداری' کی بانی بھی ہیں جو عورتوں کو زنا بالجبر اور گھریلو تشدد کی وجہ سے درپیش نفسیاتی بحران سے نمٹنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔ پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔ آج کل وہ بین الاقوامی ترقیاتی ادارے ایکشن ایڈ پاکستان کی سربراہ ہیں اور ایک شہری ہونے کے ناتے انسانی حقوق کی روزمرہ جدوجہد میں بھی بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔" اس غیر معمولی خاتون کا یہ بہت معمولی اور ادھورا تعارف ہے۔ ان کی کتاب پڑھ کر ان کے انسانی سروکار، علمی تجسس اور تحقیق کی صلاحیت ان کی بظاہر نحیف و نازک لیکن اخلاقی اور ذہنی طور پر نہایت مستحکم شخصیت کا جو تاثر قائم ہوا اس کے بیان کے لیے ایک علاحدہ تفصیل چاہیے ہوگی۔

ہمارا زمانہ مطبوعہ لفظ کے سیلاب کا ہے۔ اتنی کتابیں چھپتی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اخبار اور رسالے اس کے علاوہ ہیں۔ لاہور کے ہفتے بھر کے قیام میں تحفتہ اتنی کتابیں ہاتھ آئیں کہ ہمارے کمرے کی الماری ان سے بھر گئی۔ ہم مالا مال اور بلکان ہو گئے تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس متاع بے بہا کو دلی کیسے لے جایا جائے۔ اشوک باجپئی نے مشورہ دیا کہ ایک چھکڑے کا بندوبست کیجیے۔ باقی اسے کھینچنے میں کچھ مدد ہم بھی کر دیں گے۔ اب سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ ہم اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کتابیں چھانٹ لیں۔ افضال سے یہ طے ہوا کہ جن کتابوں کی "دو کاپیاں ہمارے پاس ہیں ان میں سے صرف ایک ہندوستان لے جائیں۔ اول بدل کر پڑھ لیں گے۔ سو محبت کی کتنی قیمتی یادگاریں لاہور کی ایک لائبریری کو نذر کر دیں۔ افتخار عارف نے، جو کانفرنس ختم ہونے سے پہلے اسلام آباد چلے گئے تھے۔ چنیدہ کتابوں کے دو بھاری بھرکم پیکٹ ہم دونوں کے لیے وہاں سے بھجوائے۔ روایت ہے کہ برسوں پہلے پاکستان کے سفر میں باقر مہدی کو جب کتابوں کے تحفے سے اندھا دھند نوازا گیا تو انھوں نے اپنے خاص انداز میں کہا "ہمارے ملک میں خراب کتابیں کیا کم چھپتی ہیں جو ہم یہاں سے بھی لے کر جائیں۔"

خیر، یہ تو ایک ضمنی قصہ تھا۔ اب ہم پھر سے کانفرنس پر واپس آتے ہیں۔ اختتامی اجلاس میں ایک قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی جس کے بنیادی نکات یہ تھے کہ — سارک ملکوں میں ہر جگہ ادب کی تخلیق کرنے والے، ایک دوسرے سے دور ہوتے ہوئے بھی اس لحاظ سے ساتھ ہیں کہ انھوں نے مزاحمت کا ایک راستہ اپنا رکھا ہے۔ یہ مزاحمت ہے اقتدار کے موقع پرستی اور اقدار سے عاری سیاست کے خلاف. گلوبلائزیشن کی اندھی دوڑ کے خلاف، اس رویے کے خلاف جس نے ہر انسانی معاشرے کو بازار بنا دیا ہے، ہم ان تمام طاقتوں کے خلاف مزاحمت کی یہ جدوجہد جاری رکھیں گے جو انسانی مساوات، انصاف اور آزادی کی دشمن ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ادب نے ایک نئی قسم کی سول نافرمانی، ایک ستیہ گرہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ادب کے ذریعے ہمیں ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کرنی ہے جو مذہبی ادعائیت اور منافرت کے بجائے ایک نئی روحانیت کا نقیب ہو، جو محبت، باہمی تعاون اور رواداری کی قدروں کو بحال کر سکے۔ بے شک ہم ادب کے بارے میں یا بطور ادیب اپنی طاقت اور اختیارات کے بارے میں کسی طرح کی خام خیالی کے شکار نہیں ہیں۔ اپنی حدیں

پہچانتے ہیں۔ لیکن یہ بھی مانتے ہیں کہ تاریخ کے موجودہ موڑ پر ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ گئیں ہیں اور ہمیں چپ چاپ بیٹھ رہنے کے بجائے مل جل کر، منصوبہ بند طریقے سے ایک نیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا۔

☆ ہمیں اقوام متحدہ کے اعلانیے کے مطابق امن کے ایک کلچر کی تشکیل کرنی ہوگی۔

☆ ہمیں جنوبی ایشیا میں امن کا ماحول قائم کرنے کے لیے ایک دوسرے کی ضرورتوں کو سمجھنا ہوگا۔ ایک دوسرے پر اعتبار اور اعتماد کی فضا بنانی ہوگی۔

☆ ہمیں کسی محدود، متعصبانہ اور علاحدگی پسندی پر مبنی ثقافت یا معاشرے کی جگہ ایک ایسی ثقافت کو فروغ دینا ہوگا جو ہمہ گیر اور تکثیری ہو، جس کا زور اور انحصار کسی ایک فرقے، مذہب، قوم، ملک کے مفادات پر نہ ہو۔

☆ ہمیں تخلیقی اظہار اور مکالمے کے امکانات میں اضافے کی ایک نئی جستجو کرنی ہوگی جو ہم عصر دنیا کے تقاضوں کی تکمیل میں معاون ہو سکے۔

☆ ہمیں برقی میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے پھیلاؤ سے پیدا ہونے والے مواقع پر اپنی روایت اور اپنے ماضی کے امتیازات کے ساتھ ساتھ پھر سے سوچ بچار کرنا ہوگا۔

ہم علاقائی تعاون کو اور سارک کے مشترکہ مقاصد کو ترقی دینے کے اپنے عزم کا اعادہ کرتے ہیں اور اس فورم سے یہ اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ جنوب ایشیائی علاقے کے تمام باشندے امن چاہتے ہیں، اشتراک عمل کے طلب گار ہیں اور ان راستوں کے متلاشی ہیں جو ہمیں اپنی بنیادی ضرورتوں اور حقوق کی آسودگی اور تشفی تک لے جا سکیں۔

سارک ممالک کی چھوٹی بڑی زبانوں کے تمام ادیب اور ان کا ادب اپنے اپنے طور پر مختلف جہتوں میں اور مختلف سطحوں پر اسی آرزومندی کے عکاس ہیں۔ ہم سب ایک اجتماعی خواب بھی دیکھ رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو یہی بتانے کے لیے لاہور کی الحمرا آرٹ گیلری میں ہم اپنے اپنے دریا کو پار کر کے آئے تھے۔

یار سب جمع ہوئے رات کی تاریکی میں
کوئی رو کر تو کوئی بال بنا کر آیا

(احمد مشتاق)

اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم پانچ دریاؤں کی سینچی ہوئی اس سنہری، درخشاں، محبتوں سے چھلکتی ہوئی سرزمین تک ایک چھٹے دریا کو پار کر کے پہنچے تھے۔ اس چھٹے دریا کا نام ۱۹۴۷، ۱۹۶۰، ۱۹۷۱، کشمیر اور کارگل ہے۔ ایک مشہور کہاوت ہے — کوئی بھی ایک ندی میں دو بار نہیں نہاتا ہے۔ کوئی لہر کہیں ٹھہرتی نہیں۔ کاش یہ چھٹا دریا بھی آگے صرف سراب ثابت ہو!

میں اک کرن تھا شب تار سے نکل آیا
(عرفان صدیقی کی یاد میں)

۱۳ اپریل کی اس شام کو عرفان صاحب سے رخصت ہوتے وقت دل میں یہ ڈر سمایا ہوا تھا کہ یہ ملاقات کہیں ان سے آخری ملاقات نہ ہو۔ میرے ساتھ نیر مسعود تھے اور انیس اشفاق۔ پرانے شہر کی ایک گلی میں عرفان صاحب نے اب ایک نیا گھر آباد کر لیا تھا "قندیل"۔

ادبستان (پروفیسر نیر مسعود کے مکان کا نام) سے ہم سہ پہر کے وقت نکلے تھے۔ عرفان صاحب کے گھر پہنچتے پہنچتے دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ قندیل پر سناٹا طاری تھا۔ غیر ارادی طور پر ہم سب بہت دھیمی آواز، تقریباً سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ عرفان صاحب کے بیٹے نے ہمیں اندر بلایا اور عرفان صاحب کے کمرے کی طرف رہنمائی کی۔ ایک بے قرار شعلہ جس کی حرارت کا اندازہ دور سے دیکھنے والے بھی کر لیتے تھے بستر پر تقریباً بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ ابھی ایک سال سے بھی کچھ پہلے، لکھنؤ کے پچھلے سفر میں عرفان صاحب سے دو لمبی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نیر صاحب کے گھر پر، اس کے بعد بارود خانے میں ایک عزیزہ کے یہاں۔ عرفان صاحب کے علاوہ وہاں عثمان غنی صاحب، مسعود الحق صاحب، پروفیسر انیس اشفاق اور ڈاکٹر نسیم انصاری (جواب دوست کے مصنف اور علی گڑھ کے معروف سرجن) بھی تھے۔ رات دیر گئے تک ہم عرفان صاحب سے شعر سنتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں میں، لہجے میں، انداز میں، وہی اضطرار آمیز ذہانت اور زندہ دلی تھی جو عرفان صاحب کی پہچان کہی جا سکتی تھی۔ وہ تیز سوچتے تھے، تیز چلتے تھے اور تیز بولتے تھے۔

تو کیا انھوں نے اپنے حصے کا سفر قبل از وقت ہی تمام کر لیا اور انھیں واقعی یہاں سے

جانے کی جلدی تھی؟ بیماری کی پہچان، دوا دارو سے لے کر ان کے سفر کے آخری پڑاؤ تک ایک عجیب پر اسرار جلد بازی اور کم فرصتی کا گمان ہوتا تھا۔ طرزِ احساس اور شعور پر وارد ہونے والی کیفیتوں اور تجربوں سے ان کی روحانی افسردگی کا اظہار تو ہوتا تھا۔ لیکن اس افسردگی کے ادراک و اظہار میں بھی ایک طرح کی تخلیقی بے چینی اور ایک مستقل اور پائدار وجودی سرگرمی کا رنگ حاوی تھا۔ ''شب خون'' میں اور ''شعر و حکمت'' میں ادھر ایک ساتھ عرفان صاحب کی کئی کئی غزلیں شائع ہوئیں۔ گجرات فسادات کے پس منظر میں ان کی معرکہ آرا غزل:

'حق فتح یاب میرے خدا کیوں نہیں ہوا'

سے ان کی روحانی آشوب اور فکر کی الم آمیزی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ تو عرفان صاحب اپنے شخصی ملال اور اضطراب کو بھی ایک گہرے، اجتماعی رمز اور شاعرانہ تفکر میں منتقل کر دینے کی غیر معمولی استعداد رکھتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان اور پاکستان کے تمام ممتاز نئے غزل گویوں کی بھیڑ میں بھی ان کی غزل الگ سے پہچانی جاتی تھی۔ معاصر غزل گویوں میں ظفر اقبال اور احمد مشتاق کے ساتھ عرفان صاحب اپنی سب سے زیادہ واضح شناخت رکھنے والے شاعر تھے۔

ذہنی تساہل اور تخلیقی پژمردگی کی وہ کیفیت، جس میں ہمارے نئے شاعروں کی اکثریت مبتلا دکھائی دیتی ہے، عرفان صاحب کے یہاں قطعاً ناپید تھی اور ان کے کلام میں اس کیفیت کا ظہور ان کے پہلے مجموعے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ محمود ایاز مرحوم (مدیر سوغات) ہندوستان کے نئے غزل گویوں میں انھیں پائیدار حیثیت اور "Staying Power" رکھنے والا سب سے نمایاں شاعر کہتے تھے۔ اپنے انتقال سے پانچ چھ برس پہلے ان دنوں جب محمود ایاز کرناٹک اردو اکادمی کے صدر تھے۔ ایک سمینار کی تقریب میں انھوں نے لکھنؤ سے نیر مسعود صاحب کے ساتھ عرفان صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ احمد آباد سے وارث علوی آئے تھے۔ اس موقع پر ہمارا تقریباً ہفتے بھر کا دن رات کا ساتھ رہا۔ عرفان صاحب جتنے اچھے شعر کہتے تھے، اتنی ہی اچھی باتیں بھی کرتے تھے۔

سیمینار کے اختتام پر ہم نے (نیر مسعود اور عرفان صاحب کے ساتھ) سری رنگا پٹنم اور میسور کا سفر بھی کیا۔ ٹیپو سلطان کے آثار کی زیارت کے دوران عرفان صاحب قدرے جذباتی اور دل گرفتہ نظر آئے۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اپنے اجتماعی ماضی اور تاریخ کو بھی وہ اپنی جیتی جاگتی صورت حال کی طرح ایک زندہ واردات کے طور پر دیکھتے ہیں۔ عرفان صاحب کی غزلوں

میں اپنے مخصوص تہذیبی حوالوں کا جو وفور ملتا ہے اپنی تاریخی وراثت کا جو گرم اور توانا احساس، مشترکہ علائم اور شعری پیکروں کی جو بہتات دکھائی دیتی ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقی بصیرت اور لسانی وفنی شعور کو اس کے تمام رشتوں اور رابطوں کے ساتھ اپنایا اور زندہ رکھا ہے۔ عرفان صاحب ایک بہت بیدار اور طاقت ور تہذیبی یاد داشت رکھنے والے شاعر کے طور پر نمودار ہوئے اور اپنا یہ تشخص انھوں نے نئی حسیت کے مختلف عناصر اور جہات کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ قائم اور محفوظ بھی رکھا۔ تلمیحات، اساطیری علائم اور اظہار کے قدیمی اسالیب کو انھوں نے ایک نئی تخلیقی ضرورت کے تحت، ایک نو دریافت وسیلے کی حیثیت بھی دی۔ وہ جو ایلیٹ نے ایک انتہائی معنی خیز اشارہ کیا تھا کہ نئی اور سچی تخلیقی صلاحیت سے مالا مال شاعر اپنے مستقبل پر ہی نہیں، اپنے ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، تو اس رمز کی شہادت اردو کی نئی غزل کے نمائندوں میں ہمیں سب سے زیادہ ظفر اقبال اور عرفان صدیقی کے کلام سے ملتی ہے۔ عرفان صاحب کی غزل صرف نئے عہد کی نئی غزل کا ایک منفرد نقش و نشان ہی نہیں، تخلیقی بصیرت کے ایک لازوال سلسلے کا حصہ بھی ہے جس کا ایک دریچہ آنے والے زمانوں کی طرف بھی کھلتا ہے۔ انھوں نے کلاسیکی غزل کا ایک نیا تصور قائم کیا۔ عرفان صاحب کی غزل کو جو بے مثال قبولیت اور شہرت ملی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو شاعری کی دوسری صنفوں کے برعکس، غزل کی صنف انسانی صورت حال اور زمان و مکاں کے تمام تر تغیرات کی پرچھائیاں سمیٹنے کے بعد بھی اپنے ورثے سے کبھی دست بردار نہ ہوگی۔ نئی غزل کا ایک قدم اپنی روایت کے سمٹتے پھیلتے دائرے میں بھی نہایت مضبوطی سے جما رہے گا۔ عرفان صاحب کی غزل میں حال اور مستقبل کے ادراک کے علاوہ اپنے ماضی کا احساس ایک دائمی قدر کے طور پر موجود ہے۔ چنانچہ ان کا قائم کردہ اسلوب اور ان کا مخصوص رنگ و آہنگ ہماری ادبی تاریخ کے آئندہ موسموں میں بھی اپنی بہار کے ساتھ زندہ اور روشن رہے گا۔ ''شعر و حکمت'' کے حالیہ شمارے میں عرفان صاحب کی چھ غزلیں شامل ہیں۔ میرے لیے یہ ان کے آخری اشعار ہیں:

اسی دنیا میں کہیں کوئے نگاراں بھی تو ہے
ایک گھر بھی تو ہے، اک حلقۂ یاراں بھی تو ہے

آ ہی جاتی ہے ادھر موجِ ہوائے نمناک
اس مسافت میں کوئی خطۂ باراں بھی تو ہے

—

لو صبح ہوئی. موجِ بلا خیز ادھر آئے
اور آ کے چراغِ شب افسانہ اٹھا لے
جو رنج میں اس جی پہ اٹھایا ہوں انھیں چھوڑ
تو صرف مرا نعرۂ مستانہ اٹھا لے
ہم لفظ سے مضمون اٹھا لاتے ہیں جیسے
مٹی سے کوئی گوہر یک دانہ اٹھا لے

—

دو جگہ رہتے ہیں ہم ایک تو یہ شہر ملال
ایک وہ شہر جو خوابوں میں بسایا ہوا ہے
رات اور اتنی مسلسل، کسی دیوانے نے
صبح روکی ہوئی ہے، چاند چرایا ہوا ہے

—

بھول جاؤ گے کہ رہتے تھے یہاں دوسرے لوگ
کل پھر آباد کریں گے یہ مکاں دوسرے لوگ
جل بجھیں گے کہ ہم اس رات کا ایندھن ہی تو ہیں
خیر، دیکھیں گے نئی روشنیاں دوسرے لوگ

—

گرفت ثابت و سیار سے نکل آیا
میں اک کرن تھا شب تار سے نکل آیا
یہاں وہ حشر بپا تھا کہ میں بھی آخر کار
اگرچہ نقش تھا، دیوار سے نکل آیا

تو یہ سبز سنہرا، تخلیقی زندگی کی تمازت سے تمتمایا ہوا نقش، جو جمعہ کے دن ۱۶ اپریل ۲۰۰۴ء کو وجود کی دیوار سے نکل کر عدم کے دھندلکوں کی جانب جاتا ہوا دکھائی دیا۔ رخصت ہونے کے بعد بھی حاضر اور موجود نظر آتا ہے۔ کچھ لوگ جانے کے بعد بھی اپنی جگہ خالی نہیں چھوڑتے۔ عرفان صاحب کے ساتھ، بے شک، ایک اکیلی روح کا سفر ختم ہوا، لیکن اس روح کا بھی ایک سایہ ہے جو اردو شاعری کے احاطے میں ہمیشہ رواں دواں دکھائی دے گا اور آنے والوں کو بھی اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہے گا۔

□□□

پوسٹ اسکرپٹ

''باقاعدگی کے ساتھ رسالوں اور اخباروں میں لکھنے کا سلسلہ 1963ء میں شروع ہوا۔ اُن دنوں میں الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ اسی زمانے میں کچھ مختصر تحریریں رف نوٹس کی شکل میں مشہور افسانہ نگار بلونت سنگھ کی ادارت میں نکلنے والے ہندی رسالے 'اردو ساہتیہ' میں شائع ہوئیں۔ الہ آباد کے کئی اداروں سے ایک طرح کا پیشہ ورانہ تعلق بھی قائم ہوگیا۔ 'متر پرکاشن لمیٹڈ'، 'پربھات پبلی کیشنز'، اور اردو کے مشہور ادارے 'نکہت پبلی کیشنز' کے لیے میں ترجمے بھی کرتا تھا اور لکھتا بھی تھا۔ میں اب جس ماحول میں سانس لے رہا تھا، وہ اردو ہندی سنگم پر واقع ایک کشادہ قلب، رودارانہ اور انسان دوستی کی قدروں سے مالامال دنیا تھی۔ ہندی کے کئی صحافی اور ادیب دوستوں میں شامل تھے۔ 1965ء میں اِندور جانا ہوا جہاں ایک کالج میں لیکچرشپ کی نوکری مل گئی تھی۔ اِندور کے ماحول میں اُن دنوں ثقافتی چہل پہل بہت تھی۔ موسیقاروں، مصوروں، تھیٹر کے اداکاروں، ادیبوں اور صحافیوں کی سرگرمی سے میرا کچھ براہِ راست تعلق بھی استوار ہوگیا۔ اسی شہر سے ہندی کا کثیر الاشاعت اخبار 'نئی دنیا' نکلتا ہے۔ اُن دنوں معروف صحافی 'راہل بارپوتے' اس کے مدیر تھے اور 'ابھے چھجلانی' اس کے مالک تھے۔ دونوں سے جان پہچان ہوگئی۔ پھر دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا جس میں ہندی کے ادیب اور صحافی زیادہ تھے۔ 'جن ستّا' کے سابق مدیر 'پربھاش جوشی' اِندور کے رہنے والے تھے اور 'نو بھارت ٹائمز' کے مدیر کی حیثیت سے شہرت پانے والے 'راجیندر ماتھر' اُس دور میں ایک کالج سے وابستہ تھے اور انگریزی پڑھاتے تھے۔ اب دونوں رخصت ہو چکے ہیں۔ 'پربھاش' کے بھائی 'مہیندر جوشی' سے دوستی بڑھی تو ہم سب نے مل کر ہندی میں بچوں کا ایک اخبار بھی نکالا۔ اس اخبار کے ساتھ ساتھ 'نئی دنیا' میں بھی میری تحریریں اور کالمز باقاعدگی کے ساتھ چھپنے لگے۔ بچوں کا اخبار کے اجرا کے موقعے پر ہم نے

بھوپال میں ایک ثقافتی پروگرام ترتیب دیا۔ اس پروگرام کے دوران ایک رول 'جیہ بھادری' نے بھی ادا کیا جو اُس وقت غالباً اسکول کی طالبہ تھیں اور ستیہ جیت رے کی ایک فلم 'مہانگر' میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی تھیں۔ جیہ کے والد اُس وقت بھوپال میں 'اسٹیٹس مین' (انگریزی روزنامہ) سے وابستہ تھے۔ وہ بھی کیا دن تھے اور کیسی پریم رس میں ڈوبی ہوئی سہانی دنیا! ہماری دنیا میں کسی طرح کی عصبیت کا گزر نہیں تھا۔

خالص ادب اور خالص ادیب جیسی اصطلاحیں مجھے پسند نہیں۔ اس طرح کے تصورات مجھے مضحک لگتے ہیں۔ ہمارے وجود سے باہر کی دنیا میں کتنی اُتھل پتھل، کتنا شور اور کیسی آپا دھاپی مچی ہوئی ہے۔ اپنے زمانے کی سیاست اور سماجی صورت حال میں آئے دن بہت سی ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں جن کے بارے میں سوچنا، جن سے پریشان، حیران اور سراسیمہ ہونا فطری ہے۔ سو، میں بھی ہوتا ہوں۔ ان باتوں کا ردِّعمل مجھ پر بھی ہوتا ہے۔ کبھی کم کبھی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ جلسے جلوس، احتجاج اور برہمی کے شورِ بے اماں سے لبالب بھرا ہوا ماحول بھی ہماری ہی دنیا کا حصہ ہے۔ میں نے فکشن، شاعری، ادبی تعبیر و تنقید کے ساتھ ساتھ بہت سے اعصاب شکن سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسئلوں کے سائے میں بھی اپنے شب و روز بسر کیے ہیں۔ شاید اسی لیے یہ کالم نویسی بھی کسی نہ کسی طور پر ہمیشہ جاری رہی۔ یہ میرے سماجی سروکاروں کی دستاویز ہے۔ یہ قصہ تقریباً پچاس برس پر پھیلا ہوا ہے اور یہ کتاب اسی طول طویل روداد پر مبنی ہے۔ کچھ کالم اس کتاب میں شامل نہیں ہیں۔

جو کالمز اس کتاب میں شامل ہیں بالعموم 'ہجوم'، دہلی 'خبر دار جدید'، دہلی 'ہماری زبان'، دہلی کے واسطے سے منظر عام پر آئے۔ میں ان اخباروں اور اِن کے مدیروں کا خاص طور پر شکر گزار ہوں۔ 'ہجوم' کے مدیر 'جاوید حبیب' مجھے بہت عزیز تھے۔ وہ میرے اوّلین شاگردوں میں بھی تھے۔ افسوس کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ 'جاوید حبیب' کو سیاست اور اخلاق، صحافت اور اخلاق کے ناگزیر رشتوں کا پاس مرتے دم تک رہا۔ سب سے زیادہ کالم اُنہی کی تحریک پر لکھے گئے۔ اس وقت ان کی یاد آرہی ہے۔

بہر نوع، یہ ایک انوکھی، نجی، کچھ بے رنگ سی داستان ہے۔ اور یہ کتاب اسی داستان کا ایک حصہ —

عرشیہ پبلی کیشنز کے سربراہ، اظہار احمد ندیم کی کوششوں سے "یہ کس کا خواب تماشہ ہے" اب ایک کتاب کے طور پر آپ کے سامنے ہے۔ انھوں نے طباعت کا ایک نیا معیار قائم کیا ہے۔ سلیقے اور خوش مذاقی کے ساتھ چھپنے والی کتابیں، ورنہ تو اردو کی بیشتر کتابوں سے ناشر کی بدمذاقی ظاہر ہوتی ہے۔ میں اظہار احمد ندیم اور اُن کی اہلیہ کا بھی ممنون ہوں جو اِس ادارے سے شائع ہونے والی کتابوں کی تیاری میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ کتنے کھوئے ہوئے دنوں، تجربوں، لوگوں اور اُن کی یادوں کو ان دونوں نے محفوظ کر دیا۔ یہ سب میری آپ بیتی کے ابواب ہیں۔ آخر ہم دوسروں کے واسطے ہی تو اپنے آپ کو دریافت کرتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

میرے لیے وظیفۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن دوسروں کے بغیر ہماری زندگی کے کیا معنی رہ جاتے ہیں۔ میں "غیر" کو جہنم نہیں سمجھتا۔ وہی تو میرے اپنے وجود کی تکمیل کا واسطہ ہے اور میرے لیے ناگزیر ہے!

— شمیم حنفی

B-114، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ،
نئی دہلی۔ 110025

”یہ کس کا خواب تماشا ہے“ کی تمام تحریروں کا تعلق انسان سے ہے اور ان کے بنیادی سروکار صرف انسانی ضمیر سے ہی وابستہ ہیں۔ یہ کالم نہ تو محض سیاسی ہیں اور نہ ہی محض ادبی۔ اگرچہ موضوعات کے اعتبار سے یہ سیاسی اور ادبی دونوں کہے جاسکتے ہیں مگر ہمیں بخوبی یہ علم ہے کہ کالم میں ہمیشہ اپنے ذاتی خیال کا اظہار کیا جاتا ہے اور کوئی بھی خیال اپنے اظہار کے لیے بیان و الفاظ کا محتاج رہتا ہے۔ اگر ان کالموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اسلوب پر بھی بغور توجہ دی جائے تو ایک خصوصیت بہت واضح طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اور وہ ہے بیانیہ میں پوشیدہ افسردگی اور ملال کی ایک کیفیت۔ افسردگی اور ملال بغیر انسان دوستی (Humanism) کے کبھی نہیں پیدا ہوتے، اگر کسی تحریر کے بنیادی سروکار ”انسان“ سے وابستہ نہیں ہیں تو اس میں شائستگی، شوخی، طنز و مزاح اور معنویت سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر افسردگی یا اداسی نہیں۔ شمیم حنفی کی زبان ایک زندہ وجودی تجربے کی با معنی اور معتبر اداسی ہے جس کے بغیر انسان کا کوئی تعلق نہ تو کسی اخلاقی اقدار سے قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کائنات سے جہاں دوسرے انسان بھی زندگی گزارتے ہیں اور بے جان اشیا بھی اپنا مقام رکھتی ہیں۔

شمیم حنفی کے یہ کالم بنیادی طور پر موجودہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی نظام کے خلاف احتجاج سے عبارت ہیں یہاں تک کہ بعض شخصی نوعیت کے کالم بھی اس عنصر سے خالی نہیں۔ ”یہ کس کا خواب تماشا ہے“ کی تحریروں کو اسی لیے میں نے ”معجزہ“ کہا ہے کیونکہ زبان و بیان کے اعتبار سے ان کالموں کا کوئی تعلق اردو میں کالم نگاری کی روایت سے قائم نہیں ہوتا جبکہ دوسرے تمام صحافیوں اور ادیبوں کے کالم نہ صرف موضوعات کے تعلق سے بلکہ زبان و بیان کے حوالے سے بھی ایک دوسرے کا چربہ نظر آتے ہیں۔ بالکل ایک جیسا ڈکشن، ایک جیسی لفظیات اور ایک جیسے موضوعات۔ اردو کے بیشتر کالم نگاروں کی تحریروں میں سے لفظوں کی فرسودگی کی بو آتی محسوس ہوتی ہے۔ (چند ایک کو چھوڑ کر، مثلاً فرحت احساس کے کالم) شمیم حنفی کے یہ کالم اردو میں کالم نگاری کی روایت سے ماورا ہیں۔ اور اپنی الگ دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔

— خالد جاوید

Yeh Kis ka Khwab Tamasha Hai (Columns)
by Shamim Hanfi

Edited by Khalid Jawed

arshia publications
arshiapublicationspvt@gmail.com